''چہارسُو''

...... نورنہایارستہ

جلیل عالی ہمارے صاحب اسلوب شاعر ہیں جواردواور پنجابی دونوں زبانوں میں فکروفن کے جوہر دکھاتے رہتے ہیں۔میاں محمد بخش کے سیف الملوکی کی لہجے سے خاص رغبت رکھتے ہیں جواہلِ دل کولُوٹ لیتا ہے۔اور جہاں تک عبدہ کے مقام کاتعلق ہےاس سے پوری طرح آگاہ ہیں۔انہوں نے اپنے نعتیہ کلام کو''نورنہایارستہ'' کاعلامتی نام دے کربھی رب العزت سے جھولی بھر بھر خیروبرکات سمیٹ رکھی ہیں۔بلاشبہ نعتوں کے مجموعے کوایسا بے مثل نام کسی اور نے آج تک نہیں دیا۔جلیل عالی کی نعت پڑھتے وقت پروفیسر اسلوب احمد انصاری ایک بار پھر یاد آئے۔وہ کہتے ہیں کہ''کسی ادبی کارنامے میں اقدار کاایک نظام،انفرادی تخلیقی تجربہ اورلسانی ڈھانچہ ہوناضروری ہے'' زیرنظر کلام میں یہ تینوں باتیں موجود ہیں۔مثلاً مسلّمہ اخلاقی وادبی عوامل کی مربوط ہیئت پیشِ نظر ہوتو یہ شعر پڑھ لیجیے۔

دسترس اسؐ کی نگاہوں کی کراں تا بہ کراں   وہؐ تجسس کے لیے آخری منزل کا نشاں

...... امین راحت چغتائی

اشاعت:۲۰۱۸ء،دستیابی،حرف اکادمی،راولپنڈی۔

...... خواب

خواب ایک حقیقت ہے نیند کی حالت میں کسی نامعلوم روحانی تحریک کی بناپر،دماغ کی ذہن کی ایک خاص کیفیت کے دوران،کسی واقعے کی متحرک تصاویر اس طرح مشاہدہ کرتا ہے جیسے کوئی فلم چلتی ہے۔خوابوں کومندرجہ ذیل طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:ا۔رویائے صادقہ (یعنی سچے خواب جن کی تعبیر ہوسکتی ہے اورکبھی خواب میں دیکھا ہوا واقعہ حقیقت بن کر رونما بھی ہوسکتا ہے) ۲۔واقعاتی خواب(جن سے کوئی تاثر پیدانہیں ہوتا) ۳۔مناظر قدرت(ان خوابوں میں صرف مناظر ہی نظر آتے ہیں،جیسے جنگل،باغ،میلہ اورجشن وغیرہ)۴۔خوفناک خواب(دیکھنے والے پران کا اثر ہوتا ہے اوراکثر لوگ چونک کر بیدار ہوجاتے ہیں) ۵۔دلکش خواب(ان خوابوں سے طبیعت پرخوشگوار اثر ہوتا ہے اوراکثر یاد بھی رہ جاتے ہیں) ۶۔ارادی خواب(یعنی استخارے کے تحت دیکھے ہوئے خواب)۷۔جنسیاتی خواب(ان کی تفصیل غیرضروری ہے)میں نے خواب کے بارے میں جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہے وہ میرے اپنے خیالات ہیں جومختلف سائنسدانوں کے نظریات کے مطالعے اورتحقیق کے نتیجے میں قائم ہوئے ہیں۔جہاں تک اسلامی نکتہ نظر کاتعلق ہے فلاسفۂ اسلام نے اس موضوع کی طرف کم توجہ دی۔ابنِ سینا،زمخشری،ابن تیمیہ کی توجہ خواب کی حقیقت اوران کے دیکھنے کے اسباب کی طرف نہیں رہی خواب میں دیکھے ہوئے واقعات یامناظر ہی موردِتوجہ رہے۔

......نقشبند قمرنقوی بخاری

اشاعت:۲۰۱۹ء،قیمت:۴۵۰،دستیابی:ریحان کتاب گھر،اردوبازار،کراچی۔

...... پروفیسر ہارون الرشید

پروفیسر ہارون الرشید نے اپنی زندگی کابڑا حصہ علم وادب کی خدمت میں گزارا۔ایسے منفرد اورمشکل موضوعات اورسبجیکٹ پرتحقیق وتنقید کی کتابیں تحریر کیں جن پرلکھنا بہت دشوار کام سمجھا جاتا ہے۔عام طور پرمصنفین ایسا مشکل کام کرتے ہی نہیں جوکرتے ہیں ان میں بھی اکثر سرسری طور پرنظر ڈال کر،دوچار کتابوں کاحوالہ دے کراپنی ذمہ داری نبھادیتے ہیں جبکہ پروفیسر صاحب کاوتیرہ یہ ہے کہ اس وقت تک متعلقہ موضوع کی کتابوں کی چھان بین کرتے رہتے ہیں جب تک مطمئن نہیں ہوجاتے۔چاہے اس کے لیے انہیں بیسیوں کتابوں کوپڑھنا کیوں نہ پڑے۔پروفیسر صاحب کی کتابیں اس لیے بھی معتبر سمجھی جاتی ہیں کہ وہ ہرطرح کے ادبی تعصب سے بالاتر ہوکر لکھتے ہیں۔جوکچھ لکھتے ہیں نہایت ذمہ داری کے ساتھ لکھتے ہیں۔

......انورفرہاد

اشاعت:۲۰۱۹ء،قیمت:۶۰۰،دستیابی:میڈیا گرافکس،نارتھ کراچی۔

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تنویر الحق

☆

○
☆☆
☆○☆
○☆☆○

قرطاسِ اعزاز

☆○☆

فیروز عالم

☆○☆

کے نام

○☆☆○
☆○☆
☆☆
○

''محبت کا جزیرہ''

بغض ونفرت کی جھاڑیوں سے پَرے
جو محبت کا اک جزیرہ ہے
وہ ہے مسکن ترا فیروز عالم!
تیرے اوصاف کا ذخیرہ ہے

تُو فرشتوں سے بڑھ کے انساں ہے
تُو معالج بھی ہے ادیب بھی ہے
جاں چھڑکتا ہے تجھ پہ ہر کوئی
بدنصیبوں کا تُو نصیب بھی ہے

تیری دِل خواہ خامہ فرسائی
حسنِ تحریر کا نمونہ ہے
تیرے پیغام کے بِنا ، آنگن
اہلِ علم و ادب کا سُونا ہے

جس کسی کو دَوا تُو دیتا ہے
اُس کے دل سے دُعا نکلتی ہے
مالکِ دوجہاں کی رحمت سے
غم پگھلتے ہیں ، شمع جلتی ہے

ابنِ مریمؑ سے کم نہیں ہے تُو
آبِ زم زم کا تُو خزانہ ہے
غم زدوں کو جو زندگی بخشے
تیرے ہونٹوں پہ وہ ترانہ ہے

تجھ کو دنیا سلام کرتی ہے
عزت و احترام کرتی ہے

مہندر پرتاپ چاندؔ
(انبالہ شہر)

چٹکتی چاندنی

(برطانیه کے چندمعروف ناول نگار)

فیروز عالم

اس حقیقت سے کسی کو انکار نھیں که آج کے دور میں انگریزی بلا شرکت غیرے عالمی زبان ھے۔پوری دنیا میں یھی رابطے کی زبان ھے اور بڑی حد تك اس کے بغیر دنیا کے کارو بار تکمیل کو نھیں پھنچ سکتے۔مگر یه بھی حقیقت ھے که چار صدیا ں قبل اسکی وہ حیثیت نه تھی۔انگریزی زبان کی ابتدا جزائر انگلستان میں تین جرمن قبائل جو جرمنی کے ساحلی صوبے "سیکسنی"سے انگلستان آکر بس گئے تھے ان کی بولی سے ھوئی۔ ان قبائل میں سیکسن، انگلیز اور کچھ اسکینڈی نیویا سے بھی آ ئے تھے۔اس سے پھلے ایك اور زبان جو کچھ لاطینی سے ملتی تھی اور مقامی قبائل کی زبان تھی اور جسے سیلٹك **CELTIC** کھا جاتا تھا وہ رائج تھی۔ سیکسنی نے اس زبان کو متروك کر دیا۔ اس کو " اولڈ انگلش" کھا جاتا ھے۔اس کے باوجود که بارھویں صدی کے بعد انگلش کی شکل بھتر ھو رھی تھی اور جیوفرے چوسر (١٣٦٧ تا ١٤٠٠) نے امراء کی تفریح کے لئے کھانیاں لکھیں جو " کنٹر بری ٹیلس" کے نام سے مشھور ھوئیں اور اسی کی وجه سے اسے انگریزی ادب کا "بابا آدم " کھا جاتا ھے ، انگلستان کی سرکاری دستاویزات فرانسیسی میں ھوتی تھیں اور انیسویں صدی تك بھی امراء اپنی اولاد کو فرانسیسی سکھایا کرتے تھے اور اپنے بچوں کو آداب سکھانے کے لئے فرینچ آیائیں رکھا کرتے تھے۔پھر جب انگلینڈ عالمی قوت بن کر ابھرا اور اس نے تقریبا اس دور کی تمام عالمی قوتوں کو ھر جنگ میں شکست دی اور تمام دنیا میں اپنی نو آبادیاں قائم کیں تو ان میں اپنی زبان اور کلچر کے لئے خود اعتمادی پیدا ھوئی۔اس دور میں انگلینڈ کی قومی دولت میں نا قابل بیان اضافه ھوا جس کے نتیجے میں انھوں نے اعلیٰ تعلیمی اور تحقیق کے ادارے قائم کئے جنھوں نے سائینس کو فروغ دیا، پھر بھی یه کھنا ضروری ھے که اٹھارویں صدی میں سائینس کی ترجیحی زبان فرینچ اور جرمن ھی تھی۔ آئینسٹائین کے تمام مقالات جرمن میں تھے اور ڈاکٹری کے زیادہ تر مضامین فرانسیسی میں تھے۔ تیرھویں صدی سے پھلے کی انگلش کو درمیانی دور(**age middle**) کی انگلش کھا جاتا ھے۔

اگرچه عالمی ناقدین کی نظر میں دنیا کے عظیم اور جید آداب میں انگریزی کااول درجه نھیں کیونکه روسی، فرانسیسی، ھسپانوی اور بڑی حد تك فارسی ادب کا بھی تذکرہ بڑے اھتمام سے کیا جاتا ھے مگر بوجوہ انگریزی ادب کی اھمیت سے کوئی انکار نھیں کر سکتا۔ اس کی شاید یه وجه بھی ھے که انگریزی پڑھنے والے مندرجه بالا زبانوں سے کئی گنا زیادہ ھیں۔

آج ھم انگریزی کے آسمان ادب کے چند تابناك ستاروں کا مختصر تذکرہ کرینگے۔ایسے کسی بھی مضمون میں مصنف کی اپنی پسند کا بڑا دخل ھوتا ھے۔ میں نے یھاں ولیم شیکسپئر کا تذکرہ نھیں کیا کیوں که وہ بنیادی طور پر ڈرامه نگار تھا۔

جیوفرے چوسر (Geoffrey Chaucer)

چوسر جسے انگریزی ادب کا بابائے آدم کہا جاتا ہے ۱۳۴۳ء میں لندن میں پیدا ہوا تھا اگر چہ اسکی وجہ ءشہرت قلمکار کی حیثیت سے ہے مگر وہ شاعر، سرکاری ملازم اور ایک باحیثیت درباری کا رتبہ رکھتا تھا اس زمانے میں مغل بادشاہوں کی طرح انگلینڈ کے بادشاہ بھی اپنے دربار میں نورتن رکھتے تھے۔اسے انگریزی ادب کا بابائے آدم بھی کہا جاتا ہے۔اس نے دربار میں موجود امراء اور بادشاہ کی تفریحِ طبع کے لئے کہانیاں سنانا شروع کیں جو بعد میں **canterbury tales** کے نام سے مشہور ہوئیں۔انہیں انگریزی ادب کی عظیم عمارت کی پہلی اینٹ کا درجہ حاصل ہے۔اس نے یہ کہانیاں عام زبان میں لکھنے کی جرئت کی جبکہ اس دور میں انگلینڈ کی معیاری دستاویزات یا ادبی تخلیقات فرنچ یا لاطینی زبان میں لکھی جاتی تھیں۔اسکا اکتوبر ۱۴۰۰ء میں انتقال ہوا۔وہ پہلا شاعر یا ادیب ہے جو انگلینڈ کے شاہی اور تاریخی قبرستان (westminster abbey) میں دفن ہوا۔

جین آسٹن (JANE AUSTEN)

جین آسٹن ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئی۔اسکی وجہ شہرت اسکے چھ ناول ہیں جو سب کے سب بیحد مشہور ہوئے اور ان میں سے ہر ایک پر کئی کئی دفعہ فلمیں بنیں مگر خاص طور پر **MANSFIELD PARK** بہت مقبول ہوئی۔ یہ ایک بیحد غریب گھرانے کی لڑکی کی کہانی ہے جسے اس کے والدین نے اپنے رئیس ترین رشتہ داروں کے یہاں پلنے کے لئے بھیج دیا تھا یہاں اس کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز سلوک کیا گیا مگر اس خاندان کا سب سے خوبصورت اور باصلاحیت لڑکا اس پر عاشق ہو گیا۔اس خیال کو بعد میں بھی کئی دوسرے مصنفین نے قلمبند کیا مگر پہلے

پہلے یہ کہانی اسی نے لکھی تھی۔ وہ پینتیس سال کی عمر میں ۱۸۱۷ء میں انتقال کر گئی۔

چارلس ڈکنس(CHARLES DICKENS)

ڈکنس ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ انگلینڈ کے ''وکٹورین'' عہد کا وہ سب سے بڑا ناول نگار تھا۔ اس نے کئی ایسے کردار تخلیق کیئے جو امر ہو گئے اور انگریزی میں روزمرہ کی بول چال میں استعمال ہونے لگے جیسے ''پک وک'' ''اولیور ٹوسٹ'' وغیرہ۔ وہ اخبار کا مدیر بھی تھا اسکا ناول ''دوشہروں کی کہانی'' ATALEOF TWO CITIES بہت مشہور ہوا۔ جو اس دور کے لندن اور پیرس کے حالات پر مشتمل تھا۔ ڈکنس ہر یونی ورسٹی کے انگریزی ادب کے ایم اے کے کورس میں شامل ہے اور کبھی کبھی عام بول چال میں اس کے نام کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔

ایملی برانٹے(EMILY BRONTE)

۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئی اور صرف تیس سال کی عمر میں ۱۸۴۸ء میں انتقال کر گئی۔ یہ اس خاندان کی تین بہنوں میں ایک تھی جو بچپن میں فوت ہونے سے بچ گئی تھیں مگر پھر بھی پختہ عمر تک نہیں پہنچ سکیں۔ اس نے صرف ایک ہی ناول لکھا HEIGHTS WUTHRING جو محبت کی ایک المیہ کہانی ہے اس کو کئی بار فلمایا گیا۔ اسے انگریزی کے کلاسک ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں انیسویں صدی کے انگلستان کے جاگیردانہ نظام کی منظر نگاری کی گئی ہے جس میں نچلے درجہ کے عوام اور گھروں میں کام کرنے والوں سے تعاصب اور نفرت انگیز برتاؤ کا ذکر ہے مگر اس طبقے کی جب آنکھیں کھلیں، جب ایک بڑے جاگیردار کی لڑکی اصطبل میں کام کرنے والے کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ مگر یہ خود پرست خاندان کسی صورت میں اس نوجوان کو قبول کرنے پر کسی صورت تیار نہیں تھے۔ آج بھی جب لوگ اس فلم کو دیکھتے ہیں تو زار و قطار روتے ہیں۔

شارلٹ برانٹے(CHARLOTTE BRONTE)

ایملی کی بڑی بہن تھی ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئی اور صرف انتالیس سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئی اس کا مشہور ناول JAYNE EYRE ہے جسے نہ صرف ہالی وڈ اور بی بی سی نے کئی دفعہ فلمایا بلکہ بالی وڈ میں بھی دلیپ کمار اور مدھو بالا کے ساتھ ''سنگدل'' کے نام سے بنایا گیا۔ یہ ایک پر اسرار کہانی ہے۔ مختصراً یہ کہ ایک شخص کی شادی دھوکے سے ایک ایسی امیر زادی سے ہو گئی جو پاگل تھی۔ عیسائی مذہب میں دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ کیسے اس کی زندگی برباد ہو گئی اسکا تذکرہ بہت ہی متاثر کن ہے۔

رابرٹ لوئی اسٹیون(ROBERT LOUIS STEVENSON)

سن ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوا اور یہ بھی ۴۵ کی عمر میں ۱۸۹۵ء میں فوت ہو گیا مگر انگریزی ادب پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش اور نام چھوڑ گیا۔ اسکا مشہور ناول TREASURE ISLAND اور مسٹر جیکل اور ہائیڈ کے بغیر انگریزی ادب نامکمل ہے ٹریژر آئی لینڈ ملاحوں کی کہانی ہے جب وہ ایک نامعلوم جزیرے پر اترے اور انہیں ایک نقشہ ہاتھ آ گیا جس میں کسی خزانے کی نشاندہی کی گئی تھی، اس کی تلاش میں ان پر کیا گذری یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ دوسرا ناول جیکل اور ہائیڈ کا مرکزی خیال جو ایک ضرب المثل بن گیا ہے۔

ایچ رائڈر ہیگارڈ(H. RIDER HAGGARD)

کئی دہائیوں پہلے جب میں میٹرک میں تھا ہمارے گھر میں دو ناولوں، عذرا اور عذرا کی واپسی کا بڑا چرچا تھا۔ یہ ایک نہایت پر اسرار کہانی تھی جو افریقہ کے جنگلوں اور غاروں پر مشتمل تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ایک مشہور انگریزی کے ناول SHE and RETURN OF SHE کا ترجمہ تھے، شاید مسز عبدالقدر نے اسکا اردو ترجمہ کیا تھا۔ رائڈر ہیگارڈ پر اسرار کہانیوں کا ماہر تھا۔ دونوں ناول اب تک بار بار شائع ہوتے ہیں اور قبولیت کی سند پاتے ہیں۔ یہ ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۲۵ء میں انتقال کر گیا۔

سمرسٹ ماہم(SOMMERSET MAUGHAM)

۱۸۷۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۶۵ء میں فوت ہوا۔ سمرسٹ ماہم اگرچہ انگلینڈ میں پیدا ہوا تھا مگر اسکی زیادہ زندگی مشرق بعید یعنی سنگاپور، جاوا ساٹرا اور ملایا میں گذری۔ آخری زمانے میں یہ اٹلی میں بس گیا تھا اور وہیں فوت ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پیشے اور تعلیم کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا۔ اس نے شروع میں ڈاکٹری کی پریکٹس بھی کی تھی جہاں اسکی آمدنی بہت معمولی تھی، اس نے شوقیہ طور پر ایک ناول لکھا جو اس قدر مقبول ہوا کہ وہ لاکھوں میں کھیلنے لگا۔ اس نے اسی وقت ڈاکٹری چھوڑی اور فیصلہ کیا کہ وہ صرف ناول ہی لکھا کرے گا۔ اس کیلئے کہا جاتا ہے کہ اپنے دور میں وہ پیشہ ور مصنفین میں سب سے زیادہ دولتمند قلمکار تھا۔ اسکے کئی ناولوں پر فلمیں بنیں۔ اس کا مشہور ناول OF HUMAN BONDAGE ہے۔

ڈی ایچ لارنس(D H LAWRENCE)

اس کا دور ۱۸۸۵ء سے ۱۹۳۰ء تک تھا یعنی یہ بھی پینتالیس سال کی عمر میں مر گیا۔ اس کا مشہور ناول LADY CHATTERLEYS LOVER ہے جو اس وقت کا مشہور ترین اور ساتھ ہی بدنام زمانہ ناول تھا اس کی بدنامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزی ادب کا پہلا فحش ناول ہے۔ اس پر پابندی لگ گئی تھی۔ جب تک میں پاکستان میں تھا یہ ناول مجھے نہیں مل سکا مگر پھر امریکا آ کر مجھے اس کے پڑھنے کا موقع مل گیا۔ میں بھی اس بات سے متفق ہوں کہ وہ فحاشی کی تعریف میں آتا ہے، سعادت حسن منٹو کی طرز پر نہیں بلکہ کچھ وہی وہانوی کے انداز پر ہے۔ مگر طرز تحریر اور کہانی بیحد متاثر کن ہے۔ بنیادی کہانی یہ ہے کہ برطانوی نوابی خاندان کا ایک پچیس سالہ نوجوان جنگ میں زخمی ہوا گولی کمر میں لگی جس سے وہ نچلے آدھے دھڑ سے مفلوج ہو گیا۔ اسکی بیوی ابھی نوجوان تھی وہ تنہائی اور جنسی تشنگی کا شکار ہو گئی۔ ان کے باغات اور دوسرے معاملات کا نگہبان ایک جوان اور خوش شکل نوجوان تھا۔ اتفاق سے ایک دن جب سخت بارش ہو رہی تھی ان کی ملاقات ہو گئی۔ بس کہانی اسی طرح آگے بڑھتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ لارنس کا طرز تحریر، منظر نگاری، جذبات نگاری اور کہانی کا بہاؤ ایسا ہے کہ قاری اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اب اس ناول کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔

باقی صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ کیجیے

بھاچپ

ڈاکٹر فیروز عالم

چھوٹی عمر تھی زبان تتلاتی تھی صحیح طور پر بھائی صاحب نہیں کہہ سکتا تھا اس لئے منہ سے بھاچپ نکلتا تھا جو زبان پر ایسا چڑھا کہ بڑے ہو کر بھی انہیں ہمیشہ بھاچپ ہی کہتا رہا اماں ابا نے بہتیرا سمجھایا، بڑی بہنوں نے تصحیح کی، شادی ہو کر آئیں تو بھابھی بھی تھوڑا سا حیران اور پھر معمولی ناراض ہوئیں مگر میری زبان پر بھائی صاحب نہ چڑھنا تھا نہ چڑھا۔ بھائی صاحب کہنے پر ایسا لگتا تھا کہ کسی غیر کو پکار رہا ہوں وہ بھی ایسی ملنگ فطرت کے مالک تھے اور روایتوں سے اتنے دور کہ اگر انہیں خود سے آٹھ سال بڑے ہونے کے باوجود ان کے نام سے مخاطب کرتا تو شاید وہ اسکا بھی برا نہ مانتے۔ مگر اب جبکہ وہ ہم سے جدا ہو چکے ہیں اور میں اُنکے متعلق اپنے تاثرات لکھ رہا ہوں پاس ادب ہے کہ میں انہیں بھائی صاحب ہی لکھوں۔

روئے زمین پر ہر دور میں بڑی بڑی شخصیتیں گزری ہیں جنکو تاریخ نے جانا اور مانا ہے ان کے تذکروں سے ان گنت صفحے سیاہ کئے گئے ہیں اور اس طرح شاید ان کو اپنے کارناموں کا صلہ بھی اسی دنیا میں مل گیا ہے لیکن اگر ہم نگاہ ڈالیں تو ہر شہر، ہر محلے میں اور ہر گھرانے میں ایسے افراد مل جائینگے جنھوں نے اپنی ہستی کو فنا کر کے دوسروں کے لیے گل و گلزار کھلائے۔ دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے خود کو خاک میں ملا دیا اور تیرگی میں بھٹکنے والوں کے لئے اپنے لہو کے چراغ جلائے۔ ان کے کہیں تذکرے نہیں ملتے مگر میری بہن کہا کرتی تھیں کہ جو احسان کرے اس کو تو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اسکا پرچار کرے مگر جس پر احسان کیا جائے اس پر اسکا قرض ہے کہ وہ اپنے محسن کا ذکر کرے آج میں اسی قرض کو اتارنے کی ایک حقیر کوشش کر رہا ہوں۔

مجھے خاکہ نگاری یا کردار نگاری میں ماہر نے ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں بلکہ میں تو بقول شخصے سکہ بند لکھاری بھی نہیں مگر جس شخص کے سوگ میں میری آنکھیں ابھی تک نمناک ہیں اور ابھی یہ غم بھی تازہ ہے وہ ایسی ہی فقیہہ المثال شخصیت تھا جس کی ساری زندگی دوسروں پر احسان کرتے گزر گئی آج جب میں ماضی کے کچھ واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو سوچتا ہوں انہوں نے جس کسی کے ساتھ جو کچھ بھی کیا وہ کس قدر بے لوث اور ذاتی سود و زیاں سے کس قدر برتر تھا۔

ایک واقعہ! اسکا نام تو شاید ولی محمد تھا مگر ماڑواڑ کے نچلے گھرانے میں پیدا ہونے اور بچپن سے تیرے میرے گھروں میں نوکریاں کرنے کی وجہ سے سب اسے ولیہ کہتے تھے شکل کے معاملے میں اللہ نے ویسے بھی بخل سے کام لیا تھا پھر اپنی دھجیں بھی ایسی بنا رکھیں تھیں کہ کوئی قریب نہ آنے دے۔ سنا ہے چھ سات سال کا تھا کہ میرے ایک ماموں کے یہاں جو بڑے افسر تھے اس کا چاچا اسے پھینک گیا تھا کہ یتیم ہے ہمارے اپنے پاس کھانے کو نہیں تو اس کو کیا کھلائیں ان کی بیگم نے اس کو اوپر کے کام پر رکھ لیا۔ تھا دلچسپ اور گپی اور پھر عمر بھی میرے بھائی صاحب اور میرے ماموں کے ایک بیٹے کے برابر اس لئے ان کی خوب دوستی ہو گئی۔ تینوں بچپن سے جوان ہو گئے ولیہ بھی کچھ ایسا محبت کا مارا نکلا کہ بڑی کوشش کی گئی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر کہیں جم جائے مگر وہ کبھی اس گھر میں کبھی اس گھر میں، مگر ہمیشہ کے لیے ٹلتا نہ تھا ہم اس زمانے میں سندھ کے ایک چھوٹے شہر میر پور خاص میں تھے وہ کبھی کبھی ہمارے یہاں بھی نکل آتا مگر اس کا مستقل اڈہ کراچی میں ہمارے ان رشتہ داروں ہی کے یہاں تھا جہاں وہ پلا بڑھا تھا۔ میں اتنا چھوٹا کہ چھٹی جماعت میں اور بھائی صاحب کالج میں تھے اب تو وہ یاد بھی دھندلی ہو چکی ہے جب ایک سہہ پہر ولیہ اپنا اترا ہوا چہرہ لیے ہمارے گھر میں داخل ہوا۔ معلوم ہوا کہ کئی دن سے بخار میں جل رہا ہے چھوٹے موٹے علاج سے فائدہ نہیں ہوا اور اب جب کہ نہ صرف وہ کسی کام کا نہیں بلکہ اس سے بیماری کی چھوت کا خطرہ ہے تو کراچی میں جہاں اسکا پڑاؤ تھا انہوں نے بھی اسے نکال دیا ہے اس کے بقول اب وہ اپنے بچپن کے دوست کے پاس آ گیا ہے۔ بھائی صاحب جو خود بمشکل بیس سال کے تھے اس کے درد سے تڑپ گئے ہمارا اپنا گھر چھوٹا مگر اماں سے بضد ہو کر اس کے آرام کا بندوبست کیا دوسرے دن سے اسے ساتھ لئے پھرے۔ چھوٹے شہر میں ہر ایک سے جان پہچان اور پھر وہ زمانہ بھی مروت اور محبت کا ابھی روپیہ ہر ایک کا خدا نہیں بنا تھا کئی اچھے ڈاکٹروں کو بھائی صاحب نے مفت دکھایا ایک جگہ مفت ایکسرے بھی کروائی۔ یہ خبر ملی کہ اس کو تپ دق ہے۔ اس زمانے میں یہ مرض موت کی سزا کے مترادف تھا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ کراچی کے عزیزوں کو بھی اسکا شبہ ہو گیا تھا اسی لئے انہوں نے اسے نکال باہر کیا تھا۔ اب تو ایسا لگا جیسے اس کا مرض بھائی صاحب نے خود لگا لیا ہو۔ صبح شام اسپتالوں کے چکر۔ ولیہ کو پابندی سے دوائیں پلانا اور ڈاکٹروں سے دن رات جھگڑنا کہ کوئی طریقہ تو علاج کا ہوگا۔ معلوم ہوا ایک ہی راستہ ہے۔ کوہ مری کے پاس سالمی کا سینی ٹوریم ہے وہاں علاج کی امید ہے مگر اس کے لئے بہت روپے کی ضرورت ہے۔ اس زمانے میں میری سب سے بڑی بہن کی شادی ہونے والی تھی اور گھر میں دن رات یہ ذکر ہوتا تھا کہ شادی میں اتنے کا زیور اتنے کا کپڑا اور اتنے کا کھانا۔ بھائی صاحب دن رات اماں ابا سے جھگڑتے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے کہ زیور کپڑوں پر خرچ سے کہیں عظیم کام انسان کی جان بچانا ہے اس لئے شادی کا پیسہ ولیہ کے علاج پر خرچ کر دیا جائے اس مسئلے پر کبھی کبھی گرما گرمی بھی ہوئی ظاہر ہے بھائی صاحب اماں ابا کو قائل نہیں کر سکے۔ بھائی صاحب نے پھر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ وہ دوسرے دن شہر میں اس مقصد کے لئے چندہ مانگنے نکلے۔ ابا بہت ناراض ہوئے کہ لوگ ہمیں بدنام کر دینگے کہ شادی کے

لیے جھوٹا چندہ اکٹھا کر رہے ہیں مگر وہ نہ مانے۔اور قابل آفریں ہیں میر پور خاص کے عوام کے انہوں نے چند دنوں میں اتنا روپیہ جمع کر لیا کہ ولیہ کو سالٹی کے سینی ٹوریم میں داخل کروایا جاسکے۔حیف کہ اللہ تعالیٰ نے اسکی قسمت میں شفاء نہیں لکھی تھی ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے کر چھٹی کر دی۔وہ چند دنوں میں واپس آ گیا اور کچھ دنوں کے بعد خون تھوکتا بھائی صاحب کی گود میں دم توڑ گیا مگر مرتے مرتے کہتا تھا سلطان تم نے جو میرے ساتھ کیا وہ میرا سگا بھائی بھی نہیں کرتا۔

جی ہاں نام سلطان عالم تھا کچھ جھکّی بھی تھے اور کبھی کبھی جان کر کے کج بحثی بھی کرتے تھے۔اپنے نام پر بڑا فخر تھا کہتے تھے خیال رہے تم سلطان عالم (یعنی تمام دنیا کے بادشاہ) سے مخاطب ہو مگر عملی زندگی میں اس قدر سادہ کے میری بڑی بہن جن کا انداز رہائش شادی کے بعد بڑا بورژوائی تھا اور جن سے انہیں ہمیشہ نظریاتی اختلاف رہا، اُن کے یہاں جب آستین کے ٹوٹے ہوئے بٹن اور بے پالش کے جوتے کے ساتھ جاتے اور وہ اس پر پیار اور دبی زبان سے شاکی ہوتیں تو شیخ سعدی کی کہانی سناتے اور کہتے کہ اگر اچھے کپڑوں میں آنے پر مجبور کیا تو اپنی آستینیں شوربے میں ڈبو دونگا۔تین مضامین میں ایم۔اے کیا۔پولیٹیکل سائنس، فلاسفی اور انگریزی ادب میں، مگر انگریزی ادب سے خاص عشق تھا کالج میں پڑھایا بھی انگریزی ادب اور اسی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ہمارے گھر کے ادبی اور ثقافتی ارتقاء میں انکا بڑا حصہ ہے۔سندھ کے چھوٹے سے شہر میں بیٹھ کر وہ انگلینڈ کے ان مقامات کا تذکرہ کرتے تھے جہاں انگریزی ادب کے شہہ پارے تخلیق کیئے گئے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اس دور کے تاریخی اور سیاسی پس منظر کو بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ بیان کرتے تھے بچپن سے میرے کان انگلش کے مشاہیر اور انکی شاہکار تخلیقات سے ان ہی کے ذریعہ آشنا ہوئے جسکی وجہ سے مجھے بھی انگریزی ادب کا چسکا پڑ گیا جس نے میرے ذہن کو وسعت دینے میں بڑا کردار ادا کیا۔

ہمارا کنبہ مالی طور پر ہمیشہ تنگدستی کا شکار رہا ابا ریلوے میں ایک معمولی سی ملازمت کرتے تھے۔کسی طرح کھینچ تان کر گزارہ ہو جاتا تھا ہر دفعہ یہ ذکر رہتا تھا کہ صرف ایک کمانے والا ہے۔ہم خاندان کے ان گھروں کو حسرت سے دیکھتے تھے جہاں لڑکے جوان ہو گئے تھے اور ماں باپ کا ہاتھ بٹاتے تھے مجھے والدہ بتاتی تھیں کہ جب بھائی صاحب نے میٹرک کیا تو انکی عمر سولہ سال کی تھی مگر ان کے اپنے ذہن میں اس بات کا احساس بہت پختہ ہو چکا تھا کہ ان پر گھر کی مالی مدد کرنے کی ذمہ داری ہے۔میری والدہ سماجی کاموں میں بڑی فعال تھیں اور شہر کے تمام بااثر لوگ انہیں جانتے تھے بھائی صاحب ان کو ضد کر کے کمشنر صاحب کے پاس لے گئے اور نوکری کی درخواست کی۔کمشنر صاحب نے کہا بہن میں اسے رکھ تو لوں گا مگر سرکاری ملازمت میں کم سے کم عمر کی حد اٹھارہ سال ہے بھائی صاحب رونے لگے اور گڑگڑانے لگے کہ میں ایسا ہی کام کرونگا جیسا اٹھارہ سال والا کرتا ہے۔مروّت کا زمانہ تھا کمشنر صاحب نے اماں سے کہا آپ لکھ کر دیدیں کہ یہ اٹھارہ سال کا ہے میں اس کو ملازمت دے دیتا ہوں۔اپنی تین بہنوں اور مجھے سپورٹ کرنے کے لیے بھاجی نے سولہ سال کی عمر سے ملازمت کی اور ملازمت بھی ایسی جس میں کبھی کبھی ساری رات جاگنا پڑتا تھا جب تک ہم اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہو گئے وہ ہمارا سہارا بنے رہے۔میں آج جب سولہ سال کے لاابالی لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں ان میں کتنے ہیں جو اس عمر میں سنجیدگی سے گھر کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔

عمر بائیس سال تھی اور ایم اے کے سال اوّل میں تھے جب ابا کی نوکری بھی ختم ہو گئی اور ان کی بینائی بھی اسقدر کم ہو گئی کہ چلنا پھرنا بھی دشوار ہو گیا۔ہم جس گھر میں تھے وہ ریلوے کی دین تھا اب گھمبیر مسئلہ یہ تھا کہ بہت جلد گھر خالی کرنے کا نوٹس ملنے والا تھا۔بھائی صاحب کا ایم اے کرنے کے بعد سی ایس پی کے امتحان کا ارادہ تھا۔وہ تھے بھی انتہائی ذہین اور انکے پروفیسروں کے خیال میں انکی کامیابی یقینی تھی مگر گھر کے حالات کسی اور چیز کے متقاضی تھے۔سر پر چھت یعنی مکان بچانے کے لیے بھائی صاحب کو تعلیم چھوڑ کر وہی ملازمت کرنی پڑی جو ابا کی تھی کہا جاتا ہے کہ جب اس ملازمت کے لیے امتحان میں بیٹھے تو افسر متعلقہ نے انکا مضمون دیکھ کر انہیں بلا کر کہا کہ جو شخص ایسی انگلش لکھ سکتا ہے وہ اس معمولی نوکری کے لیے کیوں امیدوار ہے۔یہ ایسی قربانی تھی جس نے ان کی زندگی اور ان کے کیریئر پر گہرا اثر ڈالا۔میری والدہ اس لمحے کو یاد کر کے ہمیشہ روتی تھیں کہ کنبہ کی خاطر میرے بچے نے اپنا مستقبل تباہ کر ڈالا۔مگر بھائی صاحب نے کبھی اس کا طعنہ ہمیں نہیں دیا پھر بعد میں انہوں نے دوبارہ تعلیم جاری رکھ کر تین مضامین میں ایم اے کیا اور ریلوے کی نوکری چھوڑ کر کالج میں ملازمت کی۔مگر ہمارے ملک میں ایسی ملازمتوں سے صرف برائے نام سفید پوشی کا بھرم رکھا جاسکتا ہے۔

پھر میری زندگی میں وہ فیصلہ کن لمحہ آیا جسکا قرض میں دوسرا جنم لیکر بھی نہیں اتار سکتا۔

میں نے اچھے نمبروں میں میٹرک پاس کیا۔اس وقت بھائی صاحب تنہا ہمارے کنبے کی کفالت کے ذمہ دار تھے گزارا مشکل سے ہو رہا تھا ابا نہ صرف ریٹائر ہو چکے تھے بلکہ اپنی آنکھوں کی وجہ سے لاچار بھی تھے۔ایک بہن کے علاوہ کسی اور کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔سب کی آنکھیں مجھ پر لگی تھیں تاریخ خود کو دہرا رہی تھی۔سب کو توقع تھی کہ میں پی ڈبلیو ڈی میں کلرکی شروع کر دوں گا میں خود بھی ذہنی طور پر تقدیر پر شاکر ہو چکا تھا مگر ایک دن شام کو جب میں گھر آیا تو ماحول کشیدہ تھا اور گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔سلطان بھائی صاحب میرے مستقبل اور میرے حالات کے درمیان ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔وہ سینہ سپر تھے اور اپنی جگہ اٹل کہ جو انکے ساتھ ہوا ہے وہ میرے ساتھ نہیں ہونے دینگے۔کنبے کے لیے ایک قربانی کافی ہے۔وہ دو نوکریاں کرینگے مگر مجھے مکمل سکون کے ساتھ تعلیم دلوائینگے انہیں معلوم تھا کہ میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔آج جب میں اپنے

کیلیفورنیا کے پہاڑوں میں بنے محل نما گھر میں داخل ہوتا ہوں یا سفر کرتے ہوئے ہوائی جہاز کے فرسٹ کلاس کیبن سے نکلتا ہوں تو یہ خیال مجھ سے کبھی دور نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ میں ان چیزوں کے لیے جس ایک فرد کا رہین منت، ایک فرد کا شکر گذار ہوں وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔

بھائی صاحب اپنی تمام تر صلاحیتوں، علمی قابلیت اور ایمانداری کے باوجود دنیاوی اور مادی طور پر وہ ترقی نہ کر سکے جس کے وہ حقدار تھے۔ اسکی انہیں کوئی پرواہ بھی نہیں تھی کیونکہ وہ زندگی کو کسی اور پیمانے سے ناپتے تھے مگر مجھے اسکا بہت قلق تھا۔ یہ بات واضح تھی کہ آج کی دنیا میں ترقی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ان میں نہیں تھیں میں نے بڑی کوشش کی کہ میں کسی طرح ان کے حالات بدل دوں مگر وہ خوددار بھی اس قدر تھے کہ بشمول میرے کسی سے کسی قسم کی مدد کے روادار نہ تھے۔ اپنی صاف وشفاف متوسط زندگی میں خوش تھے۔ اور کسی قسم کی احساس کمتری میں مبتلا نہیں تھے۔

ایک بہت ہی مختصر بیماری سے پہلے جس میں انکا انتقال ہوا وہ قابل رشک صحت کے مالک تھے ان کے انتقال سے ایک سال پہلے میں کراچی گیا تو میرے بھانجے نے ایسے ہی تذکرۃً کہا کہ سلطان ممّا ایسے محبت کے ہیں کہ تمام رشتہ دار کہتے ہیں کہ وہ بسوں میں بیٹھ کر دور دور سب سے ملنے آتے ہیں۔ اس نے تو برسبیل تذکرہ یہ کہا تھا مگر میرے دل پر ایک چوٹ لگی کہ میں تو کراچی چند دنوں کے لئے آؤں تو ایک ائرکنڈیشن کار بمعہ ڈرائیور رینٹ کروں اور میرے بھائی صاحب کراچی میں بسوں کے دھکے کھائیں میں جب ان سے ملنے گیا اور بھابی ذرا دور ہوئیں تو میں نے ان سے کہا میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ایک اچھی ائر کنڈیشن کار خرید وادوں اس کے ساتھ ہی ڈرائیور اور آپ کے خرچے کے لیے ہر ماہ ایک بڑی رقم روانہ کروں میری تمنا ہے کہ آپ جہاں کہیں جائیں ڈرائیور کے ساتھ جائیں اور شاندار لباس میں ملبوس ہو کر جائیں۔

یہ سن کر پہلے تو مسکرائے پھر اپنے خاص انداز سے انگلی گھما کر انگریزی میں کہنے لگے BUT WHY یعنی ''مگر کیوں۔؟'' میں ذرا خجل ہوا کہنے لگا اسلئے کہ یہ میرا دل چاہتا ہے۔ ہنس کر کہنے لگے لیکن میں اپنے حال میں بیحد خوش ہوں اور میں کسی سے مدد کا روادار نہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کسی مدد کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں بعد میں اپنی اس سطحی اور چھچھوری حرکت پر بہت شرمندہ ہوا مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ جھوٹی شان کے خلاف ہیں اور ایک اچھی اور خوددار زندگی گذار رہے ہیں۔ شاید یہ آخری ملاقات تھی۔

اچانک معلوم ہوا کہ طبیعت ناساز ہے انکی اپنی بیٹی آغا خاں ہسپتال میں ڈاکٹر ہے اس نے فوراً توجہ دی مگر مرض الموت کا کوئی علاج نہیں معمولی نمونیے کا حملہ تھا میں جب کراچی پہنچا تو ہوش میں تھے بھابھی سے کہنے لگے میرا بھائی سات سمندر پار سے آیا ہے بڑا ڈاکٹر ہے اب میں ضرور ٹھیک ہو جاؤنگا۔ دوسرے دن کوما میں چلے گئے اور تیسرے دن خالق حقیقی سے جا ملے۔

رہے نام اللہ کا۔

- بقیہ -

''چٹکتی چاندنی''

جان گیلزورتھی(JOHN GALLSWORTHY)

پیدائش ۱۸۶۷ء انتقال ۱۹۳۳ء مشہور ناول FORSYTHE SAGA, APPLE TREE گالزورتھی کو ۱۹۳۲ء کا ادب کا نوبل انعام ملا تھا، وہ لندن کے قریب ''سرے'' میں ایک دولت منداور باعزت گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے مشورزمانہ HARROW اسکول اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ اس کا ناول ''فورسائتھ ساگا'' کئی جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اسکا رومانوی المیہ ناول ''ایپل ٹری'' جو''موسم گرما کی کہانی '' کے نام سے بھی شائع ہوا، بہت مقبول ہوا۔ اردو قلمکار اے حمید کا مقبول ترین طویل افسانہ ''جہاں برف گرتی ہے'' اسی کہانی سے ماخوذ ہے۔

آرتھر کانن ڈائل(ARTHUR CONAN DOYLE)

(۱۸۵۹۔۔۱۹۳۰)

کانن ڈائل کے لئے لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمام دنیا کے جاسوسی اور پراسرار ناول یا افسانے لکھنے والوں کے پیر مرشد ہیں۔ شرلاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ پیدا تو اسکاٹ لینڈ میں ہوا تھا مگر اسکی ساری زندگی لندن میں ہی گذری۔ یہ بھی پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ شوقیہ ایک کہانی لکھی(a study in scarlett) جس نے تہلکہ مچا دیا بس اس نے پھر لکھنے کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ مرنے کے بعد اس کے طرز کی کہانیوں کی اس قدر مانگ ہوئی کہ بہت سے لکھنے والوں نے شرلاک ہومز کی کہانیاں لکھیں (ان کہانیوں کے لکھنے کی قانونی اجازت لی گئی تھی اور پبلشر اس کا پہلے صفحے پر اعتراف کرتے تھے کہ یہ کانن ڈائل کی نہیں دوسروں نے لکھی ہیں) کہ قارئین کی مانگ پوری ہو جائے۔ ملکہ برطانیہ نے اسے کئی اعزازت سے نوازا۔ مشہور ناول THE HOUND OF BASKERVILLE یہ کمال کی پراسرار کہانی ہے۔ یہ انگلینڈ کے دیہاتی علاقوں کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے جسے ختم کئے بغیر کتاب کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ایک ماورائی فطرت کتا اسکا مرکزی کردار ہے۔

براہِ راست

اس بار میرِ مجلس کے طور پر ڈاکٹر فیروز عالم کا انتخاب ایک ادیب یا فقط نثّار کے طور پر نہیں کیا گیا بلکہ ایک مشّاق ادیب، ایک بلند نگاہ مترجم، ایک دُور اندیش دانشور، ایک انسان دوست، شخص اور ایک ماہر طبیب کے طور پر کیا گیاہے۔ ڈاکٹر صاحب تمام شعبوں میں درد مندی ، ایمانداری اور لگن کے ساتھ بغیر کسی صلے، ستائش اور اعزاز کی تمنا کے مسلسل خدمات دیے جا رہے ہیں اور یہ ایسا کارنامہ ہے جسے ناسراہانہ ایک طرح کے جرم کے زمرے میں آتا ہے۔ سو زیرِ نظر اشاعت ڈاکٹر فیروز عالم کی نذر کر کے ادارہ چہارسو طمانیت کے احساس سے دوچار ہے کہ ہم نے ایک صاحبِ کردار اور صاحب اوصاف ادیب اور طبیب کے ساتھ انصاف کرنے کی اپنی سی کوشش ضرور کی ہے۔ ہماری کوشش کہاں تک اور کس حد تک کامیاب ٹھہرتی ہے اس کا فیصلہ ہمیشہ سے آپ کی دسترس میں رہا ہے اور اس بار بھی یہ فریضہ آپ ہی انجام دیں گے!!!

گلزار جاوید

☆ مشاہدے کی بات ہے اکثر لوگ زندگی کے انہیں گوشوں پر بات کرنا پسند کرتے ہیں جو اُن کے پسندیدہ ہوں۔ گفتگو کی ابتدا آپ کس بات سے کرنا پسند کریں گے؟

☆☆ میں تو ہر اس موضوع پر بات کرنے کے لئے تیار ہوں جس پر آپ بات کرنا چاہیں گے

☆ آپ کا گھرانہ تہذیب یافتہ اور کتاب دوست تھا۔ درست، آپ پر ادیب ہونے کا انکشاف کب اور کیونکر ہوا؟

☆☆ بس جب بچپن میں مشاہیر کی کتابیں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں اور ان پر گفتگو ہوتی تھی تو مجھے بھی یہ خواہش ہوئی کہ میں بھی لکھوں جب پہلی کہانی امروز کے بچوں کے صفحے پر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں لکھ سکتا ہوں۔

☆ طبیعت کی موزونیت کے باوجود شاعری کے بجائے افسانے کا انتخاب کن وجوہ کی بنا پر کیا؟

☆☆ یہ مشکل سوال ہے اس لئے کہ اسکا جواب تو یہ ہے کہ "پسند اپنی اپنی اور خیال اپنا اپنا"، مگر مجھے ہمیشہ سے کہانیاں سننے کا شوق رہا، کبھی اپنی نانی تو کبھی اپنے ماموں کی جان کو آیا رہتا تھا کہ کہانیاں سنائیں، وہ بیچارے عاجز آجاتے تھے کہ کہاں تک تمہیں نئی نئی کہانیاں سنائیں۔ مختصراً یہ کہ مجھے قصہ گوئی بہت پسند تھی، تو جب کہانیاں سننے کی عمر گذر گئی تو کہانیاں لکھنے کو دل چاہا۔ اسی لئے میرے افسانوں میں کہانیوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ ویسے کہانیاں سننے کی عادت اب بھی نہیں گئی، بس فرق یہ ہے کہ اب کہانیاں پڑھ کر یہ شوق پورا کر لیتا ہوں۔

☆ ایک اچھے افسانہ نگار میں کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔ کیا آپ اُن پر پورا اُترتے ہیں؟

☆☆ "میں ان پر پورا اترتا ہوں، اسکا فیصلہ تو نقاد یا پھر آپ جیسے با اختیار اور مستند مدیر ہی کر سکتے ہیں مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ افسانہ نگار میں قوت مشاہدہ، حساس دل اور قوت بیان ہونا ضروری ہے۔ بقول شخصے

دیدہء کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے آنکھ والا تیری قدرت کا تماشہ دیکھے۔

☆ فنکار اکثر کسی نہ کسی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کی شناخت افسانے کے کس سکول آف تھاٹ سے کی جائے؟

☆☆ کسی سکول کی بھی نہیں۔ میں صرف اپنا شوق پورا کرنے کے لئے لکھتا ہوں وہ بھی جب آمد ہوتی ہے یا پھر کسی واقعے سے متاثر ہو کر۔

☆ آپ کی کہانیاں سادہ بیانیے کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔ جن میں کسی نظریہ، تھیوری یا فلاسفی کو دخل نہیں ہوتا؟

☆☆ بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ کسی ایسے واقعے سے متاثر ہو کر جو میرے دل کو چھو جاتا ہے، میں امید کرتا ہوں کے اسکا بیان وجذبات نگاری اور منظر کشی قارئین کے بھی دل کو چھو جائیگی

☆ آپ کے ہاں واقعاتی حرکات وسکنات کے بجائے متن کو اہمیت دینے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ متن ہی سب کچھ ہے، اسکا بیان سادہ الفاظ میں ادا کرنا اس سے بہتر ہے کہ استعاراتی بیان سے قاری کو الجھا دیا جائے

☆ ہیرو بننے کی خواہش بھی آپ کے ہاں شدت سے پائی جاتی ہے جس کی تکمیل آپ اپنے افسانوں میں مسیحا کے کردار سے کرتے ہیں؟

☆☆ یہ میرے لئے بھی ایک خبر ہے!! ہیرو اور میں؟؟ شائد آپکا مطلب خود پسندی اور خود کو اہمیت دینا ہے، تو عرض یہ ہے کہ چونکہ میری چند کہانیاں میرے ذاتی تجربات پر مبنی ہیں اور میرا پیشہ ڈاکٹری ہے اس لئے کسی طرح وہ کہانیاں میرے اطراف گھومتی ہیں تو یہ قدرتی اور غیر ارادی بات ہے ورنہ اس میں ارادے کا کوئی دخل نہیں۔

☆ آپ انگریزی ادب کے اچھے قاری اورنہایت اچھے مترجم ہیں جبکہ اردوافسانہ انگریزی ادب سے مستعار ہے۔ایک صدی کے سفر میں ترقی کی رفتار اور معیار کی نسبت آپ کی رائے کیا ہے؟

☆☆ یہ بہت ہی اہم سوال ہے۔اس کا وزنی سا جواب تو ہمارے جید تنقید نگار گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، ناصر عباس نیّر یا آصف فرخی ہی دے سکتے ہیں مگراس پر میں نے بھی کافی سوچ بچار کیا ہے۔اردوافسانے کی عمر تھوڑی ہے۔مگر ایسا لگا کہ پچاس کی دہائی کے بعد اردوافسانہ کہیں ٹھہر گیا ہو۔اسکی وجہ میری نظر میں یہ نہیں کہ سچ مچ میں افسانہ ٹھہر گیا بلکہ اسکی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ کہ قارئین نے مطبوعہ ادب پڑھنا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے اردو کے قابل قدر اور معتبر رسائل جیسے ،نگار، ساقی، ادب لطیف، نقوش نیادور وافکار یا تو شائع ہونا بند ہو گئے یا انکا معیار وہ نہیں رہا۔ادھر ہمارے ناقدین کو سوائے منٹو، عصمت، کرشن چندر اور بیدی کے کوئی نظر ہی نہیں آتا۔موجودہ دور میں بھی بیحد اچھے افسانے لکھے جارہے ہیں مگر انکو کوئی گردانتا ہی نہیں اور انکے تخلیق کاروں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

☆ کہا جاتا ہے کہ اردو ادیب جب تک کوئی معرکتہ الآرا ناول نہ لکھے تب تک سندِ اعتراف نہیں ملتی۔آپ کے ذہن یا مستقبل کے پروگرام میں ایسا کوئی خیال سر ابھارتا ہے؟

☆☆ نہیں، میں صرف افسانہ نگار ہی رہنا چاہتا ہوں۔بڑی حد تک اردو میں ناول کا دور ختم ہو چکا ہے۔اس حقیقت کو مان لینا چاہئے کہ لوگوں کے پاس ’’پرنٹ میڈیا‘‘ کو پڑھنے کا وقت نہیں ہے۔نیو یارک ٹائمز، ٹائمز آف لنڈن اور لاس انجلز ٹائمز سب دیوالیہ ہوتے ہوتے بچے ہیں۔ٹیلوژن، یوٹیوب اور نیٹ فلکس نے میدان مار لیا ہے

☆ آپ کی سوانح عمری میں محیر العقول واقعات کی کثرت واہمے یا وسوسے کے باعث تو نہیں؟

☆☆ میرے خیال میں صرف دو پراسرار وقعات کا ذکر ہے۔مجھے کچھ ماورائے حقیقت واقعات سے دلچسپی ہے۔یہ ایسا میدان ہے جس پر غیر ملکی ادب نے تو بہت کچھ لکھا ہے مگر ہمارے یہاں اس پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی شائد حجاب امتیاز اور مسز عبدالقادر نے کچھ لکھا ہے۔ایسے بہت سے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں جنکے شاہد ایسے لوگ ہیں جو بہت معتبر ہیں مگر ان کی کوئی سائنسی توجیہ نہیں ہے

☆ آپ کے دوست ڈاکٹر عبدالباری آپ کی سرگزشت کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔چاندنی کا پس منظر، میڈیکل کالج کے شب وروز، میڈیکل کالج کی زندگی، ڈاکٹر بننے کے بعد عملی زندگی اس تقسیم وترتیب سے ڈاکٹر صاحب ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ اسکا جواب تو ڈاکٹر باری ہی کو دینا چاہئے۔وہ میرے پچپن (۵۵) سال سے پرخلوص دوست ہیں انکے کہنے پر نہ جائیں۔یہ کہہ سکتا ہوں بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لئے۔

☆ ایک خیال یہ ہے کہ آپ سوانح عمری میں بہت سے لوگوں کی نسبت تکرار کے مرتکب ہوئے ہیں؟

☆☆ سوانح عمری میں تکرار یا پھر کچھ حالات وواقعات کو دہرانے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے سوانح عمری ایک ہی نشست میں ترتیب سے نہیں لکھی بلکہ وقتاً فوقتاً موڈ بننے پر یا کچھ ایسی یادیں آنے پر جو مجھے یا تو بہت عزیز تھیں یا بہت اہم تھیں۔یہ اگر طرز تحریر میں سقم کا درجہ رکھتی ہیں تو۔۔۔معذرت

☆ ایک اور حوالہ بھی تکرار کی نشان دہی کرتا ہے مثلاً خواب گھر کا تھا شروع ’’بنگلہ‘‘ کر بیٹھے اور جگہ جگہ گھر کی بجائے ’’بنگلے‘‘ کا لفظ خاصی تکرار پیدا کر رہا ہے؟

☆☆ جہاں تک گھر اور بنگلے کی تکرار کا تعلق ہے تو عرض یہ ہے کہ کوئی بھی مسکن گھر ہو سکتا ہے جیسے فلیٹ، کراچی میں ایسے گھر کو جس کے اطراف اپنی چہار دیواری ہو، اسکے گرد لان اور چھوٹا موٹا باغیچہ ہو اسے بنگلہ یا کوٹھی کہتے ہیں۔میں جن حالات میں تھا ان میں ’’کوٹھی‘‘ کا لفظ میرے اوپر نہیں سجتا تھا نہ ہی ہمارا گھر ایسا تھا مگر وہ بنگلے کی تعریف میں ضرور آتا تھا۔اس لئے اس کو بیان کرتے ہوئے میں نے کراچی کا عام استعمال ہونے والا لفظ استعمال کیا۔امریکا میں ایسے گھر کو SINGLE FAMILY HOME کہتے ہیں

☆ آپ نے اپنی سوانح عمری میں برٹش نرس سے ہونے والی چپقلش کا مصلحتاً ذکر نہیں کیا یا وجوہات کچھ اور تھیں؟

☆☆ میں حیران ہوں کہ یہ سوال کہاں سے آیا۔میں انگلینڈ تو درجنوں دفعہ گیا ہوں مگر میں نے وہاں کبھی کسی ہسپتال میں کام نہیں کیا۔مجھے یاد نہیں کہ ایسا کوئی واقعہ ہوا ہو۔

☆ ’’اُفق کے اُس پار‘‘ جن عالمی پائے کے افسانہ نگاروں کا آپ نے انتخاب کیا اُس کا معیار کیا تھا اور کس ادیب کے فن پارے کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے دقت کا سامنا رہا اور کیا آئندہ آپ یہ کام جاری رکھنا پسند کریں گے؟

☆☆ شکریہ کہ آپ نے مجھے موقعہ دیا کہ میں اسکو بیان کرسکوں؛ سب سے پہلے میں نے یہ تحقیق کی کہ ان ممالک یا خطوں میں جن کی کہانیاں میں ترجمہ کررہا ہوں عالمی تنقید نگاروں نے کن قلم کاروں کو قابل ذکر اور اولین قرار دیا ہے۔پھر میری معاون امریکن لائبریرئین نے ہر مصنف کے پانچ پانچ افسانے جو ناقدین نے انکے بہترین قرار دئے تھے کے پرنٹ لیکر مجھے دئے۔میں نے یہ افسانے پڑھے۔اور اپنی پسند سے وہ ایک افسانہ چنا جو ہر کسی کو اور خاص طور سے پاکستانی قارئین کو پسند آئیگا۔اس طرح ۲۵ قلمکاروں کے پانچ پانچ افسانے پڑھے تو ۱۲۵۰ صفحات پڑھ کر ان افسانوں کا انتخاب کیا گیا یہ محنت کا کام تھا مگر یہ میرا شوق تھا اور صرف اس لئے کیا کہ میں چاہتا تھا کہ ہمارے درمیانے درجے کے قارئین کو جن کی پہنچ انگریزی ادب تک نہیں یا جنہیں اچھے کتب خانوں تک رسائی نہیں تو انہیں عالمی ادب سے روشناسی ہو جائے۔

☆ جس قدر محنت اور جاں فشانی آپ نے غیر ملکی ادیبوں کے تراجم پر صرف کی اگر یہ ہی محنت اور لگن آپ اردو ادیبوں کے فن پاروں کو انگریزی میں منتقل کرنے پر صرف کرتے تو نتائج زیادہ بہتر نہ ہوتے؟

☆☆ اسکا تو مختصر جواب یہ ہے کہ مجھے پاکستانی قلمکاروں کی تخلیقات کو انگریزی میں ترجمہ کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور میں سمجھتا ہوں یہ ہمارے حکومتی اداروں یا یونی ورسٹیوں کا کام ہے۔

☆ جو لوگ آپ کے اندر صوفی، درویش اور فقیر کی نشاندہی کر رہے ہیں اس میں کوئی صداقت ہے یا بس رواروی؟

☆☆ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ ہیں جو مجھے اس قدر عزت یا مرتبے سے نوازنا چاہتے ہیں؛

فرشتے سے بہتر ہے انساں ہونا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

مجھے ایک عام انسان ہی رہنے دیں۔

☆ پہلے ہم لوگوں کی انگلیاں آپ کی جانب اُٹھتی تھیں کہ آپ لوگ اردو لکھتے پڑھتے اور اپنی اولادوں سے انگلش بولتے ہیں۔ اب تو خیر سے پاکستان کے قریب تمام قدآور ادیبوں کی اولادیں اگلی نسل کو انگریزی سکولوں میں پڑھاتی اور انگریزی میں گفتگو کرتی ہیں۔ ایسے میں اردو کا ولی وارث کون ہوگا؟

☆☆ خدا کے فضل سے میرے دونوں بچے مکمل پاکستانی لہجے میں اردو بولتے ہیں جسکا سارا کریڈٹ میری بیگم شائستہ کو جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھ دوں کہ زبان ماحول سے آتی ہے۔ شاید ہندوستانی مسلمانوں کے آباو اجداد فارسی یا عربی بولتے آئے تھے مگر وقت کے ساتھ اب ہم سب ہندوستانی بولنے لگے۔ دنیا میں فرانسیسی اپنی زبان کے تحفظ میں سب سے زیادہ سخت ہیں امریکا میں ایک بہت ہی مشہور و دولت مند خاندان Du Pont ہے جو فرانسیسی نسل ہے وہ یہاں ڈھائی سو سال سے آباد ہے۔ انکا اصول ہے کہ انکے ہر بچے کو فرانسیسی پڑھائی جاتی ہے اور زور دیا جاتا ہے کہ بڑی حد تک فرنچ بولیں مگر چونکہ امریکا میں عام بولی انگریزی ہے اس لئے انکی نسلیں اب انگریزی ہی بولتی ہیں۔ تو پاکستان سے باہر بسنے والوں کی نسل بھی شائد ایک یا دو نسلوں کے بعد اگریزی ہی بولے گی۔ یہ عمرانیات کا اصول ہے۔ اگر اردو کو زندہ رکھنا ہے یا ترقی دینی ہے تو اردو کو پاکستان میں رائج کرنا ضروری ہے۔

☆ بھارت، پاکستان، مشرقِ وسطیٰ تک تو دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ تعلیمی تناسب کم ہے، عدم برداشت کا ماحول ہے، قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو فوقیت دی جاتی ہے مگر جب امریکہ، برطانیہ، کینیڈا جیسے مہذب معاشروں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اردو ادیب وشاعر ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچ کر گروہ اور جتھہ بندی کو پروان چڑھاتے ہیں تو اس پر دل خون ہو جاتا ہے؟

☆☆ جہاں تک گروہ بندیاں یا ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے کا معاملہ ہے تو یہ اردو ادب کی روایت رہی ہے۔ ذوق و غالب، جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی اور یاس یگانہ چنگیزی کے غالب پر حملے۔ ہر اردو کے قاری کو یاد ہوں گے۔ تو یہی چیز اب بھی ہے۔ اسکی وجہ ذاتی عناد اور انانیت ہے۔ یہ صورتحال امریکا میں کچھ زیادہ ہی ہے اور ہر شہر میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ لاس انجلز میں ایک زمانے میں اردو کی بہت اعلیٰ محفلیں ہوتی تھیں مگر اب وہ سب اسی کی نذر ہو گئیں۔

☆ آپ کو نزدیک سے جاننے والوں کا خیال ہے کہ ایک ماہر ڈاکٹر، اعلیٰ پائے کا ادیب اور کامیاب انسان فیروز عالم اُس قدر مطمئن اور پرسکون نہیں جتنا وہ ظاہر کرتے ہیں؟

☆☆ آپ نے خوب پہچانا یا یوں کہئے کہ خوب تشخیص کی۔ مجھ میں ایک بے نام سی بےچینی ہے۔ جیسے کسی چیز کی تلاش ہو، مگر افسوس اس بات کا ہے کہ مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ مجھے کس چیز کی تلاش ہے۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً بچپن سے مجھ پر یاس اور ناامیدی کے دورے سے پڑتے تھے۔ میرے گھر والے اس بات سے پریشان تھے۔ بس کچھ انجانے دکھ ہیں جو مجھے پریشان کرتے ہیں اس کے باوجود کہ خدا نے مجھے ہر وہ چیز وافر مقدار میں عطا کی ہے جسکی کوئی بھی شخص خواہش کر سکتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں نے اپنے نفسیاتی ڈاکٹر دوستوں کو دکھایا۔ انکے پاس بھی اسکا کوئی جواب نہیں ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ ایک تشنگی ہے۔ میں نے ایک دفعہ اپنے ایک بہت ہی دانشور قسم کے دوست سے اس کا تذکرہ کیا تو اس نے کہا کہ دنیا میں تمام ایسے لوگ جو حساس تھے اور لکھتے تھے اور دنیا اور زندگی کے گورکھ دھندوں پر غور وفکر کرتے تھے وہ سب اسی قسم کی علامات میں مبتلا تھے اور ان میں سے بہتوں نے آخرکار خودکشی کر لی تھی۔ اگر چہ میں خود کو دانشور نہیں سمجھتا مگر شاید یہ حساس اور بیدار ذہن ہونے کا خراج ہے۔ اس کا سدباب کرنے کے لئے اب تھوڑا سا رجحان روحانیت اور مذہب کی طرف گیا ہے مگر کوئی خاص افاقہ نہیں۔

☆ مختلف امراض کی نسبت آپ نے سلیس اردو میں جو مضامین ''زندگی نایاب ہے'' تحریر کیے اُن کی اشاعت کس مرحلے میں ہے اصولی طور پر تو یہ قومی سطح کا کام ہے۔ حکومت یا کسی بڑے اشاعتی ادارے نے اس فلاحی پروجیکٹ میں کسی طرح کا تعاون ضرور پیش کیا ہوگا؟

☆☆ آخر کار آپ نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو میں چاہتا تھا۔ میری کسی بھی تخلیق کو چاہے وہ بہت سے لوگوں کی نظر میں بڑی یکتا اور قابل توجہ و تعریف تھی کوئی پزیرائی نہیں ملی۔ یہ کتاب بھی جب کراچی میں کچھ درمیانہ درجے کے ادب شناس لوگوں نے پڑھی تو یہی کہا کہ اسکی تو سرکاری سطح پر سرپرستی اور تشہیر ہونی چاہئے۔ میں اپنے ذاتی خرچ پر اس کو شائع کروا سکتا تھا مگر اتنے زیادہ لوگوں کے کہنے پر میں نے کراچی میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے رابطہ کیا جو اردو کتابیں بھی چھاپتا ہے۔ فون پر کوئی بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ میں وہاں گیا جگہ دور تھی۔ میں سیکیورٹی کے کمرے میں گیا اردو کے انچارج سے بات کرنے کی درخواست کی

وہاں کوئی صاحب عمیر لودھی اردو کے کرتا دھرتا ہیں وہ صرف فون پر بات کرنے پر راضی ہوئے۔اور ملنے سے صاف انکار کردیا۔بہت سرد مزاجی سے بات کی،میری کئی دفعہ درخواست کے باوجود کہ صرف دس منٹ مجھے دے دیں،وہ ملنے پر راضی نہ ہوئے صرف چند سوال پوچھے اور کہا مسودہ چھوڑ جائیں جواب مل جائیگا۔مزید کوئی بات چیت کرنے پر تیار نہیں تھے نہ ہی کتاب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے تھے۔دوسرے دن مجھے ای میل ملا کے آپ کی کتاب کا موضوع ہماری پالیسی کے مطابق نہیں کہیں اور رجوع کریں۔مجھے یقین ہے کہ عمیر نے اس کتاب کو پڑھنا تو بڑی بات ہے کھول کر بھی نہیں دیکھا ہوگا۔

ایک دفعہ نغمی صاحب کی وساطت سے گوپی چند نارنگ کو جب وہ واشنگٹن آئے ہوئے تھے میں نے ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' واشنگٹن یا پھر دہلی بھیجنے کی کوشش کی وہ کہنے لگے اتنی کتابیں روز آتی ہیں پڑھ ہی نہیں پاتا ایسے ہی پڑی رہتی ہیں آپ زحمت نہ کریں۔مگر مجھے ان کی صاف گوئی پسند آئی۔کس کس کا نام لوں،چھوڑیں اس قصے کو اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی۔

☆ Gout پر توجہ نہ دینے کے باعث ایم۔بی۔بی۔ایس کے فائنل میں آپ پوزیشن نہ لے پائے تھے۔ڈاکٹر بننے کے بعد Gout کے مریضوں سے کس قدر سابقہ رہا اور آپ کے احساسات اس وقت کس قسم کے رہے؟

☆☆ گاؤٹ پر تو میں ماہر ہوگیا تھا اور اپنے راؤنڈس پر میں اسکی فزیالوجی بہت جوش اور گہرائی سے پڑھاتا تھا۔ویسے بھی یہ مرض مرغن کھانوں اور شراب کی وجہ سے امریکا میں بہت عام ہے۔

☆ نوجوانی میں آپ کو خود پر جس بیماری کا شک گزرا تھا پیشہ ور زندگی میں کب کب آپ کا اُس سے سابقہ پڑا اور آپ کے احساسات کیا رہے نیز آج کل Lou Gehrig Disease تشخیص وعلاج کے کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ LOU GEHRIG DISEASE آج بھی نا قابل علاج بیماری ہے۔اس پر دنیا کی تمام بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں تحقیق ہورہی ہے اور اس کے ڈپارٹمنٹ کھلے ہیں مگر کوئی افاقہ نہیں۔حقیقت میں یہ کینسر سے بھی زیادہ خطرناک ہے اس لئے کہ اب بہت سے کینسروں کا علاج یا زندگی کو طوالت دینے کے طریقے ایجاد ہوگئے ہیں مگر یہ سزائے موت ہے۔خوش قسمتی سے یہ بیماری بہت عام نہیں۔

☆ ؎ بعد مدت کے یہ گھڑی آئی
آپ آئے تو زندگی آئی

کے مصداق جب امریکہ میں مدت بعد نجمہ بی سے آپ کی ملاقات ہوئی تو دونوں طرف کے احساسات کو زبان کن الفاظ میں دی گئی؟

☆☆ چلیں! تو آپ بھی دھوکا کھا گئے۔نجمہ سچ میں امریکا آئی تھی اور اس طرح وہ پچاس سال بعد اچانک نمودار ہوگئی تھی ہماری مشترکہ کلاس فیلو سے اس نے رابطہ بھی کیا تھا جس نے مجھے اس کی اطلاع دی۔مگر اس نے کسی پرانے کلاس فیلو سے رابطہ کرنے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔اس کہانی کو افسانوی رنگ اور متاثر کن انجام دینے کے لئے میں نے ہماری ملاقات کا واقعہ گڑھ لیا۔

نہ ملاقات نہ ہی کوئی پیام سلام

اب مجھے یقین ہوگیا کہ جہاں تک اُسکا تعلق ہے ہمارے درمیان کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔

☆ کچھ قصے امریکہ میں دل کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئے مثلاً آپ ایک محترمہ کے ساتھ ڈیٹ پر بھی گئے تھے؟

☆☆ پہلے تو میں پاکستانی قارئین کے لئے یہ لکھ دوں کہ ''ڈیٹ'' یعنی مخالف جنس کے ساتھ باہمی رضامندی کے ساتھ ایک اچھی شام گذارنا یہاں کے کلچر میں شامل ہے بلکہ ایسا ضروری ہے۔تو میں،چونکہ یونیورسٹی ہسپتال میں مشہور ومقبول تھا اس لئے یہ میرے لئے مشکل نہ تھا کہ میں کسی کو شام یا کھانے پر دعوت دوں۔پھر ڈیٹرائیٹ میں جھیل اور دریا کے کنارے بہت ہی خوبصورت جگہیں تھیں۔ایک ہی نہیں،میں نے کئی ڈیٹس کی تھیں۔اس سلسلے میں شکاگو میں ایک لڑکی ''جینی'' مجھے بہت پسند آئی اور اس نے بھی مجھے بہت محبت دی۔مگر ایک تو اپنی والدہ سے کئے گئے وعدے اور دوسرے پاکستان واپس آنے کے مصمم ارادے کی وجہ سے میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس سلسلے کو آگے بڑھاؤں اس کہانی کو میں نے بہت دلگداز انداز سے اپنے افسانوں کے مجموعے میں'' آج کی مریم'' کے نام سے لکھا ہے یہ افسانہ کوئی چار سال پہلے ''الحمرا'' لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ مبین مرزا صاحب نے اپنے جریدے مکالمہ (شاید یہی نام ہے) میں بھی شائع کیا تھا۔

☆ خدمت خلق کا جذبہ آپ کے ہاں کب اور کس جذبے کے تحت شروع ہوا۔اب تک کتنے حاجت مندوں کو اُن کی منزل تک پہنچا چکے ہیں؟

☆☆ اس سوال کا اخلاقی طور پر میں جواب نہیں دے سکتا کیونکہ ایسے معاملات بندے اور اللہ کے درمیان ہوتے ہیں۔مختصراً یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس بات کا بہت احساس ہوتا ہے کہ خداء ذوالجلال کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔اس قرض کو میں صرف اس طرح اتارنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس کے بندوں کی مدد کردیتا ہوں۔یہ میں،امریکا میں مقیم تابش خانزادہ کی ایک انجمن دوسرے اداروں،جو پاکستان میں کام کررہے ہیں،کے ذریعہ کرتا ہوں اس کے علاوہ اگر کبھی کوئی مجھ سے رجوع کرتا ہے یا مجھے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ضرورت مند ہے تو میں بلا واسطہ اسکی بھی مدد کردیتا ہوں۔اس میں میری کوئی تعریف یا احسان نہیں اس لئے کہ یہ ایک قرض ہے جو مجھے اتارنا ہی چاہئے۔

☆ آپ کی کامیاب زندگی میں بڑے بھائی صاحب کے ایثار اور قربانی کا آپ نے بڑی دردمندی سے ذکر کیا ہے۔عملی طور پر اس حوالے سے کیا خدمات ہیں؟

☆☆ میرے بڑے بھائی کے یوں تو مجھ پر بڑے احسانات ہیں مگر سب

سے بڑی بات یہ کہ اگر وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر نوکری نہ کرتے تو ہمارا کنبہ درخت کے نیچے بھی پناہ نہ لے سکتا تھا۔ انہوں نے اپنا تابناک مستقبل ہماری خاطر قربان کیا، ان میں وہ تمام صلاحیتیں تھیں جو مجھ میں ہیں بلکہ مجھ سے بھی بڑھ کر، اس لئے مادی طور پر شاید وہ مجھ سے کہیں زیادہ کامیاب ہو سکتے تھے مگر انہوں نے ہمارے ابا کے بے وقت ریٹائر ہونے پر تمام کنبے کو سپورٹ کیا تا آنکہ ہم اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو گئے۔ اپنے بھائی کی رحلت پر میں نے ایک یادگاری خاکہ لکھا تھا، کوشش کر کے اسے تلاش کروں گا اس درخواست کے ساتھ کہ آپ اسے شاملِ اشاعت کر لیں۔

☆ احباب کو ایک گلہ آپ سے یہ بھی ہے کہ امریکہ سے ریٹائرمنٹ کے بعد آپ گھر بیٹھنے کے بجائے پاکستان کے کسی گوشے میں غریب اور نادار مریضوں کی خدمت کرتے تو ملک وقوم کا بڑا قرض ادا ہو جاتا؟

☆☆ یہ سوال مجھ سے پہلے بھی میرے دوستوں نے کیا ہے۔ اوّل تو یہ کہ پاکستان میں اس قسم کی خدمتِ خلق کا کام بہت سے لوگ کر رہے ہیں دوسرے فی الحال میں امریکا نہیں چھوڑ سکتا، پھر یہ کہ میں نے گزشتہ پچاس سال ڈاکٹری کی ہے جو بہت محنت کش اور تھکا دینے والا کام تھا۔ اب میں عمر کے جس حصے میں ہوں اس میں تقویت یا ہمت کا وہ عالم نہیں کہ مزید کام کر سکوں۔

☆ امریکن انگریزوں کی اولاد کہے جاتے ہیں۔ بستے وہاں کالے بھی ہیں۔ ایشین، عرب اور یورپ کے علاوہ چین، روس، میکسیکو وغیرہ کے لوگ بھی خاصی تعداد میں مقیم ہیں۔ ان رنگ برنگے لوگوں کا آپس میں میل جول، برتاؤ اور سبھاؤ کس نوعیت کا ہے یعنی عام امریکی اپروچ کو دو لفظوں میں کس طرح بیان کیا جا سکتا ہے؟

☆☆ یہ ایک حقیقت ہے کہ امریکا میں مختلف اقوام بستی ہیں۔ اگرچہ اکثریت سفید فام نسل کے لوگوں کی ہے جنکے آبا و اجداد برطانوی تھے مگر یہاں روسی، اطالوی، پولش، یونانی اور ہسپانوی النسل لوگ بھی بڑی تعداد میں ہیں اسکے علاوہ سیاہ فام، عربی، یہودی (جو سفید فام ہیں اور انکی اکثریت جرمن نسل کی ہے) پھر پاکستانی اور بھارتی اور سب سے بڑھ کر چینی نسل جو اپنی ترچھی آنکھوں اور پیلی رنگت سے باقی لوگوں سے جدا ہیں۔ سفید فام نسل کا ایک بڑا حصہ بڑی جلد ہی عام دھارے میں گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ انکی پہلی نسل (یعنی تارکینِ وطن) کے افراد اپنے انگریزی کے لہجے کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں مگر ان کے بچے جو امریکا میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے امریکی لہجے، طرزِ زندگی اور رنگ و روپ کی وجہ سے باقی سفید فام امریکی قوم کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مگر اس سے پہلے یہ سفید فام اقلیتی گروپ بھی اپنی پہچان رکھتا ہے اور زیادہ تر اپنی ہی آبادی میں گھلا ملا رہتا ہے۔ نیویارک میں ایسے کئی محلے ہیں جو صرف اطالویوں کے اور لاس انجلز میں ہسپانویوں کے ہیں۔ شکاگو میں آئرش اور ڈیٹرائیٹ میں پولش محلے ہیں۔ اسی طرح سیاہ فام اپنوں میں، پاکستانی پاکستانیوں میں، اطالوی اطالویوں میں، پولش اور یونانی عرب، عربوں میں سماجی ربط و ضبط رکھتے ہیں مگر انکے محلے الگ نہیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔ بقول شاعر

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

کبوتر با کبوتر، باز با باز

اس لئے مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر تارکینِ وطن کی شناخت بڑی واضح ہو تو سب کی اپنی الگ الگ دنیا ہے۔ میں اپنے مشاہدے سے کہہ سکتا ہوں کہ امریکی مسلمان کبھی بھی امریکی قوم کے خاص دھارے کا حصہ نہیں بن سکتے کیونکہ وہ اس دھارے کا حصہ بننا ہی نہیں چاہتے۔ انہوں نے نہایت سختی سے اپنی شناخت باقی رکھی ہے اور وہ اس پر اٹل رہنا چاہتے ہیں اب تو یہاں پاکستانی اور دیگر مسلم خواتین پاکستان سے بھی زیادہ حجاب و نقاب اور پردے کا اہتمام کر رہی ہیں اور ضرورت پڑنے پر بھی اپنے مرد سوپر وائزرز سے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیتی ہیں۔ اسکے علاوہ لڑکوں کی ایک چھوٹی تعداد شرعی داڑھی رکھتی ہے اور کچھ تو یہاں بھی پگڑی اور ٹخنوں سے اونچی شلوار پہنتے ہیں۔

☆ 9-11 کے بعد کے واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو حالات میں کیا تبدیلی نظر آتی ہے اور اُس کے امریکن کے علاوہ آبادکاروں بالخصوص مسلمانوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

☆☆ ۹۱۱ کے فوراً بعد کچھ دہشت اور خوف و ہراس کی فضا بن گئی تھی مگر غیر ضروری طور پر کسی سے بھی کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ شائد ایک فیصد سے بھی کم مسلمانوں سے کچھ پوچھ گچھ کی گئی ہو۔ کچھ دیہی علاقوں میں اسلام، مسجدوں اور مسلمانوں کے خلاف نفرت دیکھنے میں آئی جیسے مسجدوں کی تعمیر میں رکاوٹیں ڈالی گئیں مگر چونکہ ملک میں قانون کی حکمرانی ہے اور سب کو بلا تفریق رنگ و مذہب آزادی حاصل ہے اس لئے عملی طور پر وہ چند مذہبی دیوانے کچھ نہ کر سکے۔ مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے لئے لڑنے والوں میں یہودی انجمنیں پیش پیش تھیں۔ اسی طرح ۹۱۱ کے فوراً بعد ہماری مسجد کی نگہبانی کے لئے مقامی چرچ کے خاکساروں نے کچھ دن پہرے دئے۔

☆ آپ نہیں سمجھتے کہ یہ حالات دانستہ پیدا کیے گئے تاکہ مسلمانوں کو زیرِ دام لایا جائے سکے؟

☆☆ یہ مشکل سوال ہے اور سچ یہ ہے کہ اس حادثے کے بعد کئی کتابیں ایسی شائع ہوئیں جن کے مصنف امریکی تھے اور انہوں نے بھی یہی سوال اٹھایا کہ یہ حادثہ دانستہ امریکی خفیہ اداروں نے کیا تھا۔ اس پر بڑی گہری اور عمیق ریسرچ ہوئی جس میں بڑے بڑے انجینئرنگ کالج بھی شامل تھے کہ یہ عمارتیں کیسے گریں مگر اسکا کوئی حتمی جواب نہیں مل سکا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ حادثہ بن لادن اور القائدہ ہی نے کیا تھا اور اس سے عالمِ اسلام اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو فائدے کے بجائے بہت زیادہ نقصان ہوا۔

☆ اس حوالے سے ایک ٹھوس حقیقت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ

حادثے کے دن قریب پانچ ہزار یہودی جو ٹاور کے مختلف اداروں میں ملازمت کرتے تھے وہ سب کے سب منظّم طور پر اُس روز رخصت پر تھے؟

☆☆ جی ہاں تمام مسلمان ملکوں میں یہ مشہور ہے کہ اس دن یہودیوں نے چھٹی کی تھی اور اس لئے اس حادثے میں وہ اپنی عیاری سے بچ گئے۔ میں اس افواہ کی تردید کرنا چاہوں گا۔ سچ یہ ہے کہ اس حادثے میں اُس روز بہت سے یہودی بھی مارے گئے تھے۔

☆ آئے دن مسلمانوں کے ساتھ جو امتیاز کی خبریں آتی ہیں کہ فلاں کو جہاز سے آف لوڈ کر دیا، فلاں کو بس سے دھکے دے کر اُتار دیا گیا، فلاں کو سکول یا دفتر سے جواب دے دیا میں کہاں تک صداقت ہے۔ ایسے مواقعوں پر امریکی حکام کا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟

☆☆ یہ واقعات خال خال ہی ہوتے ہیں اور نہ صرف مسلمانوں کے ساتھ بلکہ بہت سے دیگر لوگوں کے ساتھ بھی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی سفید فام اقوام کے لوگ بھی ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ اس حادثے سے امریکی سائیکی بدل گئی۔ یہ نہایت آزاد، ہر شخص پر بھروسہ کرنے والی قوم تھی، یہاں کسی بھی قسم کی سیکورٹی نہیں تھی۔ ۱۹۷۰ء میں امریکا چھوڑتے ہوئے کسی قسم کا پاسپورٹ کاؤنٹر نہ تھا، ٹکٹ لیں اور جہاز میں بیٹھیں۔ کوئی یونی فارم میں بیٹھا آپ کے پاسپورٹ پر ٹھپے نہیں مارتا تھا۔ ہم پاکستان سے آنے والوں کو ہوائی جہاز کے دروازے پر لینے اور چھوڑنے جاتے تھے اب یہ سب بدل گیا ہے، پھر بھی ایئرپورٹ پر امریکا چھوڑتے ہوئے پاکستان کے مقابلے میں کہیں کم سیکیورٹی چیک ہوتی ہے۔

☆ امریکہ بہادر کی جارحانہ روش بلخصوص مسلمانوں کو دیوار سے لگانے کی پالیسی پر امریکی عوام کا تاثر کس قسم کا ہے؟

☆☆ میں امریکا کی چند اچھائیوں کے ساتھ اس ملک کی خارجہ پالیسی سے سخت اختلاف کرتا ہوں اور آزادیءِ رائے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسکا اظہار کرتا رہا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ امریکی حکومت اور انکے بااختیار لوگوں کی پالیسی یہ ہے کہ ''امریکا پہلے'' ایک عام امریکی کی زندگی دوسری اقوام کے لاکھوں لوگوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ جس کے لئے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ اسی طرح امریکا کے معاشی مفادات کے تحفظ کے لئے وہ ساری دنیا کو الٹ کر رکھ دینے کو تیار ہیں۔ عراق کی جنگ اسکی ایک مثال ہے۔ انکی ایجنسیوں نے عام لوگوں اور خصوصی طور سے دیہی آبادی اور شہر کی نسبتاً کم تعلیم یافتہ یا عالمی حالات سے کم آگاہ لوگوں میں اسلامی فلسفے، طرزِ زندگی اور جہادی تحریک کا اس قدر ''خوف'' بٹھا دیا ہے کہ بڑی حد تک وہ حکومتی اقدام کے ساتھ ہیں مگر ملک کی ایک بہت بڑی آبادی اس کے خلاف بھی ہے اور یہ آزاد خیال لوگ بار بار اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، کتابیں لکھتے ہیں، میڈیا پر اسکے خلاف پروگرام کرتے ہیں اور جلوس نکالتے ہیں۔ اس میں کچھ ہمارا بھی قصور ہے۔ عید کی خوشی میں امریکا کے ڈاک کے نظام نے ٹکٹ جاری کیا۔ وائیٹ ہاؤس میں رمضان میں روزہ افطار ہوتا ہے، مگر پھر کوئی نہ کوئی حادثہ ہو جاتا ہے جو کئے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے۔ جیسے ایک مسلمان ڈاکٹر نے جو امریکی فوج میں بہت بڑی پوزیشن پر تھا اپنی ہی کلینک میں مشین گن چلا دی اور بارہ نوجوان بے گناہ سپاہیوں کو ہلاک کر دیا جو اسے دیکھنے کے لئے لائین میں کھڑے تھے یا فرانس کے خوبصورت ساحلی شہر NIECE میں خوشیاں منانے والے معصوم لوگوں پر ایک مسلمان نے ٹرک چڑھا دیا اور بوڑھوں عورتوں اور بچوں کو کچل دیا۔ اس وجہ سے ایک عام امریکی عالمی پس منظر میں مسلمانوں کو ایک دہشت پسند قوم سمجھتا ہے۔

☆ آپ کے خیال میں مستقبل کے امریکہ میں مسلمان خاص طور سے پاکستانیوں کا مستقبل کس طرح کا نظر آتا ہے؟

☆☆ اسکا جواب بہت مثبت ہے۔ موجودہ پاکستانیوں اور انکی آنے والی نسلوں کا مستقبل بہت تابناک ہے۔ پاکستانی بچے بہت اعلیٰ یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں انکی کارکردگی بہت اچھی ہے اور ان میں مقابلے اور مسابقت کا جوش ہے اور وہ مقابلے میں بہت کامیاب ہیں۔ ان سے کسی قسم کا تعصب نہیں ہے۔ امریکا صرف ''میرٹ'' پر یقین رکھتا ہے، اگر آپ کے پاس صلاحیت ہے تو آپ کسی بھی نسل کے ہیں تو اعلیٰ ترین عہدہ آپکا حق ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مائیکروسوفٹ کا چیف جو حیدرآباد دکن کا ہندو ہے اس عہدے پر نہ ہوتا۔ یہ اتنی خراب اور اتنے خراب لہجے میں انگریزی بولتا ہے کہ کراچی میں اسکا مذاق اڑایا جاتا۔ پاکستانیوں یا دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی ہتک آمیز یا امتیازی سلوک نہیں برتا جاتا۔

☆ ایک سوال گورے، کالے کی شادی مسلم اور غیر مسلم کی شادی اور مونگرل بچوں کے مستقبل کے حوالے سے بھی سر اُبھارتا ہے؟

☆☆ گورے کالے یا مسلم اور غیر مسلم شادیوں یا اس کے نتیجے میں دوغلے بچوں کا مستقبل؟ تو پہلی بات یہ کہ یہ اس قدر کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر۔۔ پھر بھی۔۔ گورے اور کالے کے اختلاط کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے ہمیشہ کالی آبادی ہی میں قبول کیئے جاتے ہیں چاہے ان میں سے کچھ بچے بالکل ہی گورے کیوں نہ لگیں۔ مسلم اور غیر مسلم شادیاں بہت ہی کم ہیں مگر ایسی حالت میں فردِ ثانی کو اسلام قبول کرنا ضرور ہوتا ہے۔ بچے بھی اسلامی طرز ہی پر پالے پوسے جاتے ہیں۔

☆ یہ رائے کہاں تک درست ہے کہ ڈالر آخری سانسوں پر ہے۔ اس کے بعد دنیا میں کون سی کرنسی کا راج ہوگا؟

☆☆ دیکھیے یہ عمرانیات کا اصول اور تاریخ کی شہادت ہے کہ ''ہر عروج یا زوال است''۔ تو روما، مصر، یونان، عثمانیہ اور سلطنت برطانیہ سب ہی ایک وقت پر غروب ہو گئیں تو امریکا کا بھی وہ وقت ضرور آئیگا۔ لیکن اس وقت جو امریکا کی معاشی، صنعتی، سماجی اور فوجی حیثیت ہے اگر ایسا ہے بھی کہ اسکا سورج غروب ہونا

ہےتواس میں کئی سال لگیں گے۔اسکاوارث کون ہوگاتو لگتاتو یہی ہے کہ چین صحیح سمت میں رواں ہے۔اوراس کے ارادے بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ہم مسلمان امام مہدی اورحضرت عیسیٰ کے ظہورکاانتظارکررہے ہیں۔

☆ یہ کرپٹوکرنسی وغیرہ حقیقت ہے یاافسانہ،آنے والے دورمیں اس کا عالمی معیشت میں عمل دخل ہواتو تیسری دنیا کیا کرے گی؟

☆☆ میں مالی معالات میں بالکل کوراہوں۔اسوقت تک تو یہ کرنسی چل رہی ہے اور لگتا ہے کہ اسکومستقبل میں قبولیت حاصل ہوگی۔میں مزید اسکے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔

☆ اس تصورمیں کس حدتک حقیقت ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی سپر پاورکو چندلاکھ یہودیوں نے یرغمال بنایاہواہے؟

☆☆ یہ سوال میرے دل کے قریب ہے۔۔یرغمال نہیں بلکہ امریکاکواور امریکیوں کے دلوں کو جیت لیاہے۔اور مجھے اس میں یہ کہتے ہوئے کوئی شرم نہیں کہ ان میں،میں بھی شامل ہوں۔یہودی قیامت خیز باصلاحیت قوم ہے۔انہوں نے صدیوں سے بااختیارقوموں کے ظلم سہے ہیں۔ان کے ساتھ یورپ کے ہر ملک میں اچھوتوں کا سا برتاؤ کیا گیا ہے۔ان کے دروازوں پرنشان لگا دیئے جاتے تھے،ان پرواجب تھا کہ وہ خاص لباس پہنیں تا کہ انکی شناخت ہوسکے.وہ جب اس ظلم اوراچھوت برتاؤ کی وجہ سے امریکا آئے تو یہاں بھی تقریباً ۱۹۳۰ کی دہائی تک ان کے ساتھ بہت ہتک آمیزسلوک کیا گیا مگر انہوں نے من حیث ا القوم اس بات کا تہیہ کرلیا کہ وہ تعلیمی اور سماجی طور پر اسقدر ترقی کرینگے کہ امریکیوں کی آنکھیں چکا چوند ہو جائیں گی۔یہ سب کچھ انہیں انتہائی نا مساعد حالات میں کرنا تھا۔اس لئے کہ آئرش اورانگلش بااختیارا کثریت انکواب بھی کمتر اور اچھوت سمجھتی تھی۔آج امریکا میں ہر قابل عزت اور قابل ذکر پیشے میں یہودیوں کی اکثریت ہے۔بڑے بڑے سائنسدان،صحافی،پروفیسرز،ڈاکٹرز، اکاؤنٹنٹ،موجد،بینکرز،اورسرمایہ کار،یہ سب یہودی ہیں۔پھرانکا کرداراورسماجی خدمات کے حوالے سے ان کے نا قابل یقین اقدامات نے انہیں وہ عزت دی ہے جوکسی اوراقلیتی آبادی کو حاصل نہیں۔ہاں انہیں یہ فائدہ ضرورحاصل تھا کہ وہ ایسے ہی سفید فام تھے جیسے دوسرے اکثریتی امریکن پھران کا کلچر بھی وہی یورپین تھا جیسے دوسروں کا۔عالمی سطح پر جتنے ایسے کام جن سے انسانیت کی تقدیر بدل گئی اس چھوٹی سی قوم نے کیئے ہیں کسی نے نہیں کیا۔جتنے نوبیل انعامات انہوں نے جیتے ہیں کسی نے نہیں۔۔۔۔عرب اورمسلمانوں میں صرف عبدالسلام کوسائینس میں نوبل انعام ملا وہ بھی اسکے انگلینڈ میں کیئے ہوئے کام پر پاکستانی کام پرنہیں مگرہم اسے بھی نہیں اپناتے۔اسکا کوئی بھی مذہب ہے مگر وہ پاکستانی ہے۔ہم نے عاطف میاں کو بھی جسے شاید معاشیات میں نوبیل انعام مل جائے مذہب کی بنیاد پر دھتکار دیا۔مذہب اورقومیت دومختلف چیزیں ہیں(نہیں میں احمدی نہیں ہوں)بس ایک مسلمان اور پاکستانی ہونے کی وجہ سے میرا دل مسلمانوں کی موجودہ حالت پرجلتا اوردکھتا ہے۔امریکامیں یہودیوں کی ترقی واثر رسوخ دیکھتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ انہوں نے علامہ اقبال کے فلسفے پرعمل کیا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تو یہ انکے کارنامے ہیں جس کی وجہ سے وہ امریکا پر چھائے ہوئے ہیں اور امریکی مقتدرہ قومی معاملات میں ان سے خود پوچھتی ہے کہ کیا کِیا جائے۔

گلزارصاحب! آپ کے سوالات چبھتے ہوئے بھی تھےاور بیحد معنی خیز بھی۔میں نے انکے جواب سنجیدگی اور دیانت داری سے دئے،اگران سے آپ یا قارئین کی دل شکنی ہوئی ہوتو معذرت مگرسچائی اوراپنے احساسات کوکھل کر بیان کرنا میرااصول ہے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے،بیگانے بھی ناخوش
میں زہر حلاہل کو کہہ نہ سکا قند

''کرامات''

آمدہ چہارسو کی نسبت اس بارمیری خوشی انتہا کوچھورہی ہے کیونکہ میری اطلاع اور ذرائع کے مطابق آمدہ اشاعت میرے نہایت عزیزاورہونہارڈاکٹر فیروز عالم کے نام منسوب ہے۔ڈاکٹر فیروز عالم جسے میں ''سوہنا منڈا'' کہہ کراپنے دل کوٹھنڈک پہنچاتا ہوں حقیقت میں وہ ایک سرد گرم چشیدہ ایک ایساانسان ہے جس نے زندگی کے بےشماررنگ،رویے اورموسم نہ صرف دیکھے بلکہ خود پرطاری بھی کیے ہیں۔فیروز عالم ادیب برائے ادیب کا نام نہیں بلکہ ادیب برائے عمل کا نام ہے۔وہ طِب ہو،فلاحِ انسانیت ہو،افسانہ ہو،آپ بیتی ہو،ترجمہ ہو،تنقید ہو یا تحقیق ہرشعبے میں ایمانداری فیروز عالم کا شعار ہے۔لگی لپٹی بغیراپنی بات کہنا اوراس انداز سے کہنا کہ پیغام بھی پہنچ جائے اورسامنے والے کی دل آزاری تک نہ ہو کسی کوسیکھنا ہے تو یہ عمل فیروز عالم سے سیکھے۔شایداس شعر کے جائزحقدار فیروز عالم ہی ہیں:

ہاتھوں میں کوئی خنجر نہ دامن پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

یوگیندر بہل تشنہ (یو۔ایس۔اے)

دھنک کا آٹھواں رنگ

ڈاکٹر فیروز عالم

شعبہ طب کی سیکریٹری نے مجھے اطلاع دی کے میرے لئے وارڈ ''ڈی'' میں ایک نیا مریض داخل کیا گیا ہے اور یہ ضروری ہے کہ میں فوراً ہی اسکا معائینہ کرنے وہاں پہنچوں۔

یہ ۱۹۷۳ء کا سال تھا اور میں ڈیٹرائیٹ کی میڈیکل یونیورسٹی میں اپنی پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے چوتھے اور آخری سال میں تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے میری کارکردگی کی بنیاد پر چیف ریسیڈینٹ بھی مقرر کیا گیا تھا جو ایک بڑا اعزاز تھا اور مجھے ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن کے چیئر مین کا دست راست سمجھا جاتا تھا۔ یہ ہسپتال یوں تو امریکہ کے تمام یونیورسٹی ہسپتالوں کی طرح ہر مرض کے اعلی اور معیاری شعبوں پر مشتمل تھا مگر اسکی خاص وجہ شہرت اسکا کینسر وارڈ تھا۔ اس وقت میڈیسن کے چیئر مین بھی کینسر ہی کے شعبہ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں چونکہ میڈیسن ہی کا چیف ریسیڈنٹ تھا اس لئے میرا کینسر کے مریضوں سے بہت زیادہ واسطہ پڑتا تھا۔ یہ ایک مشکل صورتحال تھی اور اس کے لئے جذباتی طور پر بہت مضبوط ہونے کی ضرورت تھی۔ میں فطری طور پر ایک حساس انسان ہوں۔ پھر اس ہسپتال میں دور دور سے مریض علاج کی غرض سے بھیجے جاتے تھے اس لئے یہاں کینسر کے غیر معمولی مظاہرے دیکھنے کو ملتے تھے جو مریض اور معالج دونوں کے لئے بہت صبر آزما ہوتے تھے۔ پھر ۱۹۷۳ء میں علم طب کینسر کے سلسلے میں آج کی نسبت بہت پسماندہ تھا اور زیادہ تر مریض صحت یاب نہیں ہو پاتے تھے اور ہمیں دن رات اپنی ناکامی پر آنسو بہانے پڑتے تھے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ دور میری پیشہ ورانہ زندگی کا سب سے مشکل دور تھا تو یہ شاید غلط نہ ہو۔

وارڈ ''ڈی'' بھی کینسر وارڈ تھا۔ میں جب کمرہ نمبر چودہ میں داخل ہوا تو مریض کھڑکی کی طرف منہ کئے بیٹھا تھا میری جانب اسکی پشت تھی۔ اسکے نہایت سنہری اور گھنے بال کمر پر نیچے تک پھیلے ہوئے تھے اور ڈھلتی دھوپ کی روشنی میں ان میں سونے کے تاروں جیسی جھلملاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کو تو میں ٹھٹک گیا۔ چارٹ پر تو کسی مرد کا نام تھا یہ تو ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ میری آہٹ پر اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ خوبصورت چہرہ، گہری جھیلوں جیسی نیلی آنکھیں اور انتہائی صبیح اور شفاف جلد۔ میری اب بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اپنی مردانہ مگر نرم آواز میں مجھے خوش آمدید کہا ''ہیلو ڈاکٹر۔ اندر آؤ میرا ہی نام یوجین زاجک ہے'' اوہ! اب میری سمجھ میں آیا۔ اس زمانے میں لڑکوں میں لمبے بال رکھنے کا فیشن تھا۔ ہپی ازم کا دور تھا اور یہ اتنا کم عمر تھا کہ اسکی مونچھیں اور داڑھی ابھی اتنی گھنی نہیں ہوئی تھیں کہ اس کا چہرہ مردانہ لگتا۔ ''ہیلو یوجین'' میں نے کہا اور نزدیک ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ کھڑکی نیچے لان بلکہ گاف کورس پر کھلتی تھی۔ نگاہوں کے سامنے دور دور تک گہرہ سبزہ پھیلا تھا جو سہ پہر کی سنہری دھوپ میں اور شاداب لگ رہا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ ایک مصنوعی جھیل تھی جسکے کنارے کنارے ویپنگ ولوّ (WEEPING WILLOW) کے درخت قطار سے لگے تھے اور ہلکی اور نرم ہوا میں انکی لمبی لمبی شاخیں لرزاں تھیں ہمارے سامنے سے کونج کی ایک ڈار ابھی ابھی جھیل کے پانی سے اڑ کر دور افق میں گم ہو گئی تھی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا، زندگی کتنی خوبصورت ہے مگر، مگر صرف انکے لئے جن کو زندگی کی دولت میسّر ہو۔ میں جس وارڈ میں بیٹھا تھا وہاں کے زیادہ تر مریضوں کو یہ دولت میسر نہ تھی اور انکا زندگی سے رشتہ جلد ہی ٹوٹنے والا تھا۔ میں نے ایک نظر بھر کر اس لڑکے کی طرف دیکھا اور اندر سے جیسے میرا دل بیٹھ سا گیا، یا اللہ اسکے نصیب میں کیا ہے؟؟

یوجین پولش نژاد امریکی تھا۔ اس نے دو سال پہلے ہائی اسکول سے گریجویشن کیا تھا اور اس وقت وہ مقامی ہارڈ ویئر اسٹور میں ایک معمولی سی ملازمت کر رہا تھا۔ امریکی کلچر کے مطابق وہ ماں باپ سے علیحدہ ہو گیا تھا اور اب اپنے دو دوستوں کے ساتھ شہر کے بوسیدہ علاقے میں کرائے کے ایک اپارٹمنٹ میں رہ رہا تھا۔ ملازمت تو وقت گذاری اور زندہ رہنے کے قابل آمدنی کی وجہ سے ضروری تھی ورنہ حقیقت میں وہ موسیقار بننا چاہتا تھا۔ اس کے دوست بھی موسیقی میں دلچسپی رکھتے تھے اور وہ مستقبل میں ایک کامیاب گروپ بننے کے خواب دیکھتے تھے۔

میں نے پوچھا ''یوجین! تمہیں اس وقت کیا تکلیف ہے، کوئی درد، کسی قسم کی کمزوری؟؟'' ''نہیں ڈاکٹر مجھے اسی بات کی حیرت ہے کہ مجھے کوئی تکلیف، کوئی درد یا کمزوری نہیں۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ جو ڈاکٹر مجھ سے کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے۔ میں اسی یقین کے ساتھ اس ہسپتال میں آیا ہوں کہ نواحی ہسپتال میں جو تشخیص کی گئی ہے وہ یہاں غلط ثابت ہو جائیگی اور آپ مجھے کلیئر کر دینگے'' اس نے میری جانب پر امید نظروں سے دیکھا۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ تقریباً ہر مریض پہلے پہل یہی کہتا تھا۔ وہ امید کے اس نازک سے دھاگے کو تھامے رہتا ہے جس سے اسکی زندگی کی آس بندھی ہوتی ہے وہ اس گمان میں رہتا ہے کہ شاید پہلے والے ٹیسٹ غلط ہوں اور اب سب کچھ ٹھیک نکل آئے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں خود بھی ان مریضوں کے ساتھ اسی موہوم سی امید سے بندھ جاتا تھا اور دعا کرتا تھا کہ ہمارے ہسپتال میں ٹیسٹ ٹھیک نکل آئیں اور میں مریض کو ایک اچھی خبر سناؤں۔ ایسا ناممکن بھی نہیں تھا۔ ایک بہت ہی چھوٹی تعداد میں یہ ہوتا بھی تھا کہ کسی وجہ سے پہلی تشخیص غلط ثابت ہوتی تھی اور مریض ایک نئی زندگی کا پروانہ لیکر خوشی خوشی ہسپتال سے رخصت ہوتا تھا۔ ہم تمام ڈاکٹروں کے لئے بھی اس سے بڑی خوشی کی اور کوئی بات نہیں تھی کہ ہم مریض کو ایسی خوشخبری سنائیں مگر کمرے میں آنے سے پہلے میں نے یوجین کی ساری ریپورٹس پڑھی تھیں اور مجھے لگا تھا کہ اس کے معاملے میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے مگر ایک اصول کے تحت ہمارا یہ فرض تھا کہ ہم پھر بھی تمام ٹیسٹ دوبارہ کریں اور علاج سے پہلے تشخیص کو مستحکم بنیادوں پر قائم کریں۔

میں نے اس سے کہا مجھے تفصیل سے بتاؤ یہ سب کیسے شروع ہوا۔''

ڈاکٹر میں بالکل صحت مند اور نارمل تھا، بلکہ اپنے خیال میں تو میں اب بھی نارمل ہوں۔ایک دن میری داہنی بغل میں کچھ خارش سی ہوئی میں نے کھجانے کے لئے ہاتھ ڈالا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری بغل میں ایک بڑی اور سخت گٹھلی سی ہے۔اس میں کوئی تکلیف نہیں تھی میں اسے بھول بھی گیا۔کچھ ہی دن بعد میرے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ تمہاری گردن میں یہ سوجن سی کیا ہے میں نے ہاتھ لگایا تو وہاں بھی ایک گلٹی نمودار ہوچکی تھی۔یہ بھی بے ضرر سی تھی اور مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی۔مگر میں ایک موسیقار اور گلوکار ہوں اور گلے میں گلٹی سے میں پریشان ہوا کہ کہیں یہ آواز پر اثر انداز نہ ہو۔میں نے فوراً اپنے فیملی ڈاکٹر کو دکھایا اس نے ٹیسٹ کر کے مجھے بتایا کہ مجھے کینسر ہے۔بس یوں ہی بالکل بیساختہ اور جذبات سے عاری آواز میں،جیسے وہ مجھے گذری شام ہونے والے بیس بال میچ کا نتیجہ سنا رہا ہو۔ڈاکٹر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔میں تو بلکل ہٹا کٹا ہوں۔مجھے کینسر کیسے ہوسکتا ہے؟؟"میں نے توجہ سے اسکا معائنہ کیا۔گلٹیاں اپنی جگہ پر موجود تھیں۔اسکے متعلق نرس کو کچھ ہدایات دے کر میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا جہاں میرے سینئر ڈاکٹر موجود تھے ان کے ساتھ اس کیس پر تبادلہء خیالات ہونا تھا۔سب کا خیال تھا کہ اسکو ہاجکنس (HODGKINS) کی بیماری ہے جو ایک قسم کا کینسر ہی ہے۔مگر اب بھی اسکی حتمی تشخیص باقی تھی۔

دوسرے دن بائیوپسی کیلئے گلٹی کا آپریشن کیا گیا اور خون کے کئی ٹیسٹ بھی کئے گئے۔معائنے کے واسطے میں نے ہی اسکا ہڈی کا گودہ نکالا اور اب ہم نتائج کا انتظار کرنے لگے۔یوجین کا حوصلہ بلند تھا اور وہ مستقل مجھ سے کہہ رہا تھا ڈاکٹر تم دیکھنا ہر چیز صحیح آئیگی۔میں بھی اسکا دل رکھنے کو یہی کہتا تھا کہ ہمیں اچھی امید رکھنی چاہئے۔یہ جملہ امریکہ میں ڈاکٹروں کا پسندیدہ جملہ ہے اور میں بھی اب انہی کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔

اس کے تمام ٹیسٹ کے نتائج آگئے تھے۔میں نے ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے ہر ٹیسٹ کو نہ صرف بہت غور اور گہرائی سے جانچا تھا بلکہ ان کے متعلقہ شعبوں اور وہاں کے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کے ساتھ بیٹھ کر ان سے صلاح ومشورہ بھی کیا تھا۔اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اسے ہاجکنس کی بیماری ہے۔آج کے دور میں یہ بیماری بڑی حد تک قابل علاج ہے اور زیادہ تر مریض اس سے مکمل طور پر صحت یاب ہوجاتے ہیں مگر اس زمانے میں اسکا علاج بیحد مشکل تھا اور بہت سے مریض تو صرف علاج کے مضر اثرات کی وجہ سے ہی جاں بحق ہوجاتے تھے۔ یوجین زاجک کے نتائج کا جب ہم نے تجزیہ کیا تو یہ بات واضح ہوگئی ک وہ اس بیماری کی چوتھی اور آخری اسٹیج میں ہے اور اسکے صحت یاب ہونے کا امکان بہت ہی کم ہے اور یہ کہ وہ اس بیماری سے جانبر نہ ہوسکے گا۔

صبح کے تقریباً گیارہ بجے تھے جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوا۔وہ حسب عادت کھڑکی کے پاس بیٹھا اپنے گٹار کو چھیڑ رہا تھا۔اسکی آنکھیں کھڑکی کے پار جمی تھیں۔دور،گاف کورس اور اسکے درمیان بنی جھیل کے اس پار درختوں کے جھنڈ خزاں کے رنگوں کی اوڑھنیاں اوڑھے تھے۔سرخ،زرد اور نارنجی پتوں نے جنگل میں ایک آگ لگائی ہوئی تھی۔یہ ایک خوبصورت دن تھا دھوپ میں چمک مگر نرمی تھی اور گہرے نیلے آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے سفید ٹکڑے تیر رہے تھے۔ابھی ابھی بارش ہوکر مطلع صاف ہوا تھا اور آسمان پر مغربی جانب دھنک کی شکستہ کمان نے رنگ سے بکھیرے ہوئے تھے۔اس نے میری جانب دیکھ کر کہا "WHAT A NICE DAY" "INDEED" میں نے جواب دیا۔اسنے مسکرا کر پھر کہا "ڈاکٹر مجھے یقین ہے کہ اس قدر خوبصورت دن میں تم مجھے صرف اچھی خبر ہی سنا سکتے ہو" میں کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔مجھے نہ صرف الفاظ کی تلاش تھی بلکہ اس حوصلے اور جرأت کی بھی کہ میں اسے ایک بری خبر سنا سکوں۔اس نے گٹار کا ایک تار چھیڑ کر لاپرواہی سے کہا "TAKE YOUR TIME, I AM IN NO HURRY" اور گٹار پر جھک کر ایک مشہور دھن بجانے لگا۔میں نے اسے روکا اور کہا میری بات غور سے سنو یہ بہت اہم ہے۔

اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا اس نے میری طرف دیکھا اور بیساختہ کہا "اوہ۔۔میں سمجھ گیا!! تو مجھے کینسر ہے۔یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟؟"میں نے اسے تفصیل بتائی۔امریکہ میں مروج طریقوں کے مطابق اسے بیحد صفائی اور سچائی سے مرض کی سنگینی سے آگاہ کیا کہ یہ بھی ممکن ہے بلکہ اسکا زیادہ امکان ہے کے کہ اس کی موت واقع ہوجائے۔اسکا ہنستا مسکراتا چہرہ جیسے ایک دم بجھ گیا۔مجھے بھی ایسا لگا جیسے یہ خوبصورت دن،سورج کی تابناک روشنی اور خزاں کے دلفریب رنگ یکلخت گہن کی گرفت میں آکر سنولا گئے ہوں۔جیسے تمام منظر پر ایک مہیب سا سایہ چھا گیا ہو۔اس نے نہایت ہمت اور جرأت سے مجھ سے پوچھا "میرے پاس کتنا وقت ہے؟؟"میں نے جواب دیا کہ یہ سوال ابھی قبل از وقت ہے کیوں کہ ہم بالکل ناامید نہیں ہوئے ہیں اور ہم اسکا علاج شروع کرنا چاہتے ہیں۔اس نے مجھ سے علاج کی تفصیلات پوچھیں۔میں نے اسے تفصیلات بتائیں اور یہ بھی کہا کہ سہ پہر میڈیکل کے چیف آکر اسکا معائنہ کرینگے اور علاج کی مزید تفصیلات اسے بتائینگے۔

یوجین کے کمرے میں دن رات اسکے دوستوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔یہ سب بھی اسی جیسا حلیہ اختیار کئے ہوئے تھے۔لمبے لمبے بال،کچھ کی داڑھیاں،میلے چیکٹ کپڑے اور گلے میں مختلف پیتل تانبے اور کوڑیوں کے ہار۔یہ اس دور کے بے فکر امریکی نوجوان تھے جو ہر وقت امن اور آشتی کا پرچار کرتے پھرتے تھے۔کبھی کبھی سب مل کر گٹار پر کورس میں گیت بھی الاپتے تھے۔اسکے کمرے میں پکنک یا کیمپ فائیر کا سماں ہوتا تھا۔اسے یا اسکے ساتھیوں کو صورتحال کی سنگینی کا احساس نہ تھا جسکی وجہ ے مجھے مزید پریشانی تھی مجھے معلوم تھا کہ بہت ہی جلد اسکو ایک مشکل آزمائش سے گزرنا ہے۔ہسپتال کی انتظامیہ نے اس فلور پر ملاقات کے اوقات اور دوسرے قوانین کو نرم کردیا تھا کیونکہ اس وارڈ کے مریضوں کی بیماری نہایت خطرناک تھی اور انہیں جذباتی سہارے کی شدید ضرورت تھی اسی لئے اس بات کی حاصلہ افزائی کی جاتی تھی کہ ان کے دوست اور رشتہ دار انکی زیادہ سے زیادہ عیادت کریں۔یوجین اور

اسکے حواریوں میں صرف ایک یہ فرق تھا کہ جہاں اسکے دوستوں، جن میں لڑکیاں بھی شامل تھیں، کے لمبے بال میل اور چکنائی میں الجھے رہتے تھے اسے اپنے بالوں کا بہت خیال تھا۔وہ اپنے بالوں سے والہانہ محبت میں گرفتار تھا۔اسکے بال تھے بھی غیر معمولی طور پر خوبصورت۔ میں نے امریکہ کی سفید فام آبادی میں بھی اتنے چمکدار اور سنہری بال شاید ہی دیکھے تھے۔وہ صبح سویرے انکو خاص شیمپو سے دھو کر کئی کئی بار ان میں برش کرتا بلکہ ہر وقت ہی انہیں برش سے چھیڑتا رہتا تھا۔

ایک سہ پہر میں نے اس کے پاس بیٹھ کر اسے تفصیل سے کیموتھیراپی کے متعلق بتایا۔اس زمانے میں اندرونی اعضاء کی تصویر کشی کی ایسی مشینیں ایجاد نہیں ہوئیں تھیں جیسی آج ہیں۔اس لئے سب سے پہلا مرحلہ تو یہ تھا کہ اسکی بیماری کی درجہ بندی کرنے کے لئے اسے ایک بڑے آپریشن سے گذرنا تھا جس میں اس کے پیٹ کو کھول کر اندرونی اعضا کا معائنہ شامل تھا۔دکھ کی بات یہ تھی کہ یہ آپریشن، اتنا بڑا آپریشن علاج نہیں تھا بلکہ صرف ایک قسم کا ٹیسٹ تھا جو علاج تجویز کرنے میں مددگار ثابت ہوتا۔اس نے بڑی توجہ سے سنا اور اس کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔دوسرے تمام اقدامات کو بھی اس نے بڑی جرأت سے سنا اور ان کے لئے بھی اپنی رضامندی ظاہر کر دی مگر جب میں نے اس سے کہا کہ چونکہ تھراپی سے تمہارے بال گر جائینگے اس لئے تھراپی شروع کرنے سے پہلے ہمارا مشورہ ہے کہ ہم تمہارا سر مونڈ دیں۔یہ سنتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے اس کے سینے پر گھونسا مارا ہو۔اسکے چہرے نے چند سیکنڈس میں کئی رنگ بدلے، پہلے اسکا چہرا گہرا سرخ ہوا پھر نیلگوں اور اسکے بعد یوں لگا جیسے کسی نے اسکے چہرے پر راکھ مل دی ہو۔چند ثانیوں کے لئے اس کا سانس رک سا گیا۔اس کا سینہ پھول گیا اور پھر بڑی مشکل سے اس نے ایک خوفناک آواز کے ساتھ سانس خارج کی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔میں نے اسکا کندھا تھپ تھپایا۔میں چپ تھا بولنے کے لئے میرے پاس کچھ نہ تھا۔

دوسرے دن جب میں صبح صبح اسکے کمرے میں پہنچا تو وہ تکیہ میں منہ دئے سسکیاں لے رہا تھا۔تکیہ آنسوؤں سے تر تھا اور اسکے بے ترتیب سنہرے بال تکیہ پر پھیلے تھے۔لگتا تھا وہ رات بھر روتا رہا ہے۔آج اہم دن تھا پہلے اسکا سر مونڈا جانا تھا اور سہ پہر میں اس کے پیٹ کا آپریشن تھا۔تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھی لڑکے لڑکیاں بھی آ گئے۔انہی میں ایک گہرے سانولے رنگ اور انتہائی سیاہ بالوں والی لڑکی بھی تھی یہ سیاہ لمبا چغہ اور اونچے لمبے بوٹ پہنے تھی۔اسکے گلے اور بالوں کی لٹوں میں موٹی موٹی کوڑیوں اور موتیوں کی مالائیں پڑی تھیں۔یہ شاید یونانی یا جپسی تھی۔اس نے مجھ سے بڑی بے تکلفی سے ''ہائے'' کہا اور پھر اس کی صحت یابی کے امکانات کے متعلق پوچھنے لگی۔میں پیشہ ورانہ آداب کے تحت اسے کچھ بتانے سے قاصر تھا۔اس کے اگلے سوال نے مجھے چکرا دیا ''ڈاکٹر!! تم دعاؤں پر اعتقاد رکھتے ہو؟؟'' میں نے کہا '' 'یقیناً'۔مگر دعائیں بھی میڈیکل امکانات کے تحت ہی کام کرتی ہیں۔اگر کوئی چیز میڈیکل لحاظ سے ناممکن ہو تو دعا اس پر کیا اثر کریگی'' اس نے تیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ''یہیں تو مجھے تم جیسے ڈاکٹروں سے اختلاف ہے، جب میڈیکل لحاظ سے بالکل ناامیدی ہو جبھی تو دعائیں اثر کرتی ہیں۔جو چیز انسان کے لئے ناممکن ہے وہ خدا کے لئے ممکن ہے۔کیا آپ نے سنا نہیں کہ ''PRAYERS CHANGE THINGS'' اسکے لہجے میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔اس نے جھک کر یوجین کے ماتھے پر بوسہ دیا اور کہا ''یوجین تم یقیناً اچھے ہو جاؤ گے بس امید نہ چھوڑنا'' اور کمرے سے چلی گئی۔

یوجین اس تمام عرصہ تکیہ میں منہ چھپائے سسکیاں لیتا رہا بار بار اس کے منہ سے ایک ہی جملہ ایک ایسی دلخراش آواز میں نکلتا تھا کہ اس سے میری روح لرز جاتی تھی۔یہ اس کے ٹوٹے دل کی فریاد تھی وہ بار بار کہتا تھا ''خدایا، میں ہی کیوں، میں نے کیا کیا تھا؟؟۔۔مجھے یہ کیوں ہوا'' یہ سوال تو اس نے مجھ سے بھی بار بار کیا تھا اور شاید اپنے تجسس کو مطمئن کرنے کے لئے اپنے مرض کی کئی تاویلیں خود ہی پیش کی تھیں۔کہیں ایسا کرنے سے تو نہیں ہو گیا، کہیں ویسا کرنے سے تو یہ بیماری نہیں لگ گئی۔ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔لیکن یہ بات واضح تھی کہ یہ بیماری اسکی کسی بد پرہیزی کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔کچھ ہی دیر بعد وارڈ بوائے سر مونڈنے کی مشین لئے آ موجود ہوا۔یوجین نے اسے بڑی ہی درد ناک نظروں سے دیکھا اور قریبی کرسی پر بیٹھ کر خاموشی سے اپنا سر جھکا دیا۔دوسرے لمحے اسکے سنہرے بالوں کی لٹیں زمین پر گرتی جاتی تھیں وہ اب بالکل خاموش تھا مگر اسکی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر اسکی گود میں رکھے تولیہ میں جذب ہو رہے تھے۔اسکے بعد آپریشن کا عملہ آ گیا اور اسکی ٹرالی دھکیلتے ہوئے آپریشن روم کی طرف روانہ ہوئے۔میں نے گرم جوشی اور شفقت سے اسکا ہاتھ دبایا اور کہا ''تم یقیناً ٹھیک ہو جاؤ گے۔۔اپنا خیال رکھو'' اس نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں اور خشک لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لا کر کہا ''شکریہ ڈاکٹر''۔

دو تین دن اسکے تکلیف اور غنودگی میں گذرے۔ادھر وہ جپسی لڑکی اسے روز دیکھنے آتی تھی اور اسکے کان میں بار بار سرگوشی کرتے ہوئے کہتی تھی کہ یوجین ہمت رکھنا، امید نہ توڑنا یاد رکھو اللہ کے یہاں ہر چیز ممکن ہے۔تیسرے دن میں جب اسکے کمرے میں پہنچا تو وہ بہت آرام سے تکیوں کے سہارے بیٹھا تھا۔چہرے پر مسکراہٹ تھی۔اس کے سرہانے ایک بڑا سا بینر لگا تھا جس پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا TOUGH TIMES NEVER LAST BUT TOUGH PEOPLE DO اور اسکے قریب ہی وہ جپسی لڑکی کھڑی مسکرا رہی تھی۔میں نے اس کی ہمت بڑھانے کو کہا کہ تمہاری پروگریس بہت اچھی ہے مگر اس کے ساتھ ہی نرمی سے اسے یہ بھی جتا دیا کہ یہ آپریشن علاج نہیں بلکہ ایک قسم کی تشخیص کا عمل تھا۔اس نے مجھ سے کہا ''مجھے کوئی فکر نہیں ڈاکٹر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اسکا مقابلہ مثبت سوچ اور بھرپور مدافعت کے ساتھ کرونگا۔میری زندگی نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔مجھے یہ جنگ جیتنی ہے''

آپریشن سے وہ جلد صحت یاب ہو گیا۔آپریشن کے نتیجے میں ہونے والی معلومات بھی کچھ خاص امید افزا نہ تھیں۔اسکا مرض چوتھی اور سنگین ترین اسٹیج میں

تھا۔یہ ناخوشگوار ذمہ داری بھی میری ہی تھی کہ میں اسے یہ خبر سناؤں مگر اسنے یہ خبر بھی بڑے تحمل سے سنی اور مسکرا کر کہا کوئی بات نہیں میرا عقیدہ ہے کہ یہ بیماری میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ دیکھو نا ڈاکٹر کتنا ہی گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو مگر ایک ننھا سا جلتا ہوا دیا اس اندھیرے کو ہرا کر اپنے اطراف روشنی پھیلانے میں ناکام نہیں ہوتا۔ یہ میری پختہ امید ہے جس نے یہ دیا روشن کیا ہے۔ یہ کبھی بجھ نہیں سکتا'' مجھے اسکا رویہ بہت اچھا لگا۔ میں نے بھی اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ ہم اس جنگ میں اسکا مکمل ساتھ دینگے اور اس کی صحت کے لئے ایک انگریزی محاورے کے مطابق دنیا کے آخری سرے تک جائینگے۔

آپریشن کے زخموں کے بھرنے کے فوراً ہی بعد اسکی کیموتھیراپی اور تمام جسم کی ریڈئیشن شروع ہو گئی۔ انکے اپنے ثانوی اثرات تھے جو بہت تکلیف دہ تھے ۔اسکو شدید الٹیاں آتی تھیں، اسکے منہ میں چھالے پڑ گئے تھے، جلد پر پپڑیاں سی بن گئی تھیں اور وزن کی کمی کے ساتھ اسکی کمزوری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی مگر میں جب بھی اسکے کمرے میں جاتا اسکے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی اور وہ ایک ہی بات کہتا'' یہ وقت بھی گذر ہی جائیگا۔۔یہ ایک فیز ہے جسے گزرنا ہی ہے، ڈاکٹر''۔ ہمیں سب سے زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ خون کے ذرّات کی کمی کے ساتھ اسکے پھیپڑوں میں انفیکشن نہ ہو جائے اس لئے کہ اس زمانے میں اس مرض میں یہی پیچیدگی زیادہ تر اموات کا سبب ہوتی تھی۔ حقیقت میں اس پیچیدگی کی شرح اس قدر زیادہ تھی کہ اسکا نہ ہونا ایک معجزے سے کم نہ تھا مگر ابھی یوجین کی آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی۔ کچھ ہی دنوں کے اندر اسے معمولی کھانسی شروع ہوئی جو سوکھی گھاس میں لگی آگ کی طرح اتنی جلدی پھیلی کہ دوسرے ہی دن اسکو سانس لینا مشکل ہو گیا اور پھر جلد ہی اسے مصنوعی سانس کی مشین پر ڈالنا پڑا۔ اگرچہ اسے کچھ سکون آمیز دوائیں دی جاتی تھیں مگر وہ ہوش میں تھا۔ میں جب اسکا ہاتھ تھام کر اسے دباتا تو وہ میری طرف دیکھتا، سانس کی نالی میں مشین کی نلکی کی وجہ سے وہ بول تو نہیں سکتا تھا مگر پھر بھی میری طرف دیکھتا اسکی آنکھوں میں وہی چمک ہوتی اور وہ اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کو اوپر کر کے اشارہ کر کے کہتا میں ٹھیک ہوں اور جیتو نگا۔ اسکی حالت تیزی سے بگڑ رہی تھی۔ میرے سینئر ڈاکٹر امید چھوڑ چکے تھے اور کہتے تھے کہ اب ہمیں علاج بند کر دینا چاہئے مگر ابھی ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ پھیپڑوں پر کس جرثومے کا حملہ ہے۔ اسکے معلوم کرنے کا طریقہ اس دور میں صرف یہ تھا کہ سینہ کھول کر پھیپڑے کی بایوپسی کی جائے۔ اسکی جو حالت تھی اس کو دیکھتے ہوئے اسکا اس سرجری سے جانبر ہونا ممکن نہ تھا۔ میں ابھی ہار ماننے پر تیار نہ تھا۔ اس مسئلے پر ہماری ٹیم میں بہت بحث مباحثہ ہوا آخر ہماری ٹیم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں اسی کو فیصلے کا حق دیا جائے۔ وہ بولنے کے قابل نہیں تھا مگر اچھی طرح سن اور سمجھ سکتا تھا اور اپنا فیصلے لکھ کر ہمیں بتا سکتا تھا۔ اس کو جب سب تفصیل بتائی تو نرس نے اسکے ہاتھ میں پنسل پکڑائی جسے وہ بمشکل تھام سکا اور پھر کانپتے ہاتھوں سے اس نے شکستہ لفظوں میں لکھا کہ آپریشن کر کے نتیجہ معلوم کیا جائے۔ اس کے بقول امید کا راستہ آپریشن کی طرف جاتا ہے۔ آپریشن نہ کرنا قطعی ناامیدی ہوگی اور وہ کسی صورت میں ناامیدی کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہتا۔

دوسرے دن میڈیکل میٹنگ میں اسکا کیس زیر بحث آیا اور اسکے فوراً بعد اسکی چھاتی کا آپریشن کیا گیا۔ کئی دن وہ مصنوعی تنفس کی مشین پر رہا مگر نتیجہ اس لحاظ سے بہت مددگار ثابت ہوا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ اسکی انفیکشن اگرچہ ایک بہت خطرناک جرثومے کی وجہ سے تھی مگر قابل علاج تھی۔ ہماری ساری ٹیم اس کے علاج میں جٹ گئی۔ وہ زیادہ تر دواؤں کے زیر اثر نیند یا بیہوشی میں رہتا تھا مگر ہم اس پر بھر پور توجہ دیتے تھے۔ وہ خانہ بدوش لڑکی اب بھی باقاعدگی سے اس سے ملنے آتی تھی اور اسکے کان میں صرف یہی کہتی تھی کہ HANG ON TO HOPE۔ کچھ ہی دن بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسکا کینسر تو دواؤں اور ریڈئیشن سے تحلیل ہو ہی گیا تھا اب تو اسکی جان کو خطرہ پھیپڑوں کی انفیکشن یعنی نمونیا سے تھا جو اب بہت بہتر ہوتا جاتا تھا۔ جلد ہی وہ خود سانس لینے کے قابل ہو گیا اور اسکی سانس کی نالی بحال کر دی گئی اور مشین ہٹا لی گئی۔ میں جب کمرے میں داخل ہوا تو وہ ناک میں لگی ایک ہلکی نلکی سے آکسیجن لے رہا تھا۔ کہنے لگا دو ماہ بعد ایک موسیقی کا اجتماع ہے مجھے اس میں شریک ہونا ہے تم اپنے علاج اور دواؤں کے ٹائم ٹیبل بناتے ہوئے اسکا ضرور خیال رکھنا۔ کچھ ہی دن بعد وہ ٹھیک ہو کر گھر چلا گیا۔ اسکو ہر ماہ چیک اپ کے لئے آنا ہوتا تھا مگر اس وقت تک میرا تبادلہ دوسرے وارڈ میں ہو چکا تھا۔ اس لئے میرا اس سے تعلق ختم ہو گیا۔

تقریباً ایک سال بعد ایک دن راؤنڈ ختم کر کے میں اپنے کمرے میں بیٹھا کسی طبی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ کسی نے کھلے دروازے پر انگلیوں سے دستک دی میں نے نظریں اٹھائیں۔ ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا اسکے چمکدار سنہرے بال اسکے کندھوں پر جھول رہے تھے اور سنہری داڑھی اور کھدر کے چوغے میں وہ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق یسوع مسیح لگ رہا تھا۔ میں چونک اٹھا اور تقریباً چیختا ہوا اسکی طرف بڑھا ''یوجین۔۔ یہ تم ہو؟؟'' ہاں ڈاکٹر میں ہی ہوں۔ میں نے کہا نہیں تھا کہ مشکل وقت نہیں رہتا مگر باہمت اور سخت جان لوگ ضرور رہ جاتے ہیں'' اس دن بھی کھڑکی کے اس پار جھیل کے اوپر سورج کی سنہری کرنوں نے آسمان پر قوس قزح تخلیق کر دی تھی مگر آج مجھے اس دھنک میں سات رنگوں کے ساتھ ایک آٹھواں رنگ بھی نظر آ رہا تھا اور وہ تھا ''امید'' کا رنگ جو سب سے خوبصورت اور سب سے اہم ہوتا ہے۔

غیبی اصول

جو چیز تقسیم کرو گے، اس چیز کی تمہارے پاس فراوانی ہو جائے گی چاہے وہ دولت ہو، عزت ہو، علم ہو، محبت ہو، درگزر ہو، کھانا ہو یا آسانیاں۔

اشفاق احمد

''عروج کس کو میسر ہوا ہے''

ابوالحسن نغمی

(نیویارک)

صاحب اگر کسی کتاب کو پڑھنے کے دوران میں قدم قدم پر آپ کو اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی کے واقعات یاد آنے لگیں تو ایسی کتاب جی جان سے کیوں نہ پسند آئے گی۔۔۔مثلاً فیروز عالم جب پیدا ہوئے تو گھر کی ایک نیک دل بی بی نے بچے کا نام ''ڈاکٹر فیروز عالم'' رکھ دیا اور کہا دیکھ لینا اللہ نے چاہا تو بچہ ڈاکٹر ہی بنے گا۔اس کے بعد تمام قانونی دستاویزوں میں بچے کا نام ڈاکٹر فیروز عالم ہی لکھا گیا۔

ان الفاظ کو پڑھ کر مجھے ایسے کئی لوگ یاد آئے جنہوں نے اپنے بچوں کے اسمِ اوّل سے قبل اُن کے عہدے بھی مقرر کر دیے لیکن وہ کچھ بھی نہ بن سکے۔فیروز عالم ''عام آدمی'' تو تھے ہی نہیں اپنی جان پر کھیل گئے اور ڈاکٹر بن کر ہی رہے۔ہائی سکول کے سرٹیفکیٹ اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تمام ڈگریوں میں جس شخص کا اسم درخشاں ڈاکٹر فیروز عالم لکھا گیا وہ آج مشہور و معروف ڈاکٹر اور افسانہ نگار ہے۔

یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کے ہر صفحے پر کچھ نہ کچھ کہنے اور لکھنے کو دل چاہتا ہے۔اگر سچ مچ ایسا کیا جائے تو میرا یہ تبصرہ ہزار صفحات کا ہوگا۔

اس کتاب میں محیر العقول واقعات کا کثرت سے ذکر ہے ایسے واقعات پڑھ کر ملتے جلتے واقعات یاد آنے لگتے ہیں۔فیروز عالم کی والدہ کے جواں سال شوہر یعنی فیروز کے والد سید ابن عباس کی مایوس کن علالت اور ڈاکٹر کا بیگم ابنِ عباس کو یہ کہنا کہ ''بہن اب یہ تیرا اور ان کا دونوں کا اللہ حافظ ہے،بس اب تو دعا کر۔۔۔'' اور پیکرِ وفا بیوی کا خدائے ذوالجلال سے رحم کی بھیک مانگتے مانگتے پریشانی اور عالم بیقراری میں جائے نماز ہی پر سجدہ کرتے ہوئے گر کر آنکھ لگ جانا اور پھر شوہر کا صحت یاب ہونا۔۔۔یہاں تک تو یہ معمول کا واقعہ ہے اور ایسے واقعات کی کمی نہیں لیکن محیر العقول واقعہ یہ ہے کہ پھر شوہر صحت یاب ہوئے تو ایسے ہوئے چھہتر سال کی عمر پائی اور کبھی خفیف سا بھی بیمار نہ ہوئے۔

فیروز عالم نے کتاب لکھنے سے پہلے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زندگی میں گزرنے والے ہر اہم واقعے کا پوری دیانت داری سے ذکر کریں گے اور مصلحت سے کام نہ لیں گے،خواہ ایسا کرنے میں اُن کی اہانت کا پہلو کیوں نہ نمایاں ہو جائے۔انہوں نے جو قول دیا تھا اُس پر قائم رہے۔اگر کسی سکول ٹیچر نے اُن کے رخسار پر زناٹے دار تھپڑ رسید کیا تو اُس کا ذکر تفصیل سے کیا۔اگر کوئی خاتون جی جان سے حسین نظر آئیں اور منہ بولی بھابی بن گئیں تو اُن کے حسن و جمال کا دل آویز پیرائے میں تذکرہ کیا اور اُن کے لیے دل میں جو عزت و احترام کے جذبات تھے وہ بھی بیان کر دیے۔

فیروز عالم نے اپنی خودنوشت میں سوانح لکھ دیا ہے کہ جب وہ اپنے ثروت مند رشتے داروں سے ملنے کے لیے جاتے تھے تو وہ لوگ ان کے لیے ڈرائنگ روم نہیں کھولا کرتے تھے انہیں لاؤنج میں بٹھایا کرتے تھے۔یہی وہ صحت مندانہ احساس کمتری تھا جس نے فیروز عالم کو ''فیروز مند'' بنایا۔لیجیے اقبال کا شعر یاد آ گیا:

ہر اک مقام سے آگے گذر گیا مہِ نو

عروج کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

فیروز عالم کی اس تصنیف میں مجھے ایک خاتون جہاں جہاں نظر آئیں مجھے واضح طور پر اندازہ ہوا کہ یہی خاتون بلاشک وشبہ اس کہانی کی ہیروئن ہیں۔نہایت حسین،ذہین،معزز اور باوقار،تمکنت مآب،موقع و محل کے مطابق نہایت معیاری شعر پڑھنے والی،اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔فیروز عالم انہی نیک بی بی کا شاہکار ہیں۔

فیروز عالم نے کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''میں تو ایک عام بے حد عام انسان ہوں۔نہ ہی میں نے کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس سے مجھے اپنے بعد میں آنے والے زمانے میں یاد رکھا جائے گا۔''

فیروز عالم کی آپ بیتی مندرجہ بالا الفاظ کی نفی کی منہ بولتی روداد ہے۔میں نے امریکہ کے ایک عام آدمی کی آپ بیتی پڑھی ہے وہ ہفتے میں دو بار کوڑا اٹھانے والا ٹرک لے کر کسی محلے میں آیا کرتا تھا اور وہ اپنی میٹھی زبان اور اپنے ہم پیشہ افراد سے یکسر مختلف محلے کی عورتوں کے دروازوں پر دستک دے کر ٹریش اُٹھاتا تھا،سب کی خیریت،خیر صلا پوچھا کرتا تھا۔وہ اتنا مقبول ہوا کہ اُس نے اپنے پیشے سے متعلق بہت بڑی کمپنی کھول لی اور اُس کمپنی کا پریذیڈنٹ اور کروڑ پتی بن گیا۔

جذبے کی شدت معمولی انسان کو غیر معمولی بنایا کرتی ہے۔لہٰذا فیروز میاں آپ یہ غیر ضروری انکسار رہنے دیجیے۔

اس کتاب میں فیروز عالم نے اپنے کم مایہ رشتے دار فضل ماموں کا ذکر کیا ہے۔آپ اسے پڑھیے اور اگر آپ کا دل نہ دھڑکنے لگے اور آپ کا دل دکھ سے نہ بھر جائے تو مجھ سے رابطہ فرمائیے۔

''ایک دن اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر آتے ہوئے انہیں ایسا ہی ایک بڑا ڈرم نظر آیا جس کا کولتار ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔انہوں نے کام کرنے والے عملے کے سپروائزر سے درخواست کی کہ یہ ڈرم انہیں دے دیا جائے اس لیے کہ بچوں کے ساتھ پانی ذخیرہ کرنے کی مشکل ہو رہی ہے۔ریلوے میں سبھی ایک دوسرے کو جانتے تھے اس بھلے مانس نے کہا فضلو یہ کونسی پوچھنے کی بات ہے ابھی لے جاؤ مگر اس کو صاف کرنا مشکل ہوگا۔فضل ماموں یہ ڈرم لے کر خوشی خوشی گھر آئے۔میں

نے سنا ہے کہ ڈرم ملنے کی وجہ سے یہ اس قدر خوش اور پر جوش تھے کہ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا اور سوچا ابھی دن ہے پہلے اس کو صاف کر لیا جائے۔ جن لوگوں نے کولتار (جسے اس زمانے کی اصطلاح میں ڈامر کہا جاتا تھا) لگے ڈرم یا کنستر دیکھے ہیں انہیں معلوم ہے کہ ان کو صاف کرنا تقریباً ناممکن چیز ہے اور اس میں بہت مشکل اور محنت لگتی ہے۔ پھر کولتار پانی سے نہیں دھلتا اس کے لیے یا تو خاص قسم کے کیمیائی محلول درکار ہیں یا پھر ان کو آگ پر پگھلا کر صاف کیا جاتا ہے۔

''ظاہر ہے ان کے پاس کیمیائی محلول تو تھا نہیں۔۔۔ سبھی لوگ اس کو آگ پر پگھلا کر صاف کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بھی گھر کے باہر تین اینٹیں رکھ کر آگ روشن کی اور ڈرم کو آگ پر رکھا تا کہ تیز آنچ پر کولتار پگھل جائے اور یہ اس کو کھرچے سے کھرچ کھرچ کر صاف کر لیں جب آگ بہت تیز ہو گئی اور کولتار پگھلنے لگا تو یہ قریب گئے اور کھرچے سے اس کو کھرچنے کی کوشش کرنے لگے اسی وقت ایک زور کا شعلہ بھڑکا اور یہ آناً فاناً شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ ایک شور مچ گیا۔''

فضل ماموں چل بسے۔ اتنی دکھ بھری داستان!! یہ فیروز عالم کے قلم کا اعجاز ہے کہ جس شدت سے انہیں دکھ ہوا اتنی ہی شدت سے پڑھنے والے کو بھی دکھ ہوا۔

فیروز عالم نے اپنی آپ بیتی میں جہاں ظالم، خود غرض، دغا باز، خبیث النفس اور شیطان صفت لوگوں کا ذکر کیا ہے وہاں انہوں نے بار بار فرشتہ صفت لوگوں کا احوال بھی نہایت دل پذیر پیرائے میں لکھا ہے۔

فیروز عالم اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جانے ہی کو تھے ہر طرح سے تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں کہ اچانک ایک ظالم اور نہایت شقی القلب انسان کی خباثت سے سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ آگے کیا ہوا، فیروز سے ہی سنئے:

''میری داستان حیات میں میں نے کئی فرشتوں کا ذکر کیا ہے بلکہ یہ سرگزشت لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ قارئین کو یہ باور کراؤں کہ دنیا میں بے لوث اور نیک لوگوں کی کمی نہیں۔

میں گزشتہ ابواب میں ڈاکٹر محسن احمد کا تذکرہ بڑی محبت اور عزت سے کیا ہے۔ یہ ہمارے یہاں پارٹ ٹائم بچوں کے اسپیشلسٹ تھے۔ چونکہ کم کم آتے تھے اس لیے اگر چہ ان سے بھی تعلقات تھے مگر ڈاکٹر ناظر جیسی قربت نہ تھی۔ وہ سیونتھ ڈے اسپتال میں شام کی کلینک کیا کرتے تھے۔ میں رو رو کر تھک گیا تھا اور وہیں میز پر سر رکھ کر سوچوں میں گم تھا کہ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر محسن احمد اپنے پورے چھ فٹ متاثر کن قد اور دائمی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھ سے کہنے لگے ''بھئی فیروز کب روانگی ہے؟'' میں نے اپنا آنسوؤں بھرا چہرا اٹھایا اور ان سے کہا خیال تھا کہ بائیس جون کو روانہ ہو جاؤں گا مگر لگتا ہے اس سال نہ جا سکوں اور پھر اگلا سال کس نے دیکھا ہے؟؟ کہنے لگے بھئی کیوں؟ تمہاری تو تیاری مکمل تھی۔ میں نے اپنی دکھی آواز میں ان کو سارا قصہ سنایا اور کہا ڈاکٹر ناظر نے آخری وقت میں ٹکٹ خریدنے سے انکار کر دیا ہے۔

تھوڑی دیر ''چک چک'' کرتے رہے پھر پوچھا کتنے کا ٹکٹ ہے میں نے بتایا۔ بس کچھ ہی لمحے سوچا، پھر کہنے لگے کل صبح دس بجے مجھ سے یہیں ملنا۔ یہاں میں یہ وضاحت کر دوں کہ انہیں خود انگلینڈ سے آئے چند ہی مہینے ہوئے تھے اور ابھی وہ اپنی پریکٹس جمانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور یہ سب کو معلوم تھا کہ انگلینڈ سے آنے والے ڈاکٹروں کے پاس بہت زیادہ سرمایہ نہیں ہوتا کیونکہ وہاں تنخواہیں بہت کم تھیں اور آتے ہوئے کار اور گھر کی دوسری اشیاء خریدنے کے بعد بہت کم رقم بچی تھی مگر ڈاکٹر احمد جو مجھ سے بہت قریب بھی نہیں تھے میرے لیے یہ نیکی کرنے کو تیار تھے۔ دوسرے دن وہ مجھ سے حسب وعدہ ملے اور مجھے لے کر وکٹوریا روڈ پر اپنی بنک گئے۔ وہاں سے انہوں نے ڈاکٹر ناظر کے کزن کے حوالے سے ساڑھے تین ہزار روپے کا جاپان ایئر لائن کے نام بنک ڈرافٹ کٹوایا، اس کے علاوہ انہیں اسٹیٹ بنک کے لیے کسی قسم کا مچلکہ بھی بھرنا پڑا اور پھر وہ ہی مجھے جاپان ایئر لائن کے دفتر چھوڑ گئے۔ میں کیسے ایسے فرشتہ خصلت انسان کے اس احسان کو بھول سکتا ہوں۔

یہ کتاب ایک نہایت شریف سیدزادے کی آپ بیتی ہے۔ ایسا نیک بچہ جسے:

مامتا کی نجیب چھاؤں میں
اک سہاگن نے اس کو پالا ہے

(شیر افضل جعفری)

بقیہ: ''صراطِ مستقیم''

مسجد کسی رومانی فلم کا خوبرو ہیرو نظر آنے کے باوجود، خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر لیے دیے رہتا ہے۔ اسے اپنی دینی اور سماجی ذمہ داریوں کا پورا احساس بھی ہے اور انہیں پوری طرح سرانجام دینے کا عزم بھی۔

''صراطِ مستقیم'' نامی اس افسانہ میں، استقامت والی راہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس دولفظی، اضافتی ترکیب میں، سیدھی/ درست روش کو راستہ سے جوڑا گیا ہے۔ سیدھا/ درست راستہ کیا ہے؟ دینی تعلیمات کا راستہ۔۔۔ گناہ سے الگ، ثواب اور نجات کا راستہ۔ فیروز عالم ثواب اور نجات کے راستہ کا نقیب ہے۔

اس افسانہ کا تصادم واضح ہے۔ انسان بہ مقابلہ انسان۔ طوائف شبّو خود سے مقابلہ کرتی ہے، معاشرہ کا ایک غلیظ پیشہ تج کر، وہ زندگی اختیار کرتی ہے، جو آئندہ پاکی سے ہم کنار ہو گی۔ اس افسانہ کا اختتام اچانک اور متذبذب ہونے کے باوجود قاری کو نتیجہ سے برمحل اور برجستہ طور پر اتفاق کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس دعوت میں کامیاب ہے۔ بے شک انسان کے لیے صلاح کا راستہ بہتر ہے، کہ اس میں فلاح ہے۔

''برنگِ دیگراں''

پروفیسر قیصر نجفی

(کراچی)

کہانی کاری ڈاکٹر فیروز عالم کی جبلت میں ہے جبکہ طباعت ان کا اکتسابی علم ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہانی کاری ان کے وجدان کی پہلی اُڑان ہے اور طباعت دوسری۔۔۔ یا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کہانی کاری ڈاکٹر صاحب کی پہلی محبت ہے اور یہ ایک نفسیاتی سچائی ہے کہ پہلی محبت انسان کے دل و دماغ سے کبھی محو نہیں ہوتی۔ ہر چند زندگی کی بھول بھلیوں میں ڈاکٹر صاحب کی پہلی محبت کہیں کھوگئی لیکن وقت کے تیز و تند ریلے میں جونہی اس کا دامن ہاتھ آیا تو انہوں نے پھر اسے خود سے بچھڑنے نہیں دیا تھا اور ایک خوبصورت مکان کا ایک خوبصورت نام ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' رکھ کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں آباد کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے شریعت افسانہ نگاری کا اصل اصول کہانی کو قرار دیا ہے اور یوں بالواسطہ طور پر اردو افسانے کے اس پورے دور پر خط تنسیخ پھیر دیا ہے۔ جس کے دوران میں علامت نگاری کے نام پر تجرید و ابہام کے مقتلوں میں سالہا سال کہانی کا خون بہایا جاتا رہا۔ کہانی پر اس ظلم ناروا کے خلاف کہانی کے پرستاروں نے صدائے احتجاج بلند کی اور دادرسی کے لیے زنجیر انصاف ہلائی اور انجام کار نقد و نظر کے جہانگیروں نے کہانی کی واپسی کا اعلان کر دیا۔

اس موقع پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ڈاکٹر فیروز عالم قصہ و داستان کے دور سے متاثر ضرور ہیں مگر تکنیکی اعتبار سے قصہ و داستان کے بعض اجزائے ترکیبی کے زیر اثر نہیں ہیں۔ امر واقعی یہ ہے کہ وہ قصوں اور داستانوں میں کہانی پن کے عنصر، واقعات کی فنکارانہ بنت اور قصہ گویوں کی سحر بیانی پر فریفتگی کا اظہار کرتے ہیں۔ یقیناً وہ بخوبی جانتے ہیں کہ قصے اور داستانیں مافوق الفطرت کرداروں، شعبدہ بازیوں، جنوں بھوتوں کی باتوں اور من گھڑت واقعات سے عبارت ہوتی ہیں۔ انسان اور زندگی سے قصے یا داستان کا کوئی سروکار محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ ان میں انسان بھی ایک فرضی اور خیالی کردار کا روپ دھار لیتا ہے۔ مظہر علی جوان کی لکھی ہوئی داستان ''بیتال پچیسی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ''اردو ادب۔۔۔ تاریخ و تنقید'' کے مصنف لکھتے ہیں:

''بیتال پچیسی کے کردار لیجیے۔ ان میں ایک انسان تو ہے جو زمین پر چلتا ہے۔ انسانوں سے ملتا ہے مگر یہ کبھی کبھی اُڑنے بھی لگتا ہے۔ غیر انسانی مخلوق سے باتیں بھی کرتا ہے۔ بقول انتظار حسین چوتھی کھونٹ نکل جاتا ہے۔ ساتواں در کھول لیتا ہے۔''

اس امر میں دو رائیں ہیں کہ کہانی کا انسان اور زندگی سے سمبندھ فطری ہے اور ہمیشہ سے ہے۔ لہٰذا کہانی کاری کے لیے انسان کی معرفت اور زندگی کا شعور از بس ضروری ہے۔۔۔ آج ہمارے پیش نظر ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ ہے، جس کے مصنف ڈاکٹر فیروز عالم ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ ایک ڈاکٹر سے زیادہ انسان اور زندگی کا شعور اور کسے ہو سکتا ہے؟ انیس ناگی نے کہا تھا کہ سعادت حسن اور منٹو ایک وجود میں دو وجود ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح ڈاکٹر فیروز عالم اور کہانی کار ایک وجود میں دو وجود ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم انسانوں (مریضوں) کی زندگی کے تلخ حقائق اپنے اندر سمو لیتا ہے اور کہانی کار ان کے روبرو ہونے کا حوصلہ دیتا ہے اور یہ بلاشبہ ڈاکٹر اور کہانی کار کے درمیان توازن اور ہم آہنگی کا ماحصل ہے کہ ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' ایسا ایک ادبی شہکار منصۂ شہود میں آ گیا ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم کی ادبی دانش میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ افسانے کے محدود کینوس پر کردار کی تمام تر زندگی کی تصویر کاری فنی مہارت اور ادبی شعور کے بغیر محال ہے۔ اسی طرح خالص بیانیے کو اسلوب کی ندرت اور انداز بیان کی دلکشی سے اثر آفرین بنانا روح ادبیت کے عرفان کی بدولت ممکن ہے اور یہ دونوں فنی مظاہرے ڈاکٹر فیروز عالم کے یہاں اپنے بھرپور رنگ میں نظر آتے ہیں۔ ان کے کم و بیش تمام افسانوں میں تخلیقیت انہی اوصاف کی بکل مارے بیٹھی ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم پر عمومی طور پر یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ ان کے یہاں موضوع میں یکسانیت ہے اور یہ کہ انہوں نے موضوعاتی تنوع پر سرے سے توجہ ہی نہیں دی۔ اس کے دو اسباب بتائے جاتے ہیں ایک یہ کہ وہ اپنے پیشہ ورانہ تجربات و مشاہدات کو بیان کرنے کے شائق ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کا فوکس مرض، مریض اور علاج پر ہی رہتا ہے اور یوں بقول ان کے ڈاکٹر صاحب نے افسانے کے محدود کینوس کو محدود تر کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں واقعہ اس کے برعکس ہے۔ اوّل تو ہم اپنے اس ادعا کو جو سطور بالا میں کیا گیا ہے پھر دہراتے ہیں کہ کسی بھی معاشرے میں ڈاکٹر سے زیادہ انسان اور زندگی کا عرفان کسی کو حاصل نہیں۔ دوم تجربات و مشاہدات کے جس قلزم سے ڈاکٹر گزرتا ہے اس کے تھپیڑوں ہی کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مرض، مریض، علاج وغیرہ ڈاکٹر فیروز عالم کی کہانیوں کے عناصر ترکیبی ہیں۔ مگر درحقیقت ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک دنیا ہے اور یہ تینوں دنیائیں مل کر ایک کائنات بناتی ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' میں ایک کائنات کا احاطہ کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس لحاظ سے یقیناً واحد اور منفرد افسانہ نگار ہیں کہ انہوں نے طب کے پیشہ اس سے متعلق مختلف شعبوں اور ان کے اسرار و رموز کی جس اخلاص و صداقت سے آگہی بخشی ہے اس کی مثال اردو افسانے میں شاید و باید ہی کہیں ملے۔ ڈاکٹر صاحب ایک جینوئن کہانی کار ہیں۔ اگرچہ پلاٹ کے تقاضوں کے مطابق کہانی میں کچھ ردّ و بدل کا انہوں نے خود اعتراف کیا ہے، لیکن فنی اعتبار سے کوئی کجی در آنے نہیں دی۔ خاص طور پر ان کے یہاں Makebelieve کا کہیں شائبہ نہیں ہوتا۔ بقول کسے ''بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے''

مگر ڈاکٹر فیروز عالم نے یہ بھی گوارا نہیں کیا۔ دراصل وہ ایک پکے مذہبی شخص (Staunch Religious Person) کی طرح ایک خالص کہانی کار ہیں اور کہانی کاری کے اصولوں کی مسلکی اصولوں کی طرح پابندی کرتے ہیں۔ وہ منظر کشی یا پیشہ ورانہ نکات پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے اس خوبصورتی سے اصل کہانی کی طرف گریز کرتے ہیں کہ قصیدے کے گریز کا لطف آ جاتا ہے۔ ہم نے ابتدا کشمکش، وحدت تاثر، عروج اور انجام کا جتنا واضح مظاہرہ ڈاکٹر فیروز عالم کے یہاں دیکھا ہے وہ خال خال افسانہ نگاروں کے ہاں نظر آتا ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک ڈاکٹر فیروز عالم زندگی سے مایوس لوگوں کی کہانیاں لکھ کر ادب میں قنوطیت کو فروغ دے رہے ہیں۔ اس اعتراض پر تبصرہ کرنے سے پیشتر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اصل فن کیا ہے۔ اصل فن یہ ہے کہ آپ جس ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ اس میں پروان چڑھتی ہوئی زندگی کی عکاسی کریں لیکن اس کے ہر پہلو کو بقول ممتاز شیریں چیخوف کی طرح معالج کی نظر سے دیکھیں۔ کیونکہ معالج ہر شے کو ایسے دیکھتا ہے، جیسی وہ ہے۔ ویسے نہیں دیکھتا جیسے وہ خود دیکھنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم اپنے کلینک اور ہسپتال سے باہر کی دنیا کو بھی ایک معالج کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جہاں کہیں بھی کوئی معاشرتی بیماری نظر آتی ہے، اس سے صرف نظر نہیں کرتے بلکہ اسے افسانوی رنگ و آہنگ میں پیش کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ معاشرتی کثافتیں بھی زندگی کا حصہ ہیں۔ اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے ممتاز شیریں اپنے مضمون ''مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر'' میں لکھتی ہیں۔

''ایک معالج کے لیے دنیا میں کوئی چیز گندی نہیں۔ ایک ادیب کو چاہیے کہ اپنے داخلی، ذاتی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر ایک معالج کی سی معروضیت برتے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ کوڑے کے ڈھیر بھی لینڈ اسکیپ میں اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں اور انسان کے برے، وحشی اور ہیجانی جذبات بھی اتنے ہی فطری ہیں جتنے اچھے اور نیک جذبات۔''

ڈاکٹر فیروز عالم ایک وسیع ذخیرۂ الفاظ کے مالک ہیں۔ اس پر مستزاد وہ لفظوں کے مزاج شناس ہیں۔ کس لفظ کو کہاں استعمال کرنا ہے، اس ہنر میں وہ طاق ہیں۔ ہم اس وصف کو ان کے اختصاص کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے اس اختصاص کی متعدد مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ مگر ہم ان کی سراپا نگاری کے ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں:

''جس نے بھی اسے دیکھا، دیکھتا ہی رہ گیا۔ قدرت بھی شاید ایسے شاہکار کبھی کبھی تخلیق کرتی ہے۔ بڑی بڑی سبزی مائل بھوری آنکھیں جن پر سیاہ پلکوں کے سائے جب لرزتے تو لگتا دیکھنے والوں کے دل بھی ان کے ساتھ ساتھ لڑکھڑانے لگے ہیں۔ لمبی مرمریں سفید اور چکنی بانہیں جو کنول کے ڈنٹھلوں کی یاد دلاتی تھیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی نوک پر سرخ ناخون، جیسے مومی شمعوں پر جلی سرخ شعلوں کی لو۔ سڈول ٹانگیں جن کا تناؤ کمخواب کے تنگ پائجامے کی گرفت سے باہر نکلا پڑتا تھا اور کمر، ایسی نازک اور چھلا جیسی کمر کہ جب رقص کرتے ہوئے لچکائی تو اس کے ساتھ تمام کائنات بھی گردش میں آ جاتی۔''

ڈاکٹر صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری ہی سے کیا۔ وہ اسکول اور کالج کے زمانے سے افسانے لکھ رہے ہیں لیکن بوجوہ بحیثیت ایک قلمکار وہ ایک طویل تعطل کا شکار رہے۔ چونکہ بحر ادب کے شناور تھے۔ لہٰذا موقع ملتے ہی بار دگر قلم اُٹھالیا اور مضمون نویسی کے میدان میں کود گئے اور طبی مسائل پر نہایت مفید و کار آمد مضامین لکھ کر خدمت انسانیت کی اپنی روایت کو قائم رکھا۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' کچھ سال پہلے منظر عام پر آیا ہے جو اس امر کا دستاویزی ثبوت ہے کہ ڈاکٹر صاحب فن افسانہ نگاری کے رمز آشنا ہیں۔ انہیں علم ہے کہ مکالمہ اور منظر نگاری نہ صرف افسانے کی فنی جمالیات میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ بیان کو وسعت دینے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ ڈاکٹر فیروز عالم نے معنی آفرین مکالمہ نگاری اور روح پرور فطرت نگاری سے اپنے افسانے کی ادبی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔ کتاب کے پہلے عنوانی افسانے ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' میں مادیت اور روحانیت ایسے دقیق اور پیچیدہ فلسفہ ہائے حیات کی جس تسہیل سے انہوں نے تفہیم کرائی ہے وہ یقیناً مکالمہ نگاری کی معراج ہے۔

''اس نے مجھ سے بڑی بے تکلفی سے ''ہائے'' کہا اور پھر اس کی صحت یابی کے امکانات کے متعلق پوچھنے لگی۔ میں پیشہ ورانہ آداب کے تحت اسے کچھ بتانے سے قاصر تھا۔ اس کے اگلے سوال نے چکرا دیا۔

''ڈاکٹر تم دعاؤں پر اعتقاد رکھتے ہو؟'' میں نے کہا ''یقیناً'' مگر دعائیں بھی میڈیکل امکانات کے تحت ہی کام کرتی ہیں۔ اگر کوئی چیز میڈیکل لحاظ سے ناممکن ہو تو دعائیں اس پر کیا اثر کریں گی۔''

اس نے تیز نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے ''یہیں تو مجھے تم جیسے ڈاکٹروں سے اختلاف ہے۔ جب میڈیکل لحاظ سے بالکل نا اُمیدی ہو جبھی تو دعائیں اثر کرتی ہیں۔''

محولہ بالا مکالمات میں جس حسن بیان سے رجائیت کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا ہے اور مصنف نے رجائیت کو ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' قرار دے کر جس روحانی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ایک اچھا افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا انشا پرداز ہونا سونے پر سہاگہ کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے خاص کر منظر نگاری میں انشا پردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔ وہ جس شدت سے کہانی کاری کا دم بھرتے ہیں اسی شدت سے حسن فطرت کے شیدا ہیں۔ حسن فطرت میں ان کے انہماک کا یہ عالم ہے کہ جب کسی منظر کی تصویر کشی کرتے ہیں تو اس کی جزئیات تک بیان کر دیتے ہیں۔ ان کا کمال فن یہ ہے کہ قدرتی مناظر کے دلفریب حسن کا اپنے بیان میں ایسا جادو جگاتے ہیں کہ قارئین کو ہسپتال کی اداس فضا میں بھی ایک نوع کی خوشگواری کا احساس ہونے لگتا ہے۔

صراطِ مستقیم

مامون ایمن
(نیویارک)

افسانہ نگار فیروز عالم نے اس افسانہ کو ایک ''روایت کی افسانوی تشکیل'' کا نام دیا ہے۔ یہ روایت مانی جا سکتی ہے، ان سوالات کے ساتھ ''اس روایت کا زمانہ کیا ہے۔۔۔؟ اس روایت کا جغرافیائی علاقہ کیا ہے۔۔۔؟ امام مسجد کا تعلق بھی اسی روایتی جغرافیائی علاقہ سے ہے یا کسی اور علاقہ سے۔۔۔؟ موصوف کے والدین کا تعلق کس علاقہ، کس نسل سے ہے۔۔۔؟ موصوف کا بچپن کہاں گزرا ہے۔۔۔؟ انہوں نے دینی تعلیم کہاں حاصل کی۔۔۔؟ وہ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ۔۔۔؟'' وغیرہ ان سوالات کے جوابات چاہے جو بھی ہوں، افسانہ نگار کا قلم امام مسجد کی علمیت اور پارسائی کا نقیب ہے۔

امام مسجد کی پارسائی اور طوائف شبّو کا ہوش ربا حُسن اس افسانہ کے انسلا کی عناصر ہیں۔ اس افسانہ کا اساسی لفظ ہے ''تبدیلی''

اس افسانہ کا خلاصہ صاف صاف ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں کہ افسانہ نگار کا فکری سفر واضح ہے۔ اس سفر میں نہ چلچلاتی دھوپ ہے اور نہ ہی تھکن۔ اس کی راہ سیدھی ہے اور اس کی منزل روشن۔ ''مضبوط کردار معمّوں کو حل کر سکتا ہے، غلط کو صحیح بنا سکتا ہے، اندھیرے کو اجالے میں ڈھال سکتا ہے، بدی کو نیکی میں بدل سکتا ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ شہر میں شبّو نام کی ایک طوائف آتی ہے۔ اس کی جوانی دیدنی ہے اور حسن دل کش۔ اسے خود پر ناز ہے اور اپنے جسم کی قیمت کا اندازہ۔ رؤسا اسے خریدنا چاہتے ہیں۔ سردار آصف نامی ایک خوبرو اس کا سودا کر لیتا ہے۔ دو چار بار کی قربت کے بعد الگ ہو جاتا ہے۔ شبّو اب ''سب'' کی ہے۔ اچانک ایک موڑ آتا ہے۔ ایک روز شبّو امام مسجد کو دیکھتی ہے تو دیکھتی رہ جاتی ہے کہ وہ شخص خود مردانہ وجاہت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ افسانہ کا ارتقاءِ عمل میں آتا ہے۔ شبّو پہلے ''مطلوب'' تھی اب وہ ایک ''طالبہ'' ہے۔ پہلے وہ دوسروں کو دیوانہ بناتی تھی، تڑپاتی تھی، آہیں بھرواتی تھی۔ اب وہ خود ایک دیوانی ہے، تڑپتی ہے اور آہیں بھرتی ہے۔ مطلوب سے طالبہ والی تبدیلی اس افسانہ کی پہلی تبدیلی ہے۔

زندگی میں اچانک دَر آنے والی مجوّزہ تبدیلی بجا لیکن وہ اپنا پیشہ جاری رکھتی ہے۔ اہلِ شہر اس کی ''حرکتوں'' سے جنم لینے والی ''غلاظت'' سے نالاں ہیں، لہٰذا وہ شبّو سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے۔ اس کے جواب میں ایک شرط ہے۔۔۔ ''امام مسجد ایک رات میرے گھر میں گزاریں'' یہ شرط عجیب ہے۔ شہر والوں کا ایک وفد امام مسجد کی خدمت میں پیش ہو کر شبّو نامی طوائف کی متعلقہ شرط بیان کر کے، تعاون کی درخواست کرتا ہے۔ امام مسجد کا جواب نفی میں ہے۔

اب یہ افسانہ ایک اور موڑ لیتا ہے۔ امام مسجد شبّو کی شرط ماننے کی حامی بھرتے ہیں، اس کے گھر جاتے ہیں اور خود سپردگی کے لیے بے قرار شبّو کے سامنے پیار کے ساتھ اپنی ایک شرط رکھتے ہیں۔ ''وہ ان کے ساتھ نماز پڑھ لے'' نماز کے ارکان نہ جاننے والی شبّو امام مسجد کی اتباع میں نماز پڑھتی ہے۔ امام مسجد کی قرأت اور دعا سُن کر شبّو میں ایک تبدیلی آتی ہے۔ وہ امام مسجد کے قدموں میں گرتی ہے، پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔ افسانہ اعلان کرتا ہے۔ ''ان آنسوؤں میں شاید اس کی پچھلی زندگی اور سارے گناہ بہہ گئے تھے۔'' امام صاحب نے وہی کیا جس کے لیے وہ شبّو کے گھر گئے تھے۔ ''انہوں نے اسے اٹھا لیا اور سینے سے لگا لیا'' یوں یہ افسانہ ایک منفی رویہ کو ایک مثبت رویہ میں ڈھال کر اپنے اختتام کو پہنچا۔ یاد رہے کہ مجوزہ اعلان کے جملہ میں شامل ایک لفظ ''شاید'' متن کو ایک اور حقیقت کی نشاندہی کراتا ہے۔ ''انسان کی معافی، انسان کی نجات اور انسان کی بخشش کا مجاز صرف خالقِ کائنات ہے۔ بلاشبہ وہ جابر بھی ہے، وہ قاہر بھی ہے اور ڈرانے والا بھی ہے۔ دوسری جانب، اس کے دائرہ کار میں یہ صفت بھی شامل ہے کہ وہ توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرتا ہے، ان کی خطائیں معاف کرتا ہے، ان کے گناہ بخش دیتا ہے کہ وہ رحیم بھی ہے اور غفور بھی ہے''۔ لفظ ''شاید'' میں ''یقین'' نہیں امید ہے کہ انسان، کسی انسان کو بھی غیب کا علم نہیں۔ اس امید میں ''دعائیہ آرزو'' ہے۔ یہ بات انسان کی سرشت میں شامل ہے کہ وہ ہمیشہ نہیں، نہ سہی، کسی خاص منزل پر پہنچ کر عمر کے کسی خاص مقام پر پہنچ کر، نجات/بخشش/معافی کی دعا صدقِ دل سے ضرور مانگتا ہے کہ اسے اپنے کیے پر ندامت ہے، پچھتاوا ہے، افسوس ہے۔ کیوں؟ اُسے اپنے بُرے افعال کا اعتراف ہے۔ یہ افسانہ انسان کی سرشت بیان کرتا ہے اور ایک مثال سے اس سرشت کی صراحت کرتا ہے۔

اس افسانہ میں چند کردار ہیں۔۔۔ نائکہ، شہر کا رند، سردار آصف۔ پورا افسانہ دو بنیادی کرداروں ''طوائف شبّو اور امام مسجد'' کے گرد گھومتا ہے۔ نائکہ کا کردار روایتی ہے۔ ابتدا میں شبّو کا کردار شہوانی بھی ہے اور منفی ہے۔ ذہنی تبدیلی کے بعد یہ کردار مثبت ہو جاتا ہے۔ اس مثبت کردار سے ایک نئی زندگی، ایک نئی نیک زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ امام مسجد کا کردار وہ صفات رکھتا ہے جس کی امید جس کی توقع زمانہ کو، معاشرہ کو ہے۔ پاک صاف، نیک، پارسا، عالمِ باعمل، فلاح و صلاح کا پابند اور داعی۔ امام مسجد کے کردار میں یہ بات واضح ہے کہ وہ واقعات و حالات، اپنے مردانہ حسن، جوانی، مقام اور رسوخ کو ایک نئے راستہ پر گامزن کراتے ہوئے جسم کو روح پر غالب آنے کی اجازت دے سکتا تھا کہ سیدھی راہ سے بھٹک جانا بھی انسان کی سرشت میں شامل ہے جبکہ بھٹکنے کی دعوت میں بھی ایک حسین جواز موجود تھا۔ وہ سیدھی راہ پر رہا۔

اس افسانہ میں پاک و ہند کا ماحول ہے، اپنی پوری سماجی روایات کے ساتھ۔ اس معاشرہ میں عام طور پر امام مسجد ایک غریب آدمی ہوتا ہے، محلّہ والوں کی روٹیوں پر پلتا ہے۔ بے رسوخ، بے آواز، مجبور۔ اس افسانہ میں امام

باقی صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ کیجیے

”خزاں کا گیت“

غالب عرفان
(کراچی)

”آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں“ یہ مصرع میں نے اپنے بچپن میں اکثر اباجی مرحوم سے دورانِ گفتگوسن رکھا تھا۔ پھر جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اس کا مطلب بھی سمجھ میں آ تا گیا لیکن ”خزاں کا گیت“ کا مطالعہ مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر گیا کہ ”خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا“ بھی ضابطہ تحریر میں لایا جا سکتا ہے۔ فیروز عالم جو پیشے کے لحاظ سے ایک کامیاب ڈاکٹر کی حیثیت سے امریکہ میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں، ادب کی دنیا میں بھی ایک جانا پہچانا نام ہیں۔ انہی کی کاوش ”خزاں کے گیت“ ایک افسانوی مجموعے کے طور پر منصۂ شہود پر ابھی حال ہی میں آ چکا ہے۔ میں انہیں ایک عرصے سے پڑھتا چلا آیا ہوں۔ بالخصوص ”چہارسو“ راولپنڈی میں تو ان کی خودنوشت (سوانحی سرگزشت) قسط وار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ پھر شاید سال سوا سال قبل جب وہ نامور افسانہ نگار شمشاد احمد کی تقریب پذیرائی میں شرکت کرنے کراچی کے ایک ہوٹل میں وارد ہوئے تو اپنی یادگار ملاقات کا خوشگوار تاثر میرے لیے چھوڑ گئے بہر حال یہ سب تو برسبیل تذکرہ تھا۔

یوں تو کتاب میں چھوٹے بڑے 18 افسانے موجود ہیں لیکن سب سے طویل افسانہ ”منتظر جس کا تھا میں“ جو پندرہ صفحات پر محیط ہے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کو یہ طوالت پسند نہ آئے لیکن یہ اگر طوالت افسانہ نگار کی مجبوری بن کر صفحہ قرطاس پر بکھری ہے تو بین السطور میں موجود لفظیات کی بصیرت اپنی مثال آپ ہے۔ کچھ عرصہ قبل یہ افسانہ جب ”الحمرا“ لاہور میں شائع ہوا تھا تو اس کے مطالعے کے بعد میں نے لکھا تھا ”افسانہ جہاں ختم ہوتا ہے اس سے ایک عبارت قبل ”زندگی میں اس نے بہت سے فیصلے غلط کئے تھے مگر شاید اس کے نصیب میں یہی لکھا تھا۔۔۔ پھر مسکرا کر کہنے لگی ”شکیل تم کتنے پاگل تھے“ میرے دل میں آیا پوچھوں ”کس کے لیے“ مگر اب اس کا موقع نہیں تھا، یہی اس افسانے کا نقطۂ عروج ہے اور یہی پورے افسانے کا نچوڑ!

تکبر انسان کو وہاں پہنچا دیتا ہے جہاں سے واپسی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ پھر قدرت اُسے کیا سزا دیتی ہے یہ سب ”سنگریزوں کی بارش“ جیسے سات صفحات پر مشتمل افسانے میں موجود ہے جسے بیان کرنے سے بہتر میں فارسی کا ایک مصرع یہاں درج کرنے پر اکتفا کروں گا۔

”تکبر عزازیل را خوار کرد“

فیروز عالم نے کہیں کہیں اپنی پرانی یادیں بھی تازہ کی ہیں۔ ایسی ہی یاد سے وابستہ ایک افسانہ ”بکھرے سپنے“ بھی ہے جو انہوں نے اپنے دوست ”چندو ہانول نوتانی“ کی فرمائش پر قلمبند کیا ہے۔ یہ افسانہ مصنف کے ماضی پر محیط ایک حقیقت کے روپ میں صفحہ قرطاس پر بکھرا ہے جسے ماضی کے آئینے میں ہی دیکھنا اور پرکھنا چاہیے۔ زیب داستاں کے لیے میں افسانے کے اختتامیہ چند فقرے ضرور پیش کروں گا۔ ”اس کا چہرہ اُس طرف مڑا تھا جہاں باپو (مہاتما گاندھی) کی سمادھی ہے اور اس کی بے جان آنکھیں اس سمادھی کی طرف دیکھ رہی تھیں جیسے پوچھ رہی ہیں۔ باپو! کیا تم نے ہمیں اسی لیے آزادی دی تھی، کیا اس دیش میں کبھی کسی کو انصاف نہیں ملے گا۔“ میرے والد مرحوم میری پیدائش سے قبل ہی جانے کب سے علامہ اقبال کے عاشق تھے، میرے شعور نے جب آنکھ کھولی تو ان کی لائبریری میں ان کے ایک دوست مرحوم عبدلرب کا تحفہ علامہ اقبال کے چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی صورت میں مجلد موجود تھا۔ اس ذخیرہ علم و ادب میں علامہ اقبال کا مجموعہ کلام ”بالِ جبریل“ بھی موجود تھا جس کے پہلے صفحے پر راجہ بھرتری ہری کے شعر کا یہ ترجمہ منظوم صورت میں یوں موجود تھا:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

فیروز عالم نے اس شعر کی تفہیم اس افسانے میں کر ڈالی ہے اس لیے افسانے کا نام بھی ”پھول کی پتی سے“ رکھا ہے۔ اس مختصر ترین افسانے میں صرف چار صفحات میں مصنف نے یہ دکھایا ہے کہ انسان کا مطمع نظر بدلتے دیر نہیں لگتی بس تائید ایزدی کی دیر ہے۔ جب خدا توفیق دیتا ہے تو ضمیر کی آواز پر بُرے سے بُرا آدمی بھی نیکی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ پل بھر میں ذہنی انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور اندر کی دستک سنائی دیتی ہے۔ پھر وہ بقول فیروز عالم ”اپنی پرانی دھکے لگی کار چلا کر دل کا سکون محسوس کرتا ہے“ ذہن و ضمیر کی جنگ میں آخر کار ضمیر کی جیت ہی ہوتی ہے۔ ذہن و ضمیر کی اس کشمکش کو ”پھول کی پتی“ میں خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ”کنول گھٹا“ جو اس کتاب کا تیسرا افسانہ ہے اس کا ذکر سب سے آخر میں اس لیے کر رہا ہوں کہ اس کے ساتھ مصنف کا ایک نوٹ بھی موجود ہے کہ انہوں نے یہ افسانہ ۱۹۶۳ء میں اوائل عمری میں اس وقت لکھا تھا جب وہ عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم سے بے حد متاثر تھے۔ کہانی جیسی بھی ہے اس پر کچھ لکھنے سے بہتر ہے کہ ان کے پینتالیس سال قبل کے اسلوب سے آج کے طرز تحریر کا موازنہ کیا جائے۔ کسی سے متاثر ہو کر اس کا اسلوب اختیار کرنا پھر بتدریج اپنا رنگ اختیار کر لینا بھی ایک فطری عمل ہے جس کی بہر حال حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ میں نے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ ایک پیشہ ور طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ فیروز عالم ایک دلگداز فطرت کے مالک بھی ہیں اور ان کی حساس طبیعت انہیں اپنی دلی کیفیات کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کے لیے اُکساتی رہتی ہے جس کے نتیجے میں نئی نئی کہانیاں جنم لیتی ہیں اور پڑھنے والوں کی دلچسپی کا باعث بنتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل میں وہ اپنے تجربات و مشاہدات کے بل بوتے پر افسانوں کی نئی کتاب اپنے قاری کے لیے ضرور پیش کریں گے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

''جھوٹی کہانیوں کے سچے کردار''

آغا گل
(کوئٹہ)

رومی تو یزداں پہ کمند پھینکنے کا حوصلہ رکھتا ہے جبکہ میں اپنے پسندیدہ فکشن نگاروں کو تلاش کر لیتا ہوں۔ ذکاہ الرب رباب، قرۃ العین حیدر، تابش خانزادہ، ڈاکٹر فیروز عالم جو سات سمندر پار امریکہ میں رہتے ہیں۔ فیروز عالم نے بھی میری ہی طرح بچپن سے ہی لکھنا شروع کیا۔ مائیکل اینجلو نے جو کہا تھا کہ وہ صرف چٹان سے ڈیوڈ نکال لایا ہے ورنہ مجسمہ تو پہلے ہی سے اس پتھر کے اندر چھپا ہوا تھا۔ فیروز عالم معاشرے سے کہانیاں نکالتا ہے۔ اس کی جھوٹی کہانیوں کے سبھی کردار سچے ہوا کرتے ہیں۔ تاریخ اور فکشن میں بھی بس یہی فرق ہوا کرتا ہے۔ تاریخ میں نام سچے ہوا کرتے ہیں باقی سبھی کچھ جھوٹ جبکہ فکشن میں سبھی کچھ سچ ہوا کرتا ہے۔ کرداروں کے نام بدل دیئے جاتے ہیں۔ میر پور خاص کی کومل فضاء میں فیروز عالم نے ہوش سنبھالا۔ ان کا فنکار اظہار چاہتا تھا۔

بچپن سے ہی کہانیاں لکھنے لگا۔ ان دنوں نونہال، پھلواری، تعلیم و تربیت جیسے بچوں کے رسالے نکلتے تھے جن میں لکھ کر بہت خوشی ہوتی خصوصاً اپنا نام چھپا دیکھ کر۔ فیروز عالم نے لکھنے کی ابتداء امروز اخبار سے کی۔ اس کے علاوہ اخبار انجام میں بھی لکھتا رہا۔ ان اخبارات میں بچوں کا صفحہ نکلتا تھا۔ یوں لکھنے سے Creative Urge بھی پوری ہوتی رہی اور تحریر میں پختگی بھی آتی چلی گئی۔ اس نے طنزیہ کی بجائے رومانی افسانے لکھے۔ سنجیدگی سے لکھا قلم سے وابستہ وقار پہ کبھی آنچ نہ آنے دی۔ سرکار، دربار یا Popolar Will اور مارکیٹ ڈیمانڈ پر کبھی نہ لکھا۔ حالانکہ ان دنوں پیسہ لے کر لکھنے کا رواج عام تھا۔ فیروز عالم کے بزرگوں کا تعلق مراد آباد سے ہے یوں تو مردم خیز خطہ ہے مگر ہم جیسوں کے لیے جگر مراد آبادی کا نام زیادہ اہم ہے۔ اردو تو بقول شخصے ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ مجھ جیسے ادیبوں کی طرح اردو زبان سیکھنے کے دشوار جاں گسل مراحل سے بھی محفوظ ہی رہے۔ رامپور، بجنور ہر جانب شعر و ادب کی فضا تھی جبکہ ہمارے ہاں بلوچستان میں پہلا مشاعرہ ہی ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ ایک علمی گھرانے سے تعلق کے باعث ذوق بھی نکھرا ہوا تھا۔ اردو کو مجھ جیسے ادیب ایک نامکمل زبان قرار دیتے ہیں جبکہ فیروز عالم کے نزدیک اظہار کے لیے اردو ایک مکمل زبان ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں پچاس برس قبل بھی انجینئرنگ کی تعلیم تک اردو میں دی جاتی تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ طبعی موضوعات پہ فیروز عالم نے اردو زبان میں متعدد مضامین لکھے۔ طبّی اصطلاحات کے لیے بھی اردو زبان ہی استعمال کی۔ فیروز عالم نے خود کو افسانوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ان موضوعات پہ لکھا جو طبّی نوعیت کے تھے۔ میر پور خاص سے ہی ڈاکٹر بنے۔ ادبی تربیت اے حمید، واجدہ تبسم جیسی کہانی کاروں نے کی۔ ڈاکٹر بن کے امریکہ کی راہ لی اور امریکہ ہی کے ہو رہے۔ سمرسٹ ماہم، چیخوف اور موپساں پسندیدہ کہانی کار ہے۔ میں بھی کچھ برسوں سے موپساں کے سحر میں مبتلا ہوں اور ویسے ہی لکھنے کی کوششیں کرتا ہوں۔ فیروز عالم کے افسانوی مجموعے ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' اور ''خزاں کے گیت'' مجھے گرویدہ بنانے کے لیے کافی تھے۔ جس کے باعث میں نے اس کہانی کار کو تلاش کیا۔ فیروز عالم کا اپنا ایک انداز ہے۔ Romanticism اور آئیڈیلسٹ ہے۔ اس کی اساس محبت اور شرافت، شائستگی ہے، زبان کا رچاؤ، نوک پلک سے درست اور سارے ہی افسانے بیانیہ ہیں۔ ہیروئن کو بھی مکمل لباس اوڑھائے رکھتا ہے جیسے عمرہ کر کے لوٹی ہو۔ دراصل کچھ ادیب قائل ہیں کہ انسان اچھا ہے اسے خدا نے اپنی شکل پہ بنایا۔ جب کہ ہم جیسے فقیر فقراء کہتے ہیں کہ انسان کے من میں پاپ ہے۔ امریکہ میں رہ کر یوں تو بظاہر Aeterogeriety of Global Culture کے مظاہرے دیکھے لیکن اس کے افسانوں میں Ideological Misgivings کا پرتو نہ دیکھ پایا۔ اس کے افسانوں کی طاقت بتلاتی ہے کہ کہانی اگر حقیقت نہیں بھی تو حقیقت کے قریب تر ہے۔ جس میں ذاتی مشاہدات کا دخل ہے۔ افسانہ نگار کا مشاہدہ بہت ہی عمیق ہوا کرتا ہے۔ کرداروں کے میں اتر جاتا ہے، کرداروں کے اندر سچائی موجود رہتی ہے۔ افسانے کے فنی لوازمات پورے کرتا ہوا خود کہانی میں مداخلت نہیں کرتا۔ بلکہ موپساں کی مانند آخر میں پردہ ہٹا دیتا ہے تاکہ قاری اب جادوئی جھروکے سے خود ہی دیکھ لے۔ نہ تو وہ Radical ہے اور نہ ہی بائیں بازو سے تعلق جوڑتا ہے۔ Preaching یا کوئی ازم اس کے ہاں نہیں ملتا۔ نہ ہی ہیئت (Format) کے نت نئے تجربات کے لیے اس کا قبیلہ ان داستان گو شخصیات سے جا ملتا ہے جو انسانی سائیکی کو بخوبی جانتے تھے اور انسان ذہن پہ قابو پانے کا ملکہ رکھتے تھے۔ ریاستی جبر کے باعث ہمارے ہاں جو کہانی کا فقدان رہا افسانہ نگار افسانے کو علامتوں کی بیساکھیوں پہ چلانے لگے۔ فیروز عالم جیسے افسانہ نگار کہانی ساتھ لیے چلتے ہیں۔ قصّہ خوانی بازار کا عکس اُس کے افسانوں میں ملتا ہے۔ سچائی اور اعلیٰ قدروں پہ ایمان کے باوصف اس کے ہاں Reformational انداز نہیں ملتا۔ جس کے باعث افسانہ نگاروں میں الگ پہچان رکھتا ہے۔

سترہ برس بعد امریکہ سے لوٹا تو ضیائی مارشل لاء کی بازگشت تھی۔ ادبی کتابوں، جرائد کا قلع قمع ہو چکا تھا۔ ہر جانب ایمان افروز حمد اور نعت کی گونج تھی۔ امریکہ ڈالر اور سعودی ریال رنگ جما چکے تھے۔

فیروز عالم نے اختر شیرانی کی سلمیٰ، ریحانہ مصطفیٰ زیدی کی شہناز یا میراجی والی جنونی محبت نہ کی۔ پہلی محبت تو میڈیکل کالج میں چند برس پھلی پھولی، دوسری امریکہ میں جینی سے ہوئی ''مگر تم ہو ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو'' والا ادیب نہ تھا۔ روائیت اس کے فکشن کا حصہ ہے۔ لہٰذا ارمانوں کی چتا جلا کر خود ہی تاپتا رہا۔ روایت نہ توڑ پایا۔ ہمارے نقادوں نے نہایت ہی بے رحمی سے فیروز عالم

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ کیجیے

''اردوادب کاشیدائی''

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

ڈاکٹر فیروز عالم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ افسانہ نگار ہیں۔ وہ اردوادب سے والہانہ محبت رکھنے والے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جو تقسیم ہند کے بعد مراد آباد(یو پی) سے ہجرت کر کے میر پور خاص(سندھ) منتقل ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میر پور خاص اور لیاقت میڈیکل کالج کراچی سے مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خاطر امریکہ چلے گئے جہاں مزید تعلیم وتربیت مکمل کرنے کے بعد بطور ماہر امراضِ گردہ وغیرہ (Urologist) لگ بھگ چالیس سال خدمات سرانجام دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اردوادب کے حوالے سے لاس اینجلز کے ادبی حلقوں میں بھی ایک مقبول شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے رہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم کو اردوادب سے بے انتہا لگاؤ اپنی باذوق تعلیم یافتہ والدہ سے ورثہ میں ملا۔ جنہوں نے بچپن سے ہی انہیں شعروادب سے اتنا منسلک کئے رکھا کہ اردوادب سے محبت ان کی رگوں میں رچ بس گئی۔ انہوں نے اپنا پہلا افسانہ گیارہ سال کی عمر میں لکھا جو بچوں کے صفحہ پر روزنامہ ''امروز'' میں شائع ہوا۔ کالج کی تعلیم کے دوران وہ کالج کے اردو رسالہ کے نائب مدیر اور بعد میں لیاقت میڈیکل کالج کے رسالہ کے مدیر اعلیٰ کے طور پر ادبی سرگرمیوں کا محور بنے رہے۔ اردوادب سے ان کے گہرے لگاؤ کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرحلہ پر انہوں نے میڈیکل تعلیم ترک کر کے اردوادب میں پی ایچ ڈی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن والدہ کے سمجھانے اور اصرار پر انہوں نے میڈیکل تعلیم جاری رکھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر فیروز عالم گوکہ ایک میڈیکل ڈاکٹر ہیں لیکن مزاج کے طور پر وہ ادب کے شیدائی اور ایک بہترین افسانہ نگار ہیں۔

قارئین کے لیے یہ امر باعثِ دلچسپی ہوگا کہ ان کے والدین نے پیدائش کے بعد ان کا نام ڈاکٹر فیروز عالم رکھا اور یہی نام داخلہ کے موقع پر سکول میں درج کرایا چنانچہ وہ شروع سے ہی ڈاکٹر فیروز عالم کہلائے جانے لگے اور یہ بات کم ہی دیکھنے یا سننے میں آتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''خزاں کا گیت'' ڈاکٹر فیروز عالم کے تحریر کردہ انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز اٹھارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان افسانوں میں زیبِ داستاں کے لیے غیر ضروری مکالمے یا ڈرامائی رنگ بالکل شامل نہیں بلکہ ہر افسانہ اپنے موضوع سے قریب تر سچی کہانی کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس سے پہلے وہ اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' کے نام سے پیش کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ''ہوا کے دوش پر'' اپنی ذاتی زندگی کے پہلے دور کا تفصیلی اور دلچسپ بیانیہ اور مشہور غیر ملکی افسانوں کے اردو تراجم ''اُفق کے اُس پار'' کے نام سے کتابی صورت میں قارئین کی نذر کر چکے ہیں جو بہت مقبول ہوئے۔ اسی طرح عوام کی خدمت کے جذبہ کے تحت آگاہی کے لیے آسان اور شفاف اردو میں مختلف امراض کے بارے میں بنیادی اور ضروری طبی معلومات پر مشتمل مضامین روزنامہ ''جنگ''، ''چہارسُو'' اور دیگر جرائد میں سلسلہ وار شائع ہوتے رہے ہیں۔

دنیا بھر میں اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے اور اردوادب سے محبت کرنے والے پاک و ہند کے علاوہ دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہیں۔ اردوادب کی تخلیق وترویج ان گنت ادیبوں، شعراء، ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کی قابلِ قدر کاوشوں کی مرہونِ منت ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کا شمار بلاشبہ انہی معروف شخصیات میں ہوتا ہے۔

حساس طبیعت اور دردِ دل رکھنے والے ڈاکٹر فیروز عالم کی زندگی محنت، لگن، خدمتِ خلق اور گہرے مشاہدے اور تجربات کی داستان ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اپنے پیشہ ورانہ تجربات اور مشاہدات پر مبنی انہوں نے جو کہانیاں تحریر کی ہیں انہیں پڑھتے ہوئے قاری ان میں یوں کھو جاتا ہے کہ وہ اسے ختم کیے بغیر نہیں چھوڑ سکتا اور کہانی کے اثرات دیر تک اس کے ذہن پر حاوی رہتے ہیں۔

''خزاں کا گیت'' میں شامل ان کا افسانہ ''ناموس کی قیمت'' ایک ایسے فرد کی داستان ہے جو اپنے علاقائی رسم ورواج اور اقدار کو اپنے اندر بسائے غمِ روزگار میں امریکہ جا کر آباد ہو گیا۔ شادی کے بعد اُن کے ہاں ایک پیاری بیٹی نے جنم لیا جسے وہ دل وجان سے چاہتا اور پیار کرتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب اس نے عہدِ شباب میں قدم رکھا تو مغربی تہذیب کے اثرات اُس کے اطوار و عادات سے عیاں ہونے لگے جبکہ یہ تبدیلی احمد شاہ کے لیے کسی طور قابلِ قبول نہیں تھی جس کے نتیجہ میں مشرقی اور مغربی اقدار کے تصادم سے ایک ایسا دردناک انجام ظہور پذیر ہوا جسے پڑھ کر نہ صرف رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں بلکہ آنکھیں بھی پُرنم ہو جاتی ہیں۔

افسانہ ''باوقار تدفین'' ایک باہمت نوجوان کی داستان ہے جسے بچپن سے ہی فائر مین بننے کا بے حد شوق تھا۔ والدین نے اس کی خواہش پوری کرنے کے لیے بھرپور تعاون کیا اور یوں اس نے اپنا نصب العین حاصل کر لیا۔ فائر مین بننے کے کچھ ہی عرصہ بعد 9/11 کا اندوہناک واقعہ پیش آیا جس میں ہزاروں لوگ آناً فاناً لقمہ اجل بن گئے۔ آگ کے شعلوں اور ملبے تلے دبے بدنصیب افراد کی جانیں بچانے کے لیے جو ریسکیو ٹیمیں اور فائر بریگیڈ کا عملہ پوری جانفشانی سے برسرِکار تھا انہی میں یہ باہمت اور پُرجوش نوجوان باب (Bob) بھی شامل تھا جس نے انتہائی بہادری اور جرأت سے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دی۔ اس دردناک سانحہ میں لاتعداد لوگ راکھ کے ڈھیر میں یوں تبدیل

ہوئے کہ اُن کے والدین اور دیگر چاہنے والے ان کا نام ونشان تک نہ پا سکے۔ انہی بدنصیب افراد میں باپ کے والدین آہ وبکا کرتے ہوئے دعائیں کررہے تھے کہ کاش انہیں اپنے بیٹے کے جسم کا کوئی ذرہ برابر حصہ ہی مل جائے جسے وہ دفن کر کے کچھ سکون حاصل کرسکیں۔ ان کی یہ خواہش کیسے پوری ہوئی مصنف نے ''باوقار تدفین'' میں نذرِ قارئین کیا ہے۔

''گئے دنوں کی کہانی'' بنتی بگڑتی قسمت کی ایک انوکھی داستان ہے جو ایک انتہائی خوبرو نوجوان اور تعلیم یافتہ لڑکی کی کہانی ہے جب وہ اپنی جوانی کے عروج پر تھی اور ہر کوئی اس کی خوبیوں، حسن وجمال اور دلکش آواز پر رشک کرتا تھا۔ اس کی زندگی میں اچانک ایک ایسا سانحہ رونما ہوا جس نے اُسے ایک مشکل امتحان میں ڈال دیا کیونکہ اس کی خوبیاں ایک حادثہ کے نتیجے میں جزوی طور پر معذوری میں تبدیل ہوگئیں۔ حالات نے کروٹ بدلی اور ایک بار پھر وہ روشن مستقبل کے خواب دیکھنے لگی لیکن کاتبِ تقدیر نے اس کی قسمت میں ایک اور بڑی آزمائش لکھی ہوئی تھی جب منزل کے بالکل قریب پہنچ کر وہ ایک شدید جذباتی دھچکہ سے دوچار ہوئی جس پر قابو پانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ہر بار معصوم اور بے قصور تھی۔ ''گئے دنوں کی کہانی'' ایک جذباتی داستان ہے جو قاری کو اپنی پوری گرفت میں لے لیتی ہے۔

گذشتہ صدی کی ساٹھ ستر کی دہائیاں عالمی، معاشی اور سیاسی تناظر میں خاص اہمیت اور دلچسپی کا باعث تھیں۔ اس عرصہ میں مشرق وسطیٰ کے ممالک تیل کی دولت سے مالا مال ہونے کے باعث تعمیری سرگرمیوں میں مصروف تھے لیکن وہ افرادی قوت کی قلت کا شکار تھے۔ تیسری دنیا کے لوگ روزگار کی تلاش میں بیرونِ ملک جا رہے تھے۔ انہی لوگوں میں احمد نامی ایک نوجوان بھی شامل تھا جس نے اپنے حال کو مستقبل پر قربان کردیا اور کام کے لیے معقول معاوضہ حاصل کرنے کے لیے سعودی عرب چلا گیا۔ ''آج رات جھوم لے'' اسی نوجوان کی داستان ہے۔ وہ سال میں دوبار اپنی بیوی اور والدین سے ملنے وطن جاتا اور ہر سال دومرتبہ اپنی بیوی کو دوہفتوں کے لیے اپنے پاس سعودی عرب بلا لیتا۔ گو کہ وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ایک پیار کرنے والی رفیقۂ حیات عطا کی تھی۔ احمد دن رات محنت کر کے اتنی رقم جمع کرنا چاہتا تھا جس سے وہ اپنا ایک آرام دہ گھر بنا کر باقی عمر آرام سے گزار سکے۔ اس تگ ودو میں عمرِ عزیز کا ایک قیمتی حصہ سعودی عرب میں ہی گزار دیا۔ اس جدوجہد میں احمد نے کیا کھویا اور کیا پایا اور اپنے مقصد کے حصول میں وہ کس حد تک کامیاب رہا یہ جاننے کے لیے ''آج رات جھوم لے'' پڑھنے کے بعد ہی قاری فیصلہ کرسکتا ہے۔

''خزاں کا گیت'' میں شامل تمام افسانے موضوع کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ بے حد دلچسپ اور سنسنی خیز ہیں جنہیں پڑھ کر ڈاکٹر فیروز عالم کی تخلیقی اور قلمی صلاحیتوں کا بجا طور پر اعتراف لازم ہے۔

- بقیہ -

''چھوٹی کہانیوں کے سچے کردار''

کونظرانداز کیا۔ اپنا ایک انداز ہے اس کا۔ ٹریٹمنٹ آف اسٹوری ہے۔ دراصل من کی سچائی کے باعث وہ کسی لابی کا حصہ نہیں بن سکتا ورنہ تو پھینکے گئے چند امریکی ڈالر ہزاروں روپے بن جاتے ہیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے انسان روبوٹوں کی جانب مکینیکل ہوتے چلے گئے۔ یہاں پکڑ دھکڑ کوڑے مار حکومت سے گھبرا کر خروج کیا۔ دوبارہ امریکہ کی راہ لی۔ آپ بیتی ''ہوا کے دوش پر'' گویا کلام خود بہ زبان خود والی کیفیت ہے۔ کسی بھی فنکار کو اس کی آپ بیتی کے حوالے سے بہتر سمجھا جاسکتا ہے۔ انسانی امراض کے بارے میں بھی کتاب تیار ہے۔ بچپن امراض کے بارے میں انتہائی سلیس وشستہ اردو میں خالصتاً اردو میں ٹیکنیکل مضامین لکھے ہیں، علمی موشگافیاں کی ہیں۔ آغا خان میڈیکل کالج کا پروفیسر ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہے۔ انسانوں کے من کے عوارض بھی جانتا ہے، جسمانی بھی۔ من کے لیے الفاظ ہیں، برتاؤ ہے۔

یوں تو وہ انسانی ضروریات کا مہیا کرنا لازمی قرار دیتا ہے مگر افسانے میں **Leffist** نہیں کہا جاسکتا۔ وطن عزیز نے اس کی کوئی قدر نہ کی۔ یہاں چند ہی لوگوں کو نوازا جاتا ہے۔ ادبی اداروں میں چند ہی لوگ سربراہ لگائے جاتے ہیں۔ ادبیات کا سربراہ مقتدرہ کا سربراہ ہوگا کبھی دوسری ایم ون کی پوسٹ پہ جھول جائے گا۔ اس گرائیں کلچر اور ملگری توپ نے ہمارے ملک کو بہت نقصان دیا ہے۔ وزیراعظم قلات ظریف خان پرائمری پاس تھا، سیکرٹری تعلیم مڈل پاس، وزیر تعلیم اَن پڑھ (کیونکہ پیا کی من بھائی تھی) وفاقی وزیر تعلیم شیخ وقاص کی ڈگری ہی جعلی ثابت ہوئی۔ ایسی حکومت میں فیروز عالم جیسے عالم وفاضل انسان کی کیا قدر رہو؟ جہاں زکوۃ کی مانند شرح تعلیم اڑھائی فیصد ہو جن کا ہیرو مولا جٹ ہو۔

لیکن وقت ایک سا نہیں رہتا۔ رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی ہی پیغام دیتی ہے کہ رات گزرنے والی ہے۔ خود فیروز عالم کے فکشن میں **Imagination emotions** اور اس کا **Autobiographical** انداز حوصلہ دلاتا ہے۔ فیروز عالم من موہنے افسانے لکھتا ہے، کہانی **4200** سال سے زندہ ہے جبکہ پپائیرس پہ مصر میں اولین تحریری کہانی ''غرقاب سفینہ'' لکھی گئی۔ فیروز عالم کے فکشن میں کہانی زندہ رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں اس کی کہانی کی راہ دیکھتا ہوں۔

''فن کی مورتا''

نازیہ پروین

(فیصل آباد)

زمین اپنی محوری گردش میں ازل سے مصروف تھی، ہے اور رہے گی۔ زمانے سالوں اور صدیوں کی تہہ میں گرتے جارہے ہیں جیسے ریت بند مٹھی سے پھسل جاتی ہے لاکھ سنبھالنے کی کوشش کریں۔ ایسے ہی وقت رکتا نہیں بلکہ قطرہ قطرہ گرتے گرتے ماضی کی زنبیل میں بند ہوتا جاتا ہے اور یہ رقص سفر جاری وساری رہے گا۔

ہجرت بھی ایسی ہی داستان۔سفر کا دوسرا نام ہے کہ دُور بہت دُور ان دیکھی دنیا کا طلسم مکروفریب کا جال پھیلائے اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کب کوئی بھولا بھالا انسان اس جادو نگری میں قدم رکھے۔ اس اجنبی کے قدم رکھتے ہی اس جادو نگری کی طلسم خیز وادیوں کی چکا چونداس کی آنکھوں کو اس طرح خیرہ کرتی ہے کہ وہ عمر بھر اس طلسم میں کھوئے رہتے ہیں اس دل فریبی کے پالنے میں بیٹھے بیٹھے عمر بیتا دیتے ہیں۔ سالوں بعد اس سحر خیزی کا خمار اترتا ہے تو عمر کا اڑن کھٹولا انھیں بلندیوں کی طرف محوِ سفر ہونے کے لیے تیار نظر آتا ہے۔ تو پھر وہ بدحواسی میں اپنی ماں مٹی کی طرف سرپٹ بھاگتے ہیں کہ ماں تو میری ماں ہے مگر اس وقت ماں مٹی اپنی آغوش الٹ دیتی ہے ہائے صد افسوس کہ خسارہ ہی انسان کا مقدر ٹھہرا۔ مگر اسی ماں مٹی کے کچھ جیالے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ دو دو ہجرتیں ان کا مقدر ٹھہرتی ہیں مگر جی عش عش کر اٹھتا ہے کہ کچھ قد آور ایسے بھی ہوتے ہیں جنھوں نے عمر بھر اپنی مٹی سے، اپنے لوگوں سے وفاداری پیار ومحبت اور انسیت کی جوت کبھی بجھنے نہیں دی۔ کیسے کیسے انمول رتن اور گوہر نایاب اسی مٹی سے پیدا ہوئے جنھوں نے ہر حال میں اپنی مٹی اپنی زبان سے وفاداری نبھائی۔ جن میں ساقی فاروقی، مامون ایمن، عمر میمن، بیدار بخت، تقی عابدی، عبداللہ جاوید، پروفیسر یونس شرر، احمد مشتاق اور ڈاکٹر فیروز عالم کے نام نمایاں ہیں۔

زبان نے انسان کو معرفت کا اعجاز بخشا۔ وہ کبھی کلام اور کبھی تحریر کی شکل میں ادب کے گہوارے کو سجاتی ہے۔ ان پھولوں کو افق کے اس پار سے آنے والی ہواؤں کے جھونکوں نے ہمیشہ تروتازہ رکھا ہے۔ یہ تراوٹ ہزاروں میل کی دوری کے باوجود، ان کے دلوں کی دھڑکن ان کی تحریروں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

فن پاروں کے ستارے ادب کی ردا میں نگینے بن جاتے ہیں۔ فیروز عالم جو پیدائش کے ساتھ ہی ڈاکٹر کا صیغہ اپنے ساتھ لے کر پروان چڑھے۔ جودھ پور کی مٹی کے سپوت ہو کر سندھ کی سرزمین جو سرسوتی کی پیاس سے صحرا اور ریگستان کو سمیٹے ہوئے ہے تو دوسری طرف سمندر کی بے کراں لہریں اس کے سینے کو چیرتے ہوئے لبالب موجزن ہیں۔ مختلف تہذیبی پس منظر رکھنے والا فیروز عالم حقیقت میں بھی "فیروزہ" ہے جو عالم کل کے لیے ہے، ایک طرف وہ حساس دل اور سوچ کا مالک ہے۔ پسے ہوئے اور مصائب سے گھرے متوسط طبقے سے دلی ہمدردی ان کی تحریروں میں جھلکتی ہے۔ ''ہوا کے دوش پر'' ایک ایسی خوش نوشت حیات ہے، جس میں مصنف نے نہایت ایمانداری سے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جسے کہتے ہوئے لوگ یا تو شرماتے ہیں یا نقاب میں منہ چھپا لیتے ہیں۔ ''دھنک کا آٹھواں رنگ''، ''خزاں کا گیت''، ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ان عناوین میں ہمیں ابدیت، انفرادیت اور رجائیت کی گھوج سنائی دیتی ہے۔ بالکل اک بچھڑی کونج کی طرح جو اپنی ڈار سے بچھڑ گئی ہو۔ مگر وہ مایوس اور ناامید نہیں ہے اور پرواز مسلسل اس کا شعار ہے۔ فیروز عالم نے بھی ایسی ہی ان دیکھی سرزمینوں کو فتح کرنے کی امنگ جگانے کی کوشش کی ہے۔ ناممکن کو ممکن بنانے کا عزم نمایاں نظر آتا ہے۔

ان کی کہانیوں میں وطن کی مٹی سے ایثار اور خوشبو متولی پن نظر آتا ہے۔ اپنے لوگوں سے دوری اور دوسری تہذیب کی یلغار سے اثر پزیری اور مہلک تابکاری کا نوحہ ان کی ہر تحریر کا خاص وصف ہے۔

ہر دور کا ادب مختلف تہذیبوں کا ترجمان رہا ہے اور یہ ہی اس تہذیب کی زندہ تاریخ اور تصویر ہوتا ہے۔ ترجمہ جسے تہذیبی پل کہا جاتا ہے یہ نہ صرف رابطے کی کلید ہے بلکہ یہ ہمیں کل عالم کے ادبی فن پاروں کو ایک مالا میں پروتے نظر آتا ہے۔ مختلف زبانوں اور مختلف خطوں کی شاہکار تحریروں سے آشنائی کروا کر ان دنیاؤں کی سیر کرواتا ہے۔ ''افق کے اس پار'' میں ایسے ایسے کوڈ ورڈ ہیں۔

ان پاس ورڈ کو ان کوڈ کرنے کا سہرا فیروز عالم کے سر ہے۔ دنیائے ادب کے نامور ستارے (جان اسٹائین بیک، او ہنری، ایڈگر ایلن پو، سیلی بنس، ٹرومین کاپونے، کیرن پورٹر، ایلیس منرو، سمرسیٹ ماہم، جارج اوریل، ڈبلیو ڈبلیو جیکب۔ ساکی، آسکر وائلڈ، موپاساں، ژاں پال سارتر، گارشیا مارکیز، انٹان چیخوف۔ لیوٹالسٹائی۔ فرانز کافکا، نیڈین گول ڈیمز، رابندر ناتھ ٹیگور، ٹی جانگی رامن، محمد دیب، نجیب محفوظ، پری منصوری، لی باجن اور ناکا مورا) کی کہانیوں کا ایسا سلیس اور روانی کے ساتھ ترجمہ پیش کیا ہے کہ قاری کو شروع سے لے کر آخر تک ذرا بھی بوریت اور اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کسی غیر ملکی کہانی کار کی تحریر کو پڑھ رہا ہے۔ اس کتاب کی شکل میں ادب کا ایک انمول خزانہ پیش کیا ہے جو ترجمہ کم اور طبع زاد زیادہ نظر آتا ہے یہاں بھی تخلیق نگاری کا دامن تنگ نہیں پڑا بلکہ یہ بڑا اور مضبوط ثابت ہوا اور ایک یادگار بن گیا۔

فیروز عالم طب کے میدان کے بھی ناقابل فراموش شاہ سوار ہیں جنھوں نے 1970 سے اب تک مسلسل خدمت خلق کا بیڑا اٹھائے رکھا اور رفائے عامہ بھی ان کا خاصہ رہا۔ جس کی رخشندہ مثال " طب " اور مختلف امراض کے بارے میں بنیادی اور ضروری معلومات پر مشتمل مضامین "روزنامہ جنگ" چہارسو اور دیگر جرائد میں سلسلہ وار شائع ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم ادب اور طب کی ایسی ناموس ہیں جو زندگی میں محنت، لگن اور خدمت خلق سے عبارت ہے۔

ہوا کے دوش پر

سلیم آغا قزلباش
(سرگودھا)

مشرقی مزاج میں ماضی پرستی ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔اسی لیے مشرق کے باسی اپنے ماضی اور اسلاف کے کارناموں کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں مگر ڈاکٹر فیروز عالم نے احوالِ واقعی کے تحت سب کچھ بیان کیا ہے اور وہ کہیں بھی مبالغہ آرائی اور بے جا خودستائی کے مرتکب نہیں ہوئے۔

ڈاکٹر فیروز عالم کی خودنوشت سوانح عمری کے عنوان ''ہوا کے دوش پر'' کے نیچے یہ درج ہوا ہے ''ایک عام آدمی کی داستانِ حیات''۔دراصل یہاں انہوں نے کسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔یہ ایک عام آدمی کی نہیں ایک محنتی آدمی کی داستانِ حیات ہے۔بظاہر ہر سال ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں طلبا و طالبات زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں مگر اُن میں سے کتنے فی صد اس بلند مقام کو چھونے میں کامیاب رہتے ہیں، جہاں ڈاکٹر موصوف جیسے گنے چنے لوگ ہی پہنچتے ہیں۔بہ الفاظِ دیگر ڈاکٹر فیروز عالم کا شمار اُن افراد میں ہوتا ہے جو اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے حوالے سے سرخرو ہو چکے ہیں۔مذکورہ خودنوشت سوانح عمری کا ایک خاص پہلو مصنف کی غیر معمولی قوتِ یادداشت ہے۔بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کی منازل طے کرتے ہوئے بے شمار واقعات، جیتے جاگتے کرداروں کے شخصی اوصاف اور اُن کی زندگی کا حال احوال اس پیرایے میں بیان ہوا ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے ہم ایک متحرک فلم دیکھ رہے ہوں۔لہٰذا اگر میں یہ کہوں کہ ڈاکٹر فیروز عالم کی یادداشت ''تصویری'' طرز کی ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔مزید برآں یہ کہ وہ تمام انسانی اقدار جن کے توسط سے ایک معاشرہ صحت مند بنیادوں پر تشکیل پاتا ہے، ڈاکٹر صاحب کے خاندان کے بیشتر افراد میں موجود رہی ہیں۔عزتِ نفس، جہدِ مسلسل، عزمِ صمیم، اصول پسندی اور قربانی جیسے اوصاف کو ہم بہ آسانی نشان زد کر سکتے ہیں۔

کم و بیش پونے پانچ سو صفحات کو محیط اس سرگزشت میں کچھ باتوں کی کہیں کہیں تکرار بھی ہوئی ہے مگر وہ کھٹکتی نہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سوانح عمری میں بیان کردہ حالات و واقعات ہر اُس سفید پوش طبقے کے افراد کے حالاتِ زندگی سے لگا کھاتے ہیں، جنہوں نے نئی دھرتی پر قدم رکھنے کے بعد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔دراصل ہر طبقۂ عوام کے اپنے کچھ مخصوص اوصاف ہوتے ہیں بالکل اس طرح جیسے ایک خاص خطّے کے کلچر کے کچھ منفرد رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔اس سب کے باوصف ہر گھرانے کا اپنا ایک کلچر بھی ہوتا ہے جسے ہم اس کے علیحدہ تشخص سے موسوم کر سکتے ہیں۔اس زاویے سے دیکھیں تو ڈاکٹر فیروز عالم کے خانوادے کی اپنی الگ چھاپ نظر آتی ہے۔دوسری طرف ہر مثالی خاندان میں ایک مرکزی شخصیت موجود ہوتی ہے جو اہلِ خاندان کے لیے ایک مشعل بردار کا درجہ رکھتی ہے۔اُس شخصیت سے خاندان کے افراد مستفیض ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ایسی مشعل بردار شخصیات ڈاکٹر فیروز عالم کے خاندان میں بھی موجود تھیں اور انہیں کے طفیل وہ اپنی زندگی کے نصب العین کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

اس سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ ایک مہذب اور تعلیم یافتہ خاتونِ خانہ خاندان کی ترقی و کامیابی میں اساسی نوعیت کا کردار ادا کرتی ہے۔ڈاکٹر فیروز عالم کے اوراقِ زندگی کی ورق گردانی کرتے ہوئے جگہ جگہ اُن کی والدہ کی ہستی ایک رہنما کی صورت میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے کہ جس نے مایوسی اور نااُمیدی کی گھڑی میں اپنے فرزند کا حوصلہ بڑھایا اور اُسے زندگی کے نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔ایڈلر کی نفسیاتی توجیہہ کو سامنے رکھیں تو مصنف کی کامیابیوں کا ایک دوسرا زاویہ بھی ہمارے سامنے نمودار ہوتا ہے۔بچپن میں وہ جسمانی طور پر انتہائی دبلے پتلے اور منحنی سے تھے۔رنگ بھی خاصا سانولا تھا، شرمیلے بھی بہت تھے اور مقابلے بازی اور مسابقت سے دُور بھاگتے تھے۔یہ جملہ پہلو نفسیاتی حوالے سے احساسِ کمتری کو پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔لہٰذا اپنے دبلے پتلے اور شرمیلے پن اور تعلیمی کمزوری کے ازالے کے لیے انہوں نے آہستہ آہستہ تعلیم میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور زمانہ طالب علمی کے دوران ہی میں متعدد مواقع پر کچھ ایسی جرأت مندانہ صاف گوئی کا مظاہرہ کیا کہ جس کا تصور اُن کا کوئی ہم عمر طالبِ علم کر ہی نہیں سکتا تھا۔گویا جسمانی منحنی پن، ذہنی شکستگی اور جرأت وحوصلے میں تبدیل ہو گیا جس کے نتیجے میں اُنہیں زندگی کے میدانِ عمل میں خاطر خواہ کامیابیاں حاصل ہوئیں۔

زیرِ نظر سوانح عمری میں مصنف نے اپنی تعلیمی کارکردگی کا بالتفصیل تذکرہ کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ قاری خود کو مصنف کے ساتھ ساتھ تعلیم کی سیڑھی پر قدم بہ قدم چڑھتے ہوئے محسوس کرنے لگتا ہے۔تعلیم کی اہمیت کا بھرپور احساس مذکورہ سوانح حیات کے تاروپود میں بکھرا ہوا ہے۔وہ تمام درس گاہیں، جہاں سے اُنہوں نے تعلیم حاصل کی، وہاں کے اساتذہ، ہم جماعت ساتھیوں اور تدریسی ماحول پر بھرپور طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔نیز ان سب کے بارے میں پڑھتے ہوئے کہیں بھی دلچسپی میں کمی واقع نہیں ہوتی اور تجسّس کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔بیشتر اہلِ قلم کی تحریر کردہ خودنوشت سوانح عمریوں اور ڈاکٹر فیروز عالم کی رقم کردہ سوانح عمری میں بنیادی فرق ''درسی تعلیم'' کے حوالے سے ہے۔زیرِ نظر سوانح حیات میں تعلیم کو ایک ''مرکزے'' کی حیثیت حاصل ہے۔جبکہ دیگر اہلِ قلم کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں میں بالعموم حوادثِ زمانہ اور معاملاتِ دنیا پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔

نجانے کیوں مجھے ''ہوا کے دوش پر'' کو پڑھتے ہوئے کئی بار کچھ ایسا لگا کہ میں ایک سوانح حیات کے پہلو بہ پہلو ایک سیاحت نامے اور افسانوں کی کتاب کا مطالعہ بھی کر رہا ہوں۔کہنے کا مطلب یہ کہ مذکورہ سوانح حیات میں ایک

سیاحت نامے اور فکشن کی کتاب جیسا لطف پایا جاتا ہے۔ اس چیز نے اس کی Readability میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ ڈاکٹر فیروز عالم کا گھرانہ نہ صرف روشن خیال اور تعلیم کی قدر و قیمت سے بخوبی آشنا تھا بلکہ اُن کے اہلِ خانہ سماجی و ثقافتی نوعیت کی مجالس و محافل میں بھی شرکت کرتے رہتے تھے۔ بالخصوص مصنف کی والدہ ماجدہ ایک نہایت سلجھی ہوئی اور باسلیقہ خاتونِ خانہ تھیں جو مختلف طرح کی سماجی و ثقافتی نوعیت کی تقریبات میں بھی بڑھ چڑھ کر شرکت کرتی تھیں۔ اسی ماحول کا نتیجہ تھا کہ ڈاکٹر فیروز عالم دورانِ تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خوب حصّہ لیتے رہے۔ چنانچہ اُن کی شخصیت کی نشو و نما میں اُن مصروفیات نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح زمانۂ طالب علمی میں اُنہیں زندگی کے اتار چڑھاؤ کو دیکھنے کے مواقع ملے جس سے اُنہیں انسانی فطرت کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملی۔

اس سوانح عمری کی ایک اور قابلِ ذکر خوبی یہ ہے کہ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے مثبت سوچ کو جلا ملتی ہے۔ اسی طرح عالمِ غیب سے مدد ملنے کے متعدد واقعات کا کچھ اس طور ذکر ہوا ہے کہ تائیدِ ایزدی پر کامل یقین ہو جاتا ہے اور وہ مشہور مثل کہ "ایک در بند ہو جائے تو سو در کھُل جاتے ہیں" کی صداقت پر بھی مہرِ تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر فیروز عالم نے اپنے عزیز و اقارب، دوستوں اور دیگر محترم ہستیوں کے احسانات کا اقرار کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ جس کسی نے بھی اُن کے ساتھ بھلائی کی، مصیبت کی گھڑی میں اُن کا ساتھ دیا، اُس کے احسان کا تذکرہ کھلے دل سے مذکورہ سوانح عمری میں کر دیا گیا ہے۔ یہ بذاتِ خود اُن کا بڑا پن ہے، ورنہ لوگ باگ عام طور پر دوسروں کے احسانوں کا برملا اعتراف نہیں کرتے۔

مصنف نے اپنی سوانح حیات میں چند ایسی لڑکیوں کا ذکر بھی کر ڈالا ہے جن کے دامِ الفت میں وہ گرفتار ہو گئے تھے۔ مگر اُن کی یہ گرفتاری درحقیقت عارضی لگاؤ کی حد تک ہی محدود رہی اور وہ جلد ہی اُس وقتی نشے کی گرفت میں سے باہر نکل آئے۔ ویسے عنفوانِ شباب کے دنوں میں جنسِ مخالف کی جانب کشش کا افزوں ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ اس سے قطع نظر مصنف کی شخصیت سازی کا بتدریج ارتقا اس آپ بیتی کے مطالعے سے بخوبی عیاں ہو جاتا ہے۔ ہم ایک نوعمر طالبِ علم کو اعلیٰ تعلیم سے فیضیاب ہو کر شعبۂ طب میں ایک بلند مقام پر فائز ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ خود نوشت سوانح عمری شکست خوردہ اور دل گرفتہ نوجوانوں کو حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنے کا درس بھی دیتی ہے۔ لہٰذا اس نوع کی خود نوشت سوانح عمریوں کا منظرِ عام پر آتے رہنا ضروری ہے تاکہ بے دلی اور مایوسی کے شکار نوجوانوں کے دلوں میں اُمید کی شمع روشن رہ سکے اور وہ اندھیروں کو دور بھگانے کے لیے کوششیں کرنا جاری رکھ سکیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم نے اپنی سوانح حیات میں اپنے بچپن کے ہمجولیوں، سکول کالج کے اساتذہ، میڈیکل کالج کے کچھ ہم جماعت دوستوں، پروفیسروں اور چند دیگر شخصیات کے بارے میں بعض مقامات پر ایسے پیرایے میں اُن کی مرقع کشی کی ہے کہ واقعی یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم مختصر قسم کے خاکے پڑھ رہے ہوں۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب میں خاکہ لکھنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ لہٰذا اُن کی اگلی کتاب خاکوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔

"ہوا کے دوش پر" ہموار نثر میں قلم بند کی گئی ہے۔ اس میں انشاپردازی کا مظاہرہ کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ اپنے طور پر ایک خوبی ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصنف نے نثری مینا کاری کے ذریعے قاری کی توجہ حاصل کرنے کی سعی نہیں کی، کیونکہ اُنہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ فقط عبارت کی تزئین و آرائش سے قاری کو مرعوب نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا بہترین زمانہ امریکہ میں گزارا ہے۔ لہٰذا اُن ماہ و سال کا احاطہ کرنا بھی از بس ضروری ہے کہ تشنگی کا احساس اسی صورت میں مٹ سکتا ہے۔

"محبت جیت جاتی ہے"

ڈاکٹر فیروز عالم کی کہانی "باوقار تدفین" نئی اور نئے زاویے سے لکھی گئی درد بھری سی روداد ہے۔ عنوان میں لفظ تدفین مذہبی رسمی سوگواری سے دوچار کرتا چبھتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ افسانہ اپنے "دل تسلّی" کے لیے میں نے بدل کر "باوقار رخصت" کی چھتری تلے پڑھا۔ نائن الیون کا اتنا غیر جذباتی او رنویلا اور غیر جانبدارانہ احوال موضوع پر بھرپور مہارت کا غماز اور اعتماد سے قلمبند کیا گیا ہے۔ یہاں نائن الیون برپا کرنے والوں کا نظریہ انسانی جذبات کے سامنے ڈھیر ہو جاتا ہے اور نظریے کے پیچھے فکر کو باطل اور انسانیت سوز اور اس پر عمل پیرائی کو انتہائی بے دردانہ اور کھٹور ثابت کرتا ہے۔ یوں درد کا چھالا پھوٹ جاتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں افسانہ حقیقت سے اور حقیقت افسانہ سے زیادہ دل گزیں و دل گداز و دلچسپ ہوتی ہے۔ یہ کہانی پڑھتے پڑھتے میں گتھی گھٹی خشک سسکیوں میں گھر گیا جو آخری سطور پڑھتے ہوئے نمی میں تبدیل ہو گئیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے چپ چپاتے باوقار رفتار و انداز اسلوب میں بڑے سبھاؤ سے ذہن پر چھائے تعصب کی گھٹا ہٹانے کا سامان کیا ہے۔ کچھ منوائے بغیر دلوں کو دکھن اور پیڑ سے پگھلا دیا ہے۔ افسانے کا اختتام قاری کی آنکھوں پر قابض ہو کر منظر پر انسانیت بھری پھوار ڈالتا ایک اہم سوچ کو جنم دیتا ہے کہ ازل سے تو خدا نے دلوں میں محبت بھری ہے اس کے دشمن کہاں سے پیدا ہو گئے؟ محبت جب اُمڈتی، اُبھرتی ہے خیال و عقیدہ دھرا رہ جاتا ہے اور محبت جیت جاتی ہے۔ اس جذبے کو پنپنے دینا چاہیے۔

مقصود الٰہی شیخ (یوکے)

''ہم فقیروں سے گفتگو کرلو''

تابش خانزادہ

(نیویارک)

اگر چہ میں خود کو کسی طرح بھی اس قابل نہیں سمجھتا کہ ڈاکٹر فیروز عالم کے بارے میں کچھ کہوں اس کے باوجود میں خود کو اُن خوش قسمت لوگوں میں سمجھتا ہوں جو ڈاکٹر فیروز عالم کے ملک میں پیدا ہوئے، جنہوں نے ان کے دوش بدوش ہوا کے دوش پرواز کرتے ہوئے امریکہ میں ان کے گھر کے قریب بسیرا کیا۔ان کے ساتھ ساتھ پاکستان لنک میں لکھا اور اس ہوا میں سانس لی جس میں ڈاکٹر فیروز عالم لے رہے ہیں۔اس خاکسار نے اپنی کتاب میں اپنے اور اپنے خاندان پر بہت کچھ لکھنے کے باوجود اپنے بارے میں کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے کچھ نہیں لکھا۔

میں ان کی ذات اور شخصیت کو پچھلے پچیس سالوں سے پڑھتا آ رہا ہوں۔اب بھی میرے لیے ان جیسے ہمہ جہت ہستی کا مکمل احاطہ کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا ایک چڑیا کے لیے چاول کے کسی گودام سے مسلسل چوبیس گھنٹے ایک ایک دانہ چُننے کے بعد اپنی زندگی میں اسے خالی کرنا ہے۔ایک جانب یہ اپنے وقت کے نامور ڈاکٹر ہیں تو دوسری جانب بلا کے لکھاری ہیں۔تیسری جانب یہ ایک محبت کرنے والے شوہر اور چوتھی جانب ایک شفیق باپ ہیں۔پانچویں جانب یہ ایک گلوکار اور چھٹی جانب ایک موسیقار۔ساتویں جانب یہ ایک ادب پرو ہیں اور آٹھویں جانب یہ بندہ پرور ہیں۔نویں جانب یہ ایک بے نظیر دوست ہیں اور دسویں جانب یہ ایک عظیم استاد ہیں۔اپنی گنتی یہاں پر روک کر اگر میں ان کی مندرجہ بالا اوصاف پر مثالوں کے ساتھ چند سطور بھی لکھوں تو وہ ان کی کتاب کی جسامت سے کئی گنا ضخیم ہو جائیں گے۔ان کی کتاب ''ہوا کے دوش پر'' کو پڑھنے کے بعد ان کی شخصیت کے بارے میں آپ نے اب تک اخباروں اور رسالوں میں بہت کچھ پڑھا ہے اور پڑھیں گے۔میں آپ سے ایک ایسے فیروز عالم کا تعارف کراتا ہوں جو ان کی کتاب میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔اس فیروز عالم کو انہوں نے نہ صرف ساری دنیا بلکہ اپنے آپ سے بھی چھپا کر رکھا ہے۔اسی لیے درویش صفت فیروز بہت کم لوگوں کو دکھائی دیتا ہے۔

اللہ کے ان بندوں کو ولی کہا جاتا ہے جو مذہب، فرقے، رنگ و نسل اور علاقائی تعصب سے بالاتر ہو کر اپنے سینوں میں مخلوقاتِ خدا کے درد کا درماں لیے پھرتے ہیں اور ان کا ہر سانس اللہ کے بندوں کو فلاح پہنچانے کی کاوش میں گزرتا ہے۔ایک دور تھا اللہ کے ولی ہر گھر اور محلے میں ہوا کرتے تھے۔پھر دور آیا کہ مرشد ایک ولی ایک شہر میں تعینات کیا کرتے تھے۔پھر یوں ہوا کہ وہ ہماری نظروں سے محو ہوتے ہوئے ہم سے پوشیدہ ہو گئے۔لیکن میں ایک ایسے چلتے ولی اللہ کو جانتا ہوں جو زمانے میں ڈاکٹر فیروز عالم کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔وہ ہسپتال میں اللہ کے بندوں کا علاج کرتے ہیں اور گھر میں بیٹھ کر اپنے ملک کے ناداروں اور یتیموں کے لیے اپنی جیبیں خالی کرتے ہیں۔یہ فیروز عالم پاکستان میں اعلیٰ تعلیم پانے والے یتیم طلباء کو تعلیمی اخراجات دیتے ہیں۔پچھلے بیس سال میں انہوں نے کراچی سے خیبر تک سینکڑوں نادار طلباء کی انگلی پکڑ کر ان کو میڈیکل اور انجینئرنگ کے علاوہ سی ایس ایس اور آرمی جیسے مشکل ترین دور سے گزرنے میں مالی مدد دی۔میں آج پاکستان کے چپے چپے میں پھیلے ہوئے کئی ایسے ڈاکٹروں، انجینئروں، پروفیسروں، کرنیلوں اور افسروں کو جانتا ہوں جو ان کی مدد کے بغیر کسی بنئے کی دکان پر منشی لگنے کے قابل بھی نہ ہوتے۔ڈاکٹر کے بھیس میں فیروز ایک چلتے پھرتے ولی کا نام ہے۔اس فقیر منش شخص پر فقیر منش شاعر ساغر صدیقی کا یہ شعر صادق آتا ہے:

گُر سکھا دیں گے بادشاہی کے
ہم فقیروں سے گفتگو کر لو

جب سرزمین پاک میں کہیں ایک خوش کُش دھماکہ ہوتا ہے تو فیروز بھائی کے دردمند دل میں مظلومینِ دھماکہ کے لیے ہزاروں دھماکے ہوا کرتے ہیں۔اب بھی پاکستان کے مختلف شہروں میں آنے والے زلزلے ان کے جسم کا جوڑ جوڑ ہلا دیتے ہیں اور دریائے سندھ میں آنے والے طوفان ان کی آنکھوں میں آ جاتے ہیں۔

کہتے ہیں ہر سو سال بعد ایک ابدال پیدا ہوتا ہے۔ہمارے دور کے کسی ولی کو ابدال کے درجے پر فائز کرنے کے لیے کسی چناؤ کی ضرورت نہیں ہوگی اس لیے کہ بہت کم دل ایسے ہیں جو فیروز بھائی سے کسی طور بہتر دھڑکتے ہوں۔اگر پاکستان کی ساری مائیں اپنی کوکھ سے فیروز بھائی سے سو گنا کم دردمند دل والے بچے پیدا کریں تو دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کو ترقی کرتے ہوئے نہیں روک سکتی۔جس پرواز کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب میں کیا ہے اس کی اڑان دنیا کی سیر سے متعلق ہے۔ان کی حقیقی پرواز تو ان کی روح کی ہے جو آسمان کی جس بلندی کی سیر کرتی ہے اس کا ادراک میرے لیے ناممکن ہے۔فیروز بھائی میں آپ کی سادگی، سادہ دلی، دردمندی اور محبت بھری شخصیت کو سلامِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔یہ تھے فیروز عالم بحیثیت ایک انسان کے۔

اب آتے ہیں فیروز عالم بحیثیت ایک لکھاری کے۔تم بولتے جاؤ اور میں بتاتا جاتا ہوں کہ تم کون ہو۔حضرت علیؓ سے منسوب اس قول میں اگر بولنے کے لفظ کو لکھنے میں تبدیل کر دیا جائے تو یہ قول فیروز بھائی پر کچھ یوں صادق آئے گا کہ انہوں نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر اپنے دل کی بات بڑے سادہ، شستہ اور شفاف الفاظ میں اپنے قارئین تک پہنچانے میں کسی بخالت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ دوستوں اور رشتہ داروں کے مثبت پہلوؤں کو بانگ دہل اور منفی پہلوؤں کو دبے

باقی صفحہ ۳۸ پر ملاحظہ کیجیے

''یادِ ماضی خواب ہے یارب''

عبدالباری
(کراچی)

خدا کرے وقت کی طنابیں اسی طرح تمہارے قابو میں رہیں
(آمین)

بڑے انتظار کے بعد تمہاری طرف سے دوخوشیاں آگے پیچھے ملیں۔ ''ہوا کے دوش پر'' کی منظرِ عام پر آنے کی نوید اور تمہارا خط۔ قندِ مکرر کے طور پر تمہارا افسانہ بھی ساتھ تھا۔

تمہارے فون کے بعد جامی صاحب کے پاس چند دنوں بعد جا سکا تھا۔ اس کتاب سے تمہاری زندگی کے ایک حصے سے آگاہی ہوئی۔ یقین جانو میری پیاس اور بڑھ گئی۔ تمہاری سرگزشت کے درمیانی حصے تو خاصی حد تک آگاہی تھی کیونکہ وہ شب و روز تو ایک حد تک ساتھ گزرے تھے۔ پر میری تشنگی کی وجہ تمہارے دیارِ غیر میں گزرے ہوئے ایام کی روداد تھی جو ہنوز نگاہوں سے اوجھل ہے۔ مجھے یقین ہے وہ اور بھی بھرپور ہوگی۔ بقول شاعر:

یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

تمہارے بارے میں تو مجھے یقین ہے کہ یہ آوارگی استعارے کی حد تک ہوگی اور بس! ''ہوا کے دوش پر'' تک تو قع حالات کا شکار تھے جنہیں اس خدائے بزرگ نے اپنی حکمت سے تمہاری کامیابیوں سے بدل دیا، پر جب حالات تمہارے قابو میں آنے لگے تو ہمارے اس عام آدمی پر کیا گزری؟

یقیناً تم اپنی آپ بیتی پر میرے تاثرات جاننے کو بیتاب ہوگے۔ یہ کمال نہیں ہے کیا کہ اپنی تخلیقات سب کو اولاد کی طرح پیاری ہوتی ہیں۔ مجھے جامی صاحب کے تمہاری کتاب کے بارے میں ستائشی الفاظ یاد آ رہے ہیں کہ اسے پڑھنے سے بہت سوں کی نیند اُڑ جائے گی۔ میں ان کی طرح صاحبِ نظر تو نہیں پر معترف ہوں کہ نیند میری بھی اڑی۔ تمہارا انداز اس قدر دلنشیں تھا کہ جی چاہتا تھا ایک ہی نشست میں پوری کتاب پڑھ لوں۔۔۔ پر یہ ممکن نہیں تھا۔

یار، تنقید نگاری مجھے آتی نہیں، پر یہ بات ضرور ہے کہ یہ کتاب میرے دوست کی داستانِ حیات ہے جسے بولتے اور لکھتے وقت الفاظ کو برتنے کا سلیقہ آتا ہے۔ میں نے اپنی سہولت کے لیے تمہاری اس یادداشت کے چار حصے کر ڈالے ہیں۔ اول تمہارا خاندانی پس منظر، دوم تمہارے میڈیکل کالج سے پہلے کے شب و روز، سوم تمہاری میڈیکل کالج کی زندگی اور چہارم تمہارے ڈاکٹر بننے کے بعد کی عملی زندگی کی کہانی۔ مجھے یہ چاروں ادوار انتہائی مربوط اور دیانتداری سے لکھے ہوئے لگتے ہیں جس کے لیے تم نے بے حد حوصلے سے کام لیا ہے۔

تمہارا خاندانی پس منظر جاننا قارئین کے لیے ضروری تھا۔ اتنی بھرپور شخصیت یوں ہی تو وجود میں نہیں آ جاتی۔ میری رائے میں یہ ان کا تم پر حق تھا، جسے تم نے انتہائی فراخدلی سے نبھایا ہے۔ ماں کسے پیاری نہیں ہوتی۔۔۔ پر اپنی امی کے بارے میں لکھتے وقت شاید تم اختصار سے کام لے گئے ہو۔ یہ تو ہم کالج ہی میں تم سے سن چکے تھے کہ تمہارے کردار کی تعمیر اور تمہاری قوت گویائی کی جلا انہیں کی رہینِ منت ہے۔ اشعار کا گفتگو میں پرونا تم نے ان ہی سے سیکھا ہے۔ ان کا خداوند کریم پر مکمل بھروسہ تھا جس میں ان کی عالی ہمتی کو بھی دخل تھا اور تم سے لائق بیٹے پر مکمل اعتماد کہ وہ تمہارے ڈاکٹر بننے کے بعد اچانک کراچی آ گئی تھیں۔ بہر حال تمہارا خاندانی پس منظر اس تہذیب کی جھلک ضرور دکھاتا ہے کہ ماضی میں خاندان میں مالی درجہ بندی کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔۔۔ ہمیشہ رشتوں اور انسانی قدروں کا پاس رکھا جاتا تھا۔ اسی لیے معاشرہ جاندار تھا۔۔۔ کتنی خوبصورت چیز ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے زندہ کلام میں اس کی تلقین کی ہے۔ نجانے ہم اتنے کم نظر اور مادہ پرست کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ تم نے بچپن کو بچپن کی طرح گزارا ہے پر یقین نہیں آتا کہ تم شروع میں عام طلباء کی طرح ہوگے۔ میرپورخاص کی زندگی، اسٹیشن کی گہما گہمی، فروٹ فارم کی تفریح اور گھر کے ادبی ماحول نے تمہاری شخصیت کی تعمیر میں بڑا رول ادا کیا ہے۔ خصوصاً گھر کے علمی ماحول اور شروع ہی سے ادبی چاٹ نے تمہارے ذوق کو جلا بخشی ہے۔ بقول اقبال ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی''۔ تمہارے بھائی صاحب کی تم پر گہری نظم مجھے اچھی لگی۔ بڑوں کو اسی طرح چھوٹوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ ان کا تم سب کے لیے ایثار اور تمہاری شخصیت و زندگی کی تعمیر میں ان کا حصہ قابلِ قدر ہے۔ مشرقی زندگی کی یہی خصوصیات ہم کو مغرب سے الگ کرتی ہیں۔ خاندان اکائی اور ہر ایک کا دوسرے کے لیے قربانی کا جذبہ، ان کے دکھ درد اور خوشیوں میں شرکت ہی سے ہمارے معاشرے میں رنگ آتا ہے۔ شاید یہ سب مغربی اقدار کا حصہ اب نہیں ہیں۔ اللہ ہمارے مستقبل کو محفوظ رکھے۔

اسکول کی زندگی میں اساتذہ کا کردار ایک مسلّم حقیقت ہے۔ اچھے اساتذہ عنقاء ہوتے ہیں اگر کسی کو پرکھنے والی آنکھ اور رہبری کرنے والے ہاتھ مل جائیں تو طلباء کی صلاحیتوں میں نکھار آتا چلا جاتا ہے۔ بہت کم طلباء ہوں گے جنہیں اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا صحیح ادراک ہوگا۔۔۔ اللہ کا شکر ہے تمہیں اچھے اساتذہ بھی ملے اور انہوں نے تمہاری صلاحیتوں کو خوب نکھارا۔۔۔ ہمارے زمانے کے اساتذہ بچوں کو سنوار کر دلی مسرت محسوس کرتے تھے کیونکہ ہمارا دور آج کی طرح مادہ پرست نہ تھا لہٰذا اساتذہ اپنی تمام تر توانائیاں بچوں کو علم سکھانے اور ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے پر صرف کرتے تھے۔۔۔ ان کی عظمت کو سلام۔۔۔ That's off میں یہ بات کہاں؟

تمہارا کالج میں داخلہ انتہائی متاثر کن تھا۔۔۔تمہارا انداز بیان اس قدر رواں اور دلچسپ ہے کہ قاری تمہارے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔تمہاری تحریر کا سحر انہیں اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیتا۔ یہ سب مجھے یوں بھی اچھا لگا کہ رشید بھیّا اور نجمہ شیخ یہاں سے تمہاری داستان حیات میں داخل ہوتے ہیں۔ اوائل شباب کے اس دور میں ہمارے عام آدمی کی صلاحیتیں نکھر کر عروج کی طرف رواں تھیں۔ پھر نجمہ شیخ سے مقابلے کی کیفیت نے ایک نئے جذبے کو آواز دی گو کہ مصلح سمجھاتے بھی رہے پر دل تو پاگل ہے، کسے معلوم کب اور کہاں گھائل ہو جائے۔ شاید تم سے زودِ حس رومانی طبیعت اور خود کو منوانے والے اس آزار کا آسان شکار ہوتے ہیں۔ بہر حال کالج کے دو سالوں میں جس طرح تمہارے گھر والوں نے رشید بھیّا کو ہاتھوں ہاتھ لیا وہ ان کی بڑائی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اچھے دوست کا ملنا، اُن تعلقات کا پروان چڑھنا اور برقرار رکھنا کتنی بڑی نعمت ہے تمہیں یقیناً اس کا اندازہ ہوگا۔۔۔ جیسا کہ تمہاری تحریر سے واضح ہے خوش قسمتی سے تمہیں اچھے دوست ملے اور ان سے محبت برقرار بھی رہی یہ بھی بڑی دولت تھی جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی۔ کسی اچھے گھرانے میں پیدا ہونا، پروان چڑھنا، اچھا ماحول اور اچھے دوستوں کا ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتیں تھیں جو تمہیں ملیں۔

ایمانداری کی بات ہے میں بھی یہ فراموش کر گیا تھا کہ تمہاری انٹر میں فرسٹ پوزیشن تھی۔ ہاں یہ ضرور یاد تھا کہ تم نے بورڈ میں فزکس میں ریکارڈ نمبر حاصل کیے تھے۔ تمہاری میڈیکل کالج کی زندگی تو ہمارے ساتھ ہی گزری تھی پر بہت سے حقائق نگاہوں سے اوجھل تھے۔ یہ تمہارا بڑا پن ہے کہ تم نے اپنے موجودہ مقام پر پہنچنے کے بعد بلا تامل ان سے پردہ اٹھایا ہے وگرنہ بیتے ہوئے کمزور اور سخت ایام سے کون پردہ اٹھاتا ہے۔۔۔ کہ شاید سبکی ہو۔ ہاں ایک بار پھر قابل صد احترام اور قابل تقلید تمہارے بھائی جان کا کردار ہے جس طرح انہوں نے اپنے خاندان اور تمہاری زندگی بنانے کے لیے اپنے مستقبل کی قربانی دی۔ ہمارے زمانے کی یہ روشن مثالیں آج کل کی گرتی قدروں تلے سسکتی نظر آتی ہیں۔ آئے دن دولت اور محبت (مستقبل) کو حاصل کرنے کے لیے لوگ اپنوں کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یہ سب سن کر اور دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ شاید تمہاری سرگزشت سے مستفید ہونے والے انسانی قدروں کے اس پہلو کی بھی تجدید کر سکیں جواب ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ بقیہ میڈیکل کالج کی زندگی تو ہماری اپنی زندگی تھی۔ یہ کرنل نجیب کے کارنامے کے ساتھ ہم سب کی خوش قسمتی تھی کہ الطبر ی ہال کا افتتاح ہم سے ہوا اور ہوسٹل کی اقامت ضروری کر دی گئی۔۔۔ یوں ہمارا گروپ وجود میں آیا جسے عمر عزیز کے اس دور میں ہم یاد ماضی ثواب ہے یارب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ایک چیز تمہاری تحریر سے عیاں ہے کہ نا مساعد حالات اور دشواریوں کے باوجود تم نے ہمت نہ ہاری بلکہ تمہاری قابل صد احترام ماں کے بقول ’’یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے‘‘ اللہ نے کیسے راستے کھولے اور تمہاری رکاوٹیں راستے کی دھول بن گئیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ تم اس دَیا پر شکر گزار بھی ہو اور تم نے اپنے موجودہ مقام کو صرف اپنی صلاحیتوں اور محنت کا انعام نہ سمجھا۔ اس کے شکرانے کی سب سے افضل صورت اس کی عبادت ہے اور جیسا تم نے لکھا ہے کہ تم اس کی بارگاہ میں سربسجود بھی ہو جاتے ہو۔۔۔ یاد ہے میٹرک میں استاد ابراہیم ذوق کا شعر کورس میں تھا:

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تم نے اپنی اس آپ بیتی میں، اپنے مشکل ایام میں مدد کرنے والوں کو دل سے یاد رکھا ہے اور جا بجا پوری دیانتداری سے انہیں یاد رکھتے ہو اور تذکرہ کرتے رہے ہو تو اسے کیسے فراموش کر سکتے ہو، جس کے ہم سب کلی طور پر محتاج ہیں۔ مجھے یقین ہے تم فطرت و جلوت میں یقیناً اسے یاد کرتے ہو گے۔ روانی میں فراموش کر بیٹھا کہ تمہاری کتاب پر رائے دے رہا تھا۔ تمہارے اوراقِ زیست بہا کر لے جاتے ہیں اور تحریر بے ربط ہو جاتی ہے۔ یاد آیا کالج میں تمہارے اتنے بہت سے ٹکڑے تھے ان کا ذکر کیسے کرتے۔ بس ذکر اس پری وش کا اور اندازِ بیاں اپنا۔ تمہاری کشتی ایک ہی گرداب میں ڈولتی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر بننے کے بعد کی زندگی مجھے زیادہ متاثر کن لگی۔ نگاہوں سے اوجھل ہونے کی بنا پر جملہ واقعات نئے نئے سے لگے۔ بے چاری سرفراز کو کیا معلوم تھا کہ ان تلوں کا تیل کسی اور کے رخساروں پر غازہ بن کر چمک رہا تھا۔ رہی للّن تو وہ خاصی عقلمند رہی کہ اس نے جلد ہی اپنا دامن بچا کر اپنی رعنائیاں کسی اور کے نام کر دیں۔ ڈاکٹر ناظر کے بارے میں نجانے کس نے بتایا تھا کہ وہ مزاحاً ہی سہی تو دونوں کو صفوں کی صفیں الٹا دینے کا حوصلہ دیا کرتے تھے اور گاڑی سمیت دوسری تمام سہولیات بہم پہنچانے کو تیار رہا کرتے تھے اور ہاں اچانک ہی یاد آیا کہ نجانے راوی کون تھا، بھول گیا ہوں۔۔۔ تمہاری کسی برٹش (گوری) نرس سے سیونتھ ڈے میں جھڑپ ہو گئی تھی اور معاملہ ڈاکٹر چیپ مین تک جا پہنچا تھا۔ جس نے چھان بین کے بعد اس نرس کو ہی معافی مانگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب! اگر کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا تھا تو اسے اس دستاویز میں جگہ ملنی چاہیے تھی۔۔۔ یہ خود ستائش نہ ہوتی بلکہ ہمیں مزید حوصلہ دیتی کہ ہمارا یار کبھی کسی سے کم نہیں رہا۔۔۔ گوری چمڑی سے دبنے کا کیا سوال؟ مزید اتنے مہربان ڈاکٹر ناظر نے عین وقت پر ٹکٹ کروانے سے کیوں انکار کیا، کھٹکتا ہے؟ شاید تم جان بوجھ کر گول کر گئے کہ تمہاری اپنی اچھائی، اتنے پیارے شخص سے کیسے شکایت کرتی؟

اب اسے تم جھوٹی تعریف نہ سمجھنا۔۔۔ کلی طور پر تمہارا اسلوب نہایت دلنشین رہا ہے۔ اس میں روانی کے ساتھ، بے ساختہ پن اس طرح غمازی کرتا ہے کہ واقعات یاد آتے چلے گئے اور تم لکھتے چلے گئے۔ کہیں کہیں رشتے داروں کے نام کے ساتھ ان کے واقعات کی تکرار نظر آتی ہے۔ مجھے اچھا لگا بار بار کتاب پلٹنے سے یہ بہتر رہا ہے۔۔۔ یقین مانو یہ تمہاری تحریر کا سحر ہے کہ قاری

باقی صفحہ ۳۸ پر ملاحظہ کیجیے

محنت اور خوبصورتی کا ثمر

محمد امین الدین احمد
(کراچی)

کسی بھی فن سے وابستگی ایک ۔۔۔صلاحیت ہے۔ یہ خدا کی ودیعت کردہ ہوتی ہے۔اسے بہتر سے بہتر کرنے کے عمل سے تو گزرا جاسکتا ہے مگر یہ کسی ایسے شخص کو نہیں دی جاسکتی جسے قدرت نے پہلے سے روح کو بے چین کئے رکھنے والے عارضے میں مبتلا نہ کیا ہو۔ پھر زیادہ سے زیادہ وقت دینے اور مسلسل تخلیقی عمل سے گزرتے رہنے سے اس میں نکھار پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔کبھی کبھی کچھ فنکار لوگ اپنی زندگی کے مشغلوں میں اس قدر مصروف ہوجاتے ہیں کہ ان کی صلاحیتیں کچھ عرصے کے لیے کہیں دب جاتی ہیں اور جونہی انہیں فرصت میسر آتی ہے تو اپنی اس دبی ہوئی صلاحیت کو اپنی بے چین فطرت کے سبب نکالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ڈاکٹر فیروز عالم کے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ رہا ہے۔

ادب سے وابستگی ودلچسپی کا سلسلہ تو ان کے بچپن میں اپنے گھر پھر اسکول اور کالج ہی سے شروع ہوگیا تھا جس کا پتا ہمیں ان کی خودنوشت ''ہوا کے دوش پر'' سے چلتا ہے جس میں انہوں نے بڑی تفصیل سے اپنی گھریلو زندگی، بچوں کی تربیت، والدہ کا شعری ذوق، گھر میں اچھے ناولوں اور دیگر ادبی کتابوں کے مطالعہ جیسے واقعات کی صورت میں کیا ہے۔ پھر انہیں تعلیم اور دوسری پیشہ ورانہ مصروفیات میں شاید ادب کے لیے وقت نہ نکال سکے ہوں تاہم اب دکھائی دیتا ہے کہ زندگی میں پچاس کا ہندسہ گزرنے کے بعد انہوں نے اپنے ادبی ذوق کو دوبارہ ابھارنے کی نہ صرف کوشش کی بلکہ لکھنے کی طرف بھی راغب ہوئے۔انہوں نے تخلیق کی سطح پر اپنی بات کہنے کے لیے افسانے کی صنف کا انتخاب کیا۔ان کے افسانے کا پہلا مجموعہ ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آیا۔اس میں نہ صرف زندگی کے عام مسائل پر مبنی افسانے شامل ہیں بلکہ خاص طور پر انہوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں پیش آنے والے دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات کو افسانوی رنگ دیا ہے۔وہ اردو کے اعلیٰ شعری ذوق اور بڑے بھائی سلطان عالم سے سنے ہوئے اردو اور انگریزی کے کلاسیکی ادب پاروں کو سن کر اپنے لیے نثر کا انتخاب کرنا ان کے لیے درست قدم تھا۔اس کی بنیادی وجہ یہ دکھائی دیتی ہے کہ انہوں نے جو عملی زندگی بسر کی وہ واقعات، حادثات اور نت نئی کہانیوں سے بھری ہوئی تھی۔کسی شخص کے تجربے میں ایسی ہمہ جہت زندگی آئے تو اس کے بھرپور اظہار کے لیے نثری تخلیق کا ہی راستہ ہونا چاہیے۔یہ بات اس طرح بھی پایہ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ ان کے بیشتر افسانوں مثلاً ''گھروندے انا کے''۔''پھر کبھی'' اور ''ناموس کی قیمت'' میں کہانی کا مواد ان کی پیشہ ورانہ زندگی سے ہی حاصل ہوا ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم کے افسانوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ واقعاتی حرکت سے زیادہ متن کے سادہ بیانیے پر بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے لیے کرداروں کا انتخاب اپنی اردگرد کی زندگی سے کرتے ہیں۔انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا میں انتہائی مصروفیت میں گزارا مگر اپنی جڑوں سے جڑے رہنے کی خواہش ان میں بدرجہ اتم موجود ہے جس کا بین ثبوت تو یہ ہے کہ وہ اردو میں لکھتے ہیں دوسرے اس موضوع پر کہ اپنی زبان و تہذیب کا تحفظ کس قدر ضروری ہے ان کا افسانہ ''خالی دامن'' ایک مثالی افسانہ کہا جاسکتا ہے۔اپنی اقدار سے جڑے رہنے کی اس خواہش کو وہ ایک افسانے ہی میں بیان کرسکتے تھے جس میں دو ایسے گھرانوں کا موازنہ کیا گیا ہے جس میں ایک گھرانا اپنے معاشروں کی اعلیٰ قدروں کو فراموش کر بیٹھا ہے مگر وقت کے تھپیڑوں نے اسے حقیقت سے جلد روشناس کرادیا۔ڈاکٹر فیروز عالم کے افسانوں میں رجائیت پائی جاتی ہے وہ ''کل'' دنیا کو اچھا دیکھنا چاہتے ہیں۔وہ خیر اور شر کے ٹکراؤ میں خیر کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں اور اپنے افسانوں میں یہی دکھاتے ہیں۔ سماج کی بدترین صورتحال کے باوجود اچھے کی خواہش کرنا ایک اچھے انسان ہونے کی دلیل ہے۔

ہم یہاں تخلیق کار فیروز عالم کے افسانوں کے ذریعے سماجی قدروں، رواداری، محنت اور خوبصورتی پر یقین رکھنے والے فیروز عالم تک پہنچتے ہیں جو کہ زندگی کو مزید خوبصورت بنانے کا عندیہ ہی نہیں دیتے بلکہ اپنی مقدور بھر کوشش بھی کرتے ہیں۔ڈاکٹر فیروز عالم کا ایک افسانہ ''کوئی ہم سفر مل جائے گا'' ہے۔اس میں انہوں نے سندھ کے دیہاتی پس منظر میں لکھے اس افسانے میں مصنف نے محبت کے ایک دائرے کو پچیس برس کے طویل وقفے کے بعد مکمل کر کے قاری کو اندھیرے میں روشنی کی کرن دکھا کر مایوسی سے بچا لیا ہے۔افسانے ''خزاں کے گیت'' میں اگرچہ مرکزی کردار ''کیتھرین'' کا برین ٹیومر قاری کو اداس کرتا ہے مگر کیتھرین کا ایک اداس شخص کی زندگی میں مسرت پیدا کرنے کی کوشش سے افسانہ مایوسی بکھیرنے سے بچ بھی جاتا ہے۔ڈاکٹر فیروز عالم اپنے افسانوں میں مسیحا کا کردار کسی اور کردار کی صورت میں بار بار ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ''بکھرے سپنے'' میں ایک ہندوستانی وکیل کی صورت میں ''ناموس کی قیمت'' میں ایک چیپلین کے کردار میں اور ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' میں ایک ڈاکٹر کے کردار میں انسانیت کی خدمت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اس سے افسانہ نگار کی اپنی ذاتی شخصیت کے مثبت پہلوؤں کی جھلک نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم کی ادبی تخلیقات پر گفتگو ہو اور ان کے خودنوشت ''ہوا کے دوش پر'' کا ذکر نہ آئے یہ ہو نہیں سکتا۔اس خودنوشت نے اپنی الگ پہچان بنالی ہے۔اس کو پڑھ کر قاری افسانہ نگار ڈاکٹر فیروز عالم کو زیادہ بہتر طریقے سے جاننے لگتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بہت س لوگ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں دو صفحے بھی نہیں لکھ پاتے۔ فیروز عالم تقریباً پانچ سو صفحات پر اپنی زندگی کے مختلف گوشوں

کو بکھیر دیتے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ گوشے فیروز عالم کے ۱۹۷۰ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ روانگی کے حالات ہیں۔ اس میں امریکہ میں گزرانے پینتالیس سال کا احوال شامل نہیں ہے۔ اس گریز کی کیا وجہ ہے تو خود ڈاکٹر صاحب ہی جانتے ہوں گے۔ گریز کی کئی منزلوں سے تو وہ پہلے بھی گزرے ہیں جس سے ان کی رواداری اور خاندانی شرافت کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔ اور ویسے بھی یہ کسی بھی لکھنے والے کا خود اختیاری کا معاملہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کن گوشوں پر گفتگو کرنا چاہتا ہے اور کن پر نہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم کی خودنوشت ''ہوا کے دوش پر'' بلاشبہ زندگی سے بھر پور ہے۔ یہ ایک ایسے باہمت شخص کی داستانِ حیات ہے جسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر اس نے ان مشکلات کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ انسانی زندگی میں دکھ کئی طرح کے ہوتے ہیں کچھ دکھ قدرت تقدیر کے نام پر انسانی زندگی میں جوڑ دیتی ہے اور انسان اسے قدرت کا لکھا سمجھ کر صبر کر لیتا ہے۔ کچھ دکھ سماج کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ ایسے سماج سے وہ خود کو الگ رکھنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔ کبھی وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے اور کبھی ناکام۔ کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جو سماج میں بسنے والے افراد کسی فرد پر مسلط کر دیتے ہیں، ایسے دکھوں پر نہ صبر کیا جا سکتا ہے نہ ہی انہیں الگ رکھنا ممکن ہو پاتا ہے۔ ایسے دکھ یا تو فرد کی زندگی میں کڑواہٹ گھول دیتے ہیں یا پھر فرد کی بے چینی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ یہ بے چینی انسان کی زندگی میں دور تک سفر کرتی ہے۔ اسے بھلانا مشکل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کی زندگی میں ان دکھوں نے کڑواہٹ نہیں گھولی بلکہ انہیں بے چین کیا ہے۔ اپنی اس بے چینی کا مداوا ڈاکٹر فیروز عالم نے تخلیق کی راہ اپنا کر کیا ہے۔ ان کی بے چینی کو ان کے افسانوں میں صاف دیکھا جا سکتا ہے اور میری نظر میں یہ زندگی کا بہت ہی مثبت پہلو اور رویہ ہے۔ مصوری، شاعری، موسیقی، نثر حتیٰ کہ سائنسی تخلیقات میں بے شمار فن پارے اپنے تخلیق کار کی بے چینی سے ہی نمو پاتے ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم کی تخلیقات کو بھی اس زاویہ سے دیکھنا اور اسی سطح پر پرکھا جانا چاہیے۔

- بقیہ -

''ہم فقیروں سے گفتگو کر لو''

الفاظ میں بتا کر کسی کا دامن داغدار کرنے سے پہلو تہی کرتے ہوئے لکھنا بڑے کمال کا کام ہے۔ فیروز بھائی کے قلم کو یہ ہنر بدرجہ اتم آتا ہے۔ کتاب کی دوسری بڑی بات یہ ہے کہ فیروز بھائی نے اس میں روزمرہ کے واقعات کو موتیوں کی مالا جیسا پرو کر اسے پڑھنے والے پر بوجھل نہیں کیا۔ کتاب کا تیسرا عمدہ پہلو اس میں لکھی گئی اردو زبان ہے۔ فیروز بھائی کی اردو تحریر اتنی عمدہ ہے کہ اسے پڑھ کر حقیقت، کہانی، ناول، علمی مضامین اور افسانے میں فرق مٹ جاتا ہے۔ ان کے افسانے حقیقت کا روپ دھارے ہوتے ہیں اور ان کی حقیقت افسانے کا۔ ان کے لکھے ہوئے طبی مضامین میں بھی ناول کا سا مزہ ہوتا ہے اور یہی ایک لکھاری کا عروج ہے۔ فیروز بھائی اُن چنیدہ لکھاریوں میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ پاک نے علّم بالقلم کہا ہے۔

- بقیہ -

''یادِ ماضی خواب ہے یارب''

تمہاری انگلی چھوڑ نہیں پاتا۔ تمہارے ساتھ جودھپور سے میر پور خاص، حیدر آباد اور پھر کراچی ہر جگہ تمہارے ساتھ دل سے گھومتا چلا جاتا ہے۔ کہیں کہیں مارے حیرت انگلی دانتوں تلے داب لیتا ہے۔ تمہاری گھٹنائیوں پر ملول بھی ہو جاتا ہے اور پھر امدادِ ایزدی پر قلقاریاں بھی مارتا ہے۔ پر کہیں بھی اکتا کر تمہارا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ مجھ سا تمہارا پرستار اب اس اگلے حصے کا منتظر ہے کہ امریکہ یعنی دیارِ غیر میں تم پر کیا گزری۔ ہم کالے تو ویسے بھی فراخ دل ہوتے ہیں کہ بآسانی مغلوب بھی ہو جاتے ہیں پر گورے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے والے لوگ ہیں بلکہ دودھ سے مزید مکھن بھی الگ کرنے والے ہیں۔ انہیں تم نے کیسے فتح کیا؟ وہاں کے رنگین و سنگین واقعات کیونکر گزرے۔ عمر کی بناء پر یادداشت متاثر ہوتی جا رہی ہے، راوی کو بھول گیا ہوں پر سنا تھا کہ کسی ہسپتال کے ڈائریکٹر کی صاحبزادی کے ساتھ جناب ڈیٹ پر گئے تھے جس کا اختتام اس خاتون کی اس بات پر ہوا کہ Look Feroz I don't want to sport you۔۔۔ کیا کیا جائے ہم میں سے اکثر اتنے ہی بھولے تھے۔ ''یادوں کی برات'' جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی تھی، شاید ادبی دستاویز بھی ہو پر ہم نے مزہ ''ہوا کے دوش پر'' سے لیا کیونکہ یہ اپنے فیروز کی داستان حیات تھی۔

صرف داستانِ حیات؟؟؟

نعمانہ نجم رضوی
(کراچی)

''ہوا کے دوش پر''۔۔۔ہوا جو مادّے کی لطیف اقسام میں سے ایک ہے لیکن طاقتور اتنی کہ منزلوں کی سمت کا تعین کرتی ہے۔۔۔انسان میں زندگی کا ظہور ہے۔

مگر یہاں تو عجیب بات ہے۔۔۔مصنف نے ہوا کو شکست دے کر خود اپنی منزلوں کا تعین کیا ہے۔انہوں نے تو بادِ مخالف سے ایک کامیاب لڑائی لڑی ہے۔۔۔پھر یہ ہوا کے دوش پر کب ہوا یہ تو خود اپنے دوش پر ہوا نا۔۔۔!

شاعر نے انہی کے لیے تو کہا ہے:

تندئ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے

جہاں تک کتاب کے طرزِ بیان کا تعلق ہے تو بہت سی گہری گہری باتیں صاحب کتاب ہوا کی طرح نہایت لطیف پیرائے میں بیان کر گئے ہیں۔یہ کسی ایک شخص کی داستانِ حیات کب ہے؟ یہ تو کئی لوگوں کی داستانِ حیات ہے۔

اگر غور کریں تو مصنف نے اپنے خاندان کے کئی لوگوں کی مکمل اور جامع لیکن مختصر سوانح حیات اس میں قلمبند کی ہیں اور قاری غیر محسوس طریقے سے بغیر ربط ٹوٹے کئی سوانح عمریوں کا مطالعہ کر جاتا ہے۔

کیا واقعی یہ صرف ایک ''سوانح حیات'' ہے؟

یہ تو میر پور خاص اور راجستھان کی مختصر تاریخ اور جغرافیہ پر مبنی کوئی کتاب ہے۔میرا خیال ہے کہ آج کل کے نوجوانوں اور اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے کبھی میر پور خاص نہیں دیکھا۔اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میر پور خاص شہر کی ایک مکمل ثقافتی، علمی، معاشی، جغرافیائی اور تہذیبی تصویر اُن کے سامنے آجاتی ہے۔کم از کم میر پور خاص کی تو یہ ایک مختصر مکمل اور جامع تاریخ ہے۔

آپ اب بھی سمجھتے ہیں کہ یہ صرف ایک سوانح حیات ہے؟ یا پھر اے آر خاتون کا کوئی ناول! جس میں بڑے بڑے اور اجتماعی خاندانی نظام کے پیار، محبت، چھوٹی چھوٹی چپقلشیں لیکن پھر بھی برقرار ہم آہنگی کو اجاگر کیا جاتا ہو۔۔۔یا پھر حسینہ معین کا کوئی ہلکا پھلکا آس کی چھیڑ چھاڑ اور عورتوں کی مضبوطی کو مرکزِ نگاہ بنانے والا کوئی ڈرامہ۔۔۔

جہاں مصنف نے اپنی نوعمری کے دور میں عشق کی واردات کا حال نہایت ہی دلچسپ اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔۔۔یا پھر کسی ایسے جفاکش اور مستحکم ارادوں کے شخص کی داستان ہے جنہیں تاریخ ہیرو بنا دیتی ہے اور آنے والی نسلوں کو اُن کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں تا کہ اُن میں وہ اُمنگ اور ولولہ پیدا ہو سکے جو تقدیروں کو تبدیل کر دیا کرتے ہیں۔

فرق صرف اتنا ہے کہ وہ نہایت خشک انداز میں بیان کی جاتی ہیں اور یہاں دلچسپی ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

یا یہ ایک عظیم ماں کی شان میں بیان کیا جانے والا کوئی قصیدہ ہے جس میں بلاشبہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ماں کی تربیت، وسیع النظری، بلند حوصلہ جفاکشی، مثبت سوچ اور ان سب سے بڑھ کر ''دعائیں'' ہی اولادوں کی قسمتیں بدل دیا کرتی ہیں اور ایک گھر کو ہزار مسائل کے باوجود جوڑے رکھتی ہیں۔کیونکہ اس تجربے سے نہ صرف مصنف بلکہ میں خود بھی گزر رہی ہوں۔

پورے خاندان کا اتحاد اور یگانگت کس طرح مخالف حالات کو موافق بناتی ہے خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

تمام کتاب پڑھ لینے کے دوران نہ روانی ٹوٹتی ہے اور نہ دلچسپی اور تجسس۔مزے کی بات یہ ہے کہ آپ جتنی بار پڑھیں دلچسپی ختم نہیں ہوتی۔حالانکہ یہ ڈرامہ نہیں ہے لیکن پھر بھی آپ تمام مقامات اور اس وقت کے حالات کو اپنی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چلتا ہوا پائیں گے اور یوں محسوس ہوگا جیسے آپ خود موجود ہوں۔غیر ضروری طوالت سے اجتناب اور سلاست شاید مصنف کی پہچان ہیں۔

آخر میں، میں بتاؤں کہ مصنف اور کوئی نہیں میرے سگے اور اکلوتے چچا ڈاکٹر فیروز عالم ہیں۔یہ کہانی میرے اپنے خاندان کی ہے جو شاید میں نے بچپن سے ہزاروں دفعہ سُنی ہوگی۔لیکن اتنے ربط اور مصدقہ طور پر ہر ہر واقعہ میں محسوس کروں گی یہ نہیں سوچا تھا۔

میں یہ تو جانتی تھی کہ میرے چچا نہایت باصلاحیت اور منفرد قسم کے انسان ہیں لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ اُن کی شخصیت اتنی ہمہ جہت ہے۔وہ نہ صرف ایک بہترین ڈاکٹر ہیں بلکہ ایک زبردست Fighter، راہ میں آنے والی ہر چٹان کو بآسانی اُڑ کر عبور کرنے والے، بلند حوصلہ تحریر میں ادب کی ہر صنف کو تھوڑا تھوڑا چھونے کی صلاحیت رکھنے والے پھر بھی مبالغہ آرائی سے پرہیز کرنے والے اور قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلنے والے ہیں۔

اندر سے نہایت مشرقی لیکن مغرب میں جا کر وہاں کے ماحول میں اپنی حدود و قیود کو برقرار رکھ کر رچ بس جانے والے ہی کا نام فیروز عالم ہو سکتا ہے۔

اتفاق

ابنِ انشاء فرماتے ہیں کہ مجھ میں اور میری بیوی میں بڑا عجیب سا اتفاق ہے۔نیند کی گولیاں وہ کھاتی ہے اور سکون مجھے ملتا ہے۔

☆

قطرہ قطرہ زندگی

ڈاکٹر فیروز عالم

لنڈا جانسن سے تیسری اور تفصیلی ملاقات کر کے میں ابھی ابھی گھر آیا ہوں۔اس نے مجھے ایک بار پھر پورے یقین اور اعتماد سے بتایا ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر قائم ہے اور اس سلسلے میں مجھے اپنا قانونی اور اخلاقی فرض ادا کرنا ہوگا۔

یہ میرے لئے ایک مشکل لمحہ ہے اور میں سخت ذہنی کشمکش میں گرفتار ہوں۔ایسے میں مجھے کافی کے ایک تلخ پیالے کی طلب ہے۔شام ہو چلی ہے۔ ڈھلتے سورج کی کرنیں میری اسٹڈی میں ہر چیز کو منور کئے ہیں اور نیچے بحرالکاہل کا پانی ساحل کی روپہلی ریت پر جیسے پگھلا ہوا سونا بکھیر رہا ہے۔

میں سوچ رہا ہوں۔ بیتے ہوئے بہت سے دن جیسے پرت پرت ہوکر میرے سامنے کھل رہے ہوں۔مگر یہ میری نہیں لنڈا کی کہانی ہے۔مجھے لنڈا کے متعلق فیصلہ کرنا ہے۔لنڈا جسے پچھلے ہفتے ہی پچیسواں سال لگا ہے۔میں خود اسکی چوبیسویں سالگرہ میں شریک تھا۔

سالوں پہلے، بلکہ اگر صحیح شمار کیا جائے تو اکتیس سال پہلے جب میں نے مشیگن میں ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم مکمل کی تو میں ایک ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں میں اپنی پریکٹس شروع کروں اور پھر وہیں کا ہو رہوں۔میرے ذہن میں ایک چھوٹا سا خوبصورت ساحلی شہر تھا جو بیحد سرسبز ہو اور جسکا موسم مجھے مشیگن کی قیامت خیز سردی کی یاد بھلا دے۔میری خواہش تھی کہ میں کیلی فورنیا کے کسی ساحلی شہر میں آباد ہو جاؤں مگر اس زمانے میں غیر ملکی ڈاکٹروں کے کیلی فورنیا میں پریکٹس کرنے میں ناقابل عبور دشواریاں حائل تھیں۔اپنی اس تلاش میں میں نے امریکہ کے مغربی ساحل کا سفر اختیار کیا۔یہ ساحل دنیا کے خوبصورت ترین مقامات میں شامل ہے اور جگہ جگہ اسکے دلنواز نظارے مسافر کے قدم روکتے ہیں۔سمندر کے کنارے بل کھاتی ساحلی شاہراہ کبھی کئی سو فٹ اونچی گھاٹیوں سے گزرتی ہوئی نشیب میں کٹے پھٹے ساحل کا منظر پیش کرتی ہے تو کبھی سمندر اور اسکے ریتیلے کنارے کے اس قدر قریب سے گذرتی ہے کہ چہرے پر تند و تیز لہروں کی پھوار محسوس ہونے لگے۔

سفر کے دوران مختلف اسپتالوں میں میرے انٹرویوز بھی تھے۔آخر میں نے امریکہ کے مغربی ساحل پر واقع ریاست آریگن کا یہ چھوٹا شہر اپنے لئے منتخب کیا۔یہ شہر بحرالکاہل کے کنارے تھا اور پہاڑیوں میں گھرا تھا۔شہر بیحد سرسبز تھا اور پہاڑوں کے ڈھلان پر صنوبر، چنار اور اوک کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ڈاکٹروں کی کمی تھی اس لئے مقامی آبادی نے نہ صرف میرا پرجوش استقبال کیا بلکہ پریکٹس شروع کرنے میں فراخ دلی سے میری مالی امداد بھی کی۔میرا شعبہ جنرل پریکٹس تھا اور اس میں بچوں کی پیدائیش بھی شامل تھی۔

امریکہ کے چھوٹے شہروں میں جنرل پریکٹس کرنے والے ڈاکٹروں کا ایک خاص مقام ہے۔شہری انہیں بیک وقت معالج، دوست، رہبر اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے ہیں۔خاص طور پر زندگی کے مشکل مسائل میں وہ ان پر اسی قدر اعتماد کرتے ہیں اور ان سے ایسا ہی مشورہ طلب کرتے ہیں جیسا وہ کسی روحانی پیشوا یا ماہر نفسیات سے کرتے۔میری اپنی فطرت میں بھی لوگوں سے گھل مل جانے اور انکے دکھ درد سننے کی صلاحیت ہے اس لئے میں بہت جلد کمیونٹی میں مقبول ہو گیا۔

جانسن فیملی سے میری اسی زمانے میں پہلی ملاقات ہوئی۔مسٹر جانسن انشورنس کا کاروبار کرتے تھے۔انکا ایک چھوٹا سا گھر تھا جو شہر کے پرانے مگر باوقار حصے میں واقع تھا۔انکی بیگم بھاری بدن کی خاتون تھیں جنکے گالوں پر ہر وقت گلابی شعلے سے دہکتے رہتے۔دھوپ میں تو چند منٹ بھی نہیں رہ سکتی تھیں۔خود ہی شرمندہ سی ہو کر کہتیں کیا کروں میری جلد آئیر لینڈ کی سستی جلد ہے۔انکے پہلے ہی دو پیارے پیارے بیٹے تھے۔دونوں نارمل تھے اور ابتدائی اسکول میں پڑھ رہے تھے۔

ایسے میں جب وہ ایک دن میری کلنک میں معائینے کے لئے آئیں تو میں نے انہیں یہ خبر سنائی کے انکے یہاں ایک نئے مہمان کے آنے کی توقع ہے۔انکے گال کچھ اور سرخ ہو گئے۔خوشی سے کہنے لگیں ''کیا یقیناً؟؟'' میں نے کہا کہ میں ٹیسٹ بھیج دیتا ہوں کل تک اسکی تصدیق ہو جائیگی۔دوسرے دن اس کی تصدیق ہو گئی کہ جانسن کنبے میں چند ماہ بعد ایک نئے فرد کا اضافہ ہو جائیگا۔مسٹر جانسن بھی بیحد خوش تھے۔ دراصل دونوں ایک بیٹی کے طلب گار تھے۔دونوں بیٹے بڑے ہو رہے تھے اور انکی مالی حالت بھی اطمنان بخش تھی اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس خبر سے خوش نہ ہوتے۔

مسز جانسن حسب روائیت وقفے وقفے سے میرے پاس معائینے کے لئے آتی رہیں اور میں متواتر ٹیسٹ کر کے یہ دیکھتا رہا کہ ہر چیز نارمل ہے۔انکو اس سے بڑی تسلی ہو جاتی تھی اس دور میں بچے کی جنس بتانا یا شکم مادر کے اندر بچے کے ایسے ٹیسٹ کرنا جس سے کسی مخفی بیماری کا پتہ چل سکے ممکن نہیں تھا۔آخر ایک رات مسٹر جانسن نے مجھے فون کیا کہ وہ اپنی اہلیہ کو ہسپتال لے جا رہے ہیں۔میں بھی فوراً تیار ہو کر اپنی فوکس ویگن میں اونچی نیچی اور بل کھاتی سڑکوں سے ہوتا ہسپتال پہنچا۔مسز جانسن کا چہرہ خوشی اور امید سے دمک رہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی درد کی کیفیت سے انکے چہرے کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔انہوں نے میرا ہاتھ دبا کر کہا ''ڈاکٹر دعا کرو کہ میرے بیٹی ہو۔'' میں نے انہیں تسلی دی اور نرس کو انجکشن لگانے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر بعد لیبر روم کی فضا ایک صحت مند بچی کے رونے کی آواز سے گونج اٹھی۔نرس نے بڑھ کر نومولود کو ٹاول میں لپیٹا۔مسز جانسن کو صحت مند، نارمل اور خوبصورت بچی کی نوید سنائی گئی اور مبارکباد دی گئی۔میں نے باہر جا کر مسٹر جانسن کو بتایا کہ وہ ایک خوبصورت بچی کے باپ بن گئے ہیں۔انہوں نے پرجوش انداز سے مجھ سے مصافحہ کیا اور دیر تک میرے ہاتھ کو دبا کر میرا شکریہ ادا کرتے رہے۔یہ تھی لنڈا جانسن کی پیدائیش جو میرے ہی ہاتھوں ہوئی تھی۔

لنڈا ایک پیاری اور ذہین بچی تھی اس نے شروع میں نارمل انداز سے نشو ونما اختیار کی اس لئے میں اس کی طرف سے بہت مطمئن تھا مگر جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو ہم نے محسوس کیا کہ اسے اٹھنے یا کھڑے ہونے میں دشواری ہو تی ہے۔ وہ ذہنی طور پر بہت چست تھی اور ہر چیز جلد سیکھ رہی تھی مگر ایسا لگتا تھا کہ اس کو اپنے جسم پر اختیار نہیں۔ وہ کبھی اپنے کو گھسیٹتی تھی اور کبھی اٹھتے ہوئے کئی طرح کے بل کھاتی تھی۔ قدرتی طور پر اس کے ماں باپ اس صورت حال سے بڑا پریشان تھے۔ میں نے مقامی طور پر جو ٹیسٹ دستیاب تھے وہ کئے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ فزیکل تھیراپی بھی کی گئی مگر اس سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔

مجھے محسوس ہوا کہ معاملہ سنگین ہے۔ میں نے مسٹر جانسن سے کہا کہ اسے آریگن کے بڑے شہر پورٹ لینڈ کے یونیورسٹی ہسپتال میں دکھانا ضروری ہے۔ میں نے ہی تمام انتظامات کئے اور وہاں عضلات واعصاب کے ماہر سے لنڈا کے معائنے کا وقت مقرر کیا۔ لنڈا کو فوراً ہسپتال میں داخل کیا گیا اور درجنوں ٹیسٹ کئے گئے۔ نتیجہ بہت دلشکن اور افسوسناک تھا لنڈا اعضلات (پٹھوں) کی ایک ایسی بیماری میں مبتلا تھی جسکا کوئی علاج نہیں۔ اس بیماری کو سب سے پہلے فرانس کے ایک ماہر ڈاکٹر نے دریافت کیا تھا مگر آج کئی سو سال گزرنے کے بعد بھی اسکا کوئی علاج نہیں ہے۔ ایک زمانے میں تو ایسے بچے بارہ پندرہ سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو جاتے تھے مگر اب یہ مزید کئی سال زندہ رہ سکتے ہیں۔ پھر بھی معذوری انکا مقدر ہے اور ایک طویل زندگی انکے نصیب میں نہیں۔

مسٹر جانسن کی فیملی اس خبر سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی مگر وہ باہمت لوگ تھے۔ مسز جانسن کہنے لگیں میں اس بچی پر بہت محنت کروں گی۔ جیسا اور جس قسم کا بھی علاج ممکن ہے ہم وہ کروائینگے اور کیا معلوم آئیندہ سالوں میں اسکا کوئی حتمی علاج نکل ہی آئے۔ وہ لنڈا کے سلسلے میں میری مکمل مدد، رہبری اور سپورٹ چاہتی تھیں۔ انہیں اس بات سے ذرا اطمنان تھا کہ لنڈا ذہنی طور پر نہ صرف نارمل تھی بلکہ بڑی حد تک ذہین تھی۔ انکے خیال میں نفسیاتی اور ذہنی قوت جسمانی طور پر اپاہج ہونے پر حاوی ہو سکتی ہے انہیں یقین تھا کہ لنڈا ایک پر مقصد زندگی گذار سکتی ہے چاہے وہ زندگی کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو۔

لنڈا نے اپنے اپاہج پن سے مفاہمت کر لی تھی۔ اس نے چیزوں کے سہارے اٹھنا سیکھ لیا تھا۔ اب اسکے اسکول جانے کا زمانہ تھا۔ خوش قسمتی سے امریکہ میں ایسے بچوں کے لئے اسکول بس میں خاص انتظامات ہوتے ہیں اور اسے پہیوں والی کرسی اور بیساکھیوں کے ذریعہ اسکول لایا اور لیجایا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی کھیل کے وقفے میں جب سب بچے اسکول کے میدان میں کھیلنے اور کلکاریاں مارنے میں مشغول ہوتے وہ اپنی ویل چئر پر بیٹھی انہیں حسرت سے تکا کرتی تھی۔ کبھی کبھی اسکو خوش کرنے اسکی استانی اسکی گود میں بھی بال پھینک دیا کرتی اور وہ بیٹھے بیٹھے ہی کچھ دیر کو خوش ہو جاتی۔ اسکول کا یہ تمام عرصہ اگرچہ تعلیمی طور پر اس نے کامیابی سے گذارا مگر جذباتی طور پر یہ اس کے لئے انتہائی تکلیف دہ اور دل شکن تھا۔ میں جب بھی اس سے ملتا وہ مجھے اپنے دکھوں میں شریک کرتی۔ ہر مریض کی طرح وہ بھی یہی پوچھتی ''میرے ساتھ یہ کیوں۔۔سب بچے تو نارمل ہیں اور کھیلتے کودتے ہیں؟''

اس کے لئے سب سے مشکل وقت وہ تھا جب ہائی اسکول میں بچے بلوغت میں قدم رکھتے ہیں۔ امریکی کلچر میں یہ ایک خاص دور ہے اور اس زمانے میں بچوں میں خود نمائی، اپنی جسمانی خوبصورتی اور دوسروں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے۔ اس زمانے میں تو نارمل اور اچھے بھلے لگنے والے بچے بھی احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں وہ تو پھر اپاہج تھی مگر سائیکوتھراپی اور کچھ اسکی اپنی پر اعتماد فطرت نے اسکی مدد کی اور اس نے کسی طرح خود کو سنبھالے رکھا۔ آخر اسنے ہائی اسکول پاس کر کے کمیونٹی کالج میں داخلہ لے لیا۔ کالج کا دور نسبتاً بہتر تھا۔ وہ نہ صرف اپنی تعلیم سے مطمئن تھی بلکہ جس قدر ممکن تھا کالج کی دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگی تھی۔ ایک دن جب میں اس سے ملا تو اسکے چہرے پر ایک جلا تھی، رخساروں پر گلابی دمک اور آنکھوں میں خصوصی چمک تھی۔ اس نے مجھے پر جوش انداز میں بتایا کہ اب اسکا ایک بوائے فرینڈ ہے جو اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ جیک خود بھی ویل چئر میں ہے۔ بچپن میں کسی حادثے میں اسکی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ کالج میں اسکا ہم جماعت ہے۔ دونوں کے خیالات ملتے ہیں اور وہ گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ مجھے لگا اب لنڈا کو جینے کا سہارا مل گیا ہے۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ اسکی بیماری بھی دن بدن بڑھ رہی تھی اور جو کام وہ پہلے کر سکتی تھی رفتہ رفتہ اب وہ ان سے بھی معذور ہوتی جا رہی تھی۔ پھر بیماری کے نتیجے میں دوسری پیچیدگیاں بھی سر اٹھا رہی تھیں۔ بار بار بخار چڑھتا تھا۔ کبھی پھیپڑوں میں پانی اتر تا تھا کبھی نمونیا ہو جاتا تھا۔ ویل چئر اور بیساکھیوں کی وجہ سے جسم پر زخم پڑنے شروع ہو گئے تھے اور کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ کالج کا دور اور اس کے بعد کا زمانہ سخت تکلیف میں گذرا اور ہر روز ایک نئی آزمائش تھی۔

انہی دنوں ریاست آریگن میں یہ تحریک چلی کہ ان مریضوں کو جنکی بیماری ناقابل علاج ہے اور جنکی زندگی دردناک حالات سے گزر رہی ہو اس بات کا اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے مکمل ہوش وحواس میں اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیں اور انکے ڈاکٹر اس بات کے قانونی طور پر پابند ہوں کہ وہ انکی اس مقصد میں مکمل مدد کریں۔ ڈاکٹروں کے لئے یہ ناقابل قبول تھا کہ وہ مریضوں کو انکی خودکشی کے سامان فراہم کریں۔ کئی سال کی شدید بحث اور اس قرارداد کی مخالفت اور حمایت میں پر زور مظاہروں کے بعد یہ تجویز عوام کے سامنے رائے شماری کے لئے پیش کی گئی۔ سارے ملک کی نظر آریگن پر تھیں کہ ایسی ہی تجاویز دوسری ریاستوں میں بھی زیر غور تھیں۔ لوگوں کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی جب ایک بھاری اکثریت نے اس تجویز کو قبول کیا اور ڈاکٹروں کو اس کا پابند کر دیا گیا کہ وہ اس صورتحال میں مریض کی خواہش کا احترام کریں۔

یہی مسئلہ آج میرے سامنے تھا۔

لنڈا پچھلے ایک سال سے مجھ سے اپنی زندگی کا ایک وسیع تناظر میں تذکرہ کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ قدرتی طور بھی اب اسکے پاس زیادہ وقت نہیں۔ وہ عام اندازے سے زیادہ جی چکی ہے۔ اب ہر لحہ اسے موت سے نزدیک لے جا رہا ہے اور اسکو یقین تھا کہ باقی سفر تکلیف اور دشواریوں سے پر ہے یہ سفر ابھی کتنا باقی ہے اور اسے ابھی کتنے درد سہنے ہیں کسی کو نہیں معلوم۔ جب نتیجہ اس قدر یقینی ہو تو پھر یہ سفر جلد ہی کیوں نہ ختم کیا جائے۔ اسکے بقول وہ اپنی زندگی کے ڈرامے پر اب آخری پردہ ڈالنا چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اب کوئی پچھتاوہ نہیں تھا۔ وہ اب بھی یقین رکھتی تھی کہ زندگی ایک خوبصورت شے ہے ۔اسکو اس بات کی مسرت تھی اور وہ اس بات پر فخر کرتی تھی کہ قدرت نے جیسی بھی زندگی اسکی جھولی میں ڈالی تھی اس نے اس سے مکمل فائدہ اٹھایا اور اپنے تیئں ایک بھرپور زندگی گذاری۔ مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا'' ڈاکٹر!! کچھ کہانیاں مختصر بھی ہوتی ہیں۔۔ میری زندگی کی کہانی مختصر ہی صحیح، مگر ہے پراثر۔۔ کیوں؟ ہے کہ نہیں؟''

میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنا فیصلہ بدلنے پر تیار تھی۔ قانون کے تحت میں نے اس سے کئی ملاقاتیں کیں اور انکا ریکارڈ رکھا۔ اسے نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھایا گیا اور اسکے پادری کو بھی اس میں شامل کیا گیا مگر اس نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں ایسی کسی صورتحال سے دوچار ہوا تھا۔ میں نے کاؤنٹی میڈیکل سوسائٹی کو فون کر کے معلوم کیا تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ یہ میری قانونی ذمہ داری ہے کہ میں لنڈا کی خواہش کا احترام کروں۔ آج میری اس سے آخری ملاقات تھی اور اسکی خواہش کے مطابق اب مجھے اپنا فرض نبھانا تھا۔

اس مقصد کے لئے سنیچر کی رات طے ہوئی۔ جب میں اسکے گھر پہنچا تو ماحول حسب معمول تھا گھر کی فضا پرسکون تھی۔ سٹنگ روم میں اسکے ماں باپ بیٹھے تھے۔ لنڈا اپنی ویل چئر پر تھی اسکے داہنی جانب جیک، اسکا بوائے فرینڈ اسکا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر عام خوشگوار سی باتیں ہوئیں۔ کچھ تصویریں اتاری گئیں۔ پھر لنڈا ہی نے کہا'' ڈاکٹر اب آپ آگے بڑھیں''۔ میں نے اسکی طرف دیکھا، اسکا چہرا پرسکون تھا۔ میں اور اسکی ماں کچن میں گئے جہاں چھوٹی میز پر بیٹھ کر میں نے نیند کے پچاس کیپسول کھول کر ایپل سوس (سیب کا پسا ہوا مربہ) میں ملائیں۔ یہ ترکیب مجھے میڈیکل سوسائٹی ہی نے بتائی تھی۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ لنڈا جو میرے ہی ہاتھوں اس دنیا میں آئی تھی آج میں ہی اسکی رخصتی کا سامان فراہم کر رہا تھا۔ مگر میں قانون کے ہاتھوں مجبور تھا۔ ایک سادہ سے کھانے کے بعد میٹھے کے طور پر جب ہم سب نے ایپل سوس کھائی تو لنڈا نے بھی اپنی ایپل سوس کو خوشی سے حلق سے اتار لیا۔

تھوڑی دیر بعد اس پر نیند طاری ہونے لگی۔ اسنے ہم سب کی طرف دیکھا۔ اپنے والدین کو دیکھ کر انکا شکریہ ادا کیا ماں باپ نے اسے بوسہ دیا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا'' تم ایک بہت اچھے ڈاکٹر ہو۔۔ ایسے ہی رہنا'' اور اپنی ماں سے کہا'' مام۔۔ میری کرسی گھسیٹ کر میری خواب گاہ میں پہنچا دو'' تھوڑی دور جا کر اسنے پلٹ کر دیکھا اور اور مسکراتے ہوئے کہا'' شب بخیر''۔ میں وہاں مزید نہیں رک سکتا تھا۔ بمشکل کار چلاتا واپس گھر آیا۔ کیسے نیند آئی معلوم نہیں۔

صبح میری آنکھ مسز جانسن کے فون سے کھلی وہ رندھے ہوئے گلے اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھیں'' ڈاکٹر کیا تمہارے پاس آج موت کے تصدیق نامہ پر دستخط کرنے کا وقت ہوگا؟؟''

بقیہ : ''الکحل یا شراب''

الکحل دراصل ایک کیمیائی زہر ہے جو جگر کو تباہ کرتا ہے، ہڈیوں کے گودے کو خون بنانے کے قابل نہیں چھوڑتا، معدے میں السر کا سبب ہوتا ہے اور معدے کے پاس موجود ایک غدود میں سوزش کی وجہ سے ہلاکت کا باعث بھی ہوسکتا ہے۔ الکحل کا استعمال جسم میں غذائی قلت اور مختلف قسم کی وٹامنز اور پروٹین کی کمی کا سبب بھی ہے۔ اس سے جسم کی عام قوتِ مدافعت بھی کم ہو جاتی ہے اور شراب استعمال کرنے والے لوگ نمونیا کا بھی شکار ہوتے ہیں۔

الکحل کے فائدے

الکحل تیار کرنے والی کمپنیاں اس کو پروموٹ کرنے والی ایجنسیاں، اس کی تعریف میں مدح میں صفحے کے صفحے کالے کرنے والے شاعر اور ادیب اور چرچ کے منبر پر کھڑے ہو کر ڈرامائی انداز میں اس کے جام کو بلند کرنے والے راہب بھی طبی طور پر اس کے کسی فائدہ مند اثرات کو ثابت نہیں کر سکے ہیں۔ اب گزشتہ چند سالوں میں چند مضامین کچھ مقتدر طبی جرائد میں ایسے شائع ہوئے ہیں جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک خاص قسم کی سرخ وائن میں فولاد کی مقدار انسان کے لیے فائدہ مند ہوسکتی ہے اور اس کے استعمال سے ہارٹ اٹیک کی شرح میں کمی ممکن ہے۔ اس کے جواب میں یہ دلیل وزنی لگتی ہے کہ اس کے لامتناہی نقصانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر اس فائدہ کو تسلیم بھی کر لیا جائے لیکن شراب کے فائدے اور نقصانات کو تولا جائے تو نقصانات کا پلڑا اس قدر بھاری ہوگا کہ مذکورہ بالا چند ممکنہ فائدے اس کے استعمال کو طبی طور پر جائز قرار نہیں دے سکتے۔

الغرض، مذہبی اعتقادات سے قطع نظر، الکحل انسانی جسم کے لیے طبی طور پر ایک نقصان دہ اور مضر کیمیائی عنصر ہے اور تمام زہریلے عناصر کی طرح اس سے پرہیز اچھی صحت کے لیے ضروری ہے۔

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

حصہ دوئم

گزشتہ جلد میں میں نے اس جملے پر کہانی کا اختتام کیا تھا کہ۔۔۔میں نے اللہ کا نام لیکر جہاز کی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔ یہ پی آئی اے کا جہاز تھا جو لندن کی پرواز کے لئے تیار تھا؛ جہاز عمارت سے کافی دور تھا اور ڈھا کہ سے آ رہا تھا۔ میں اس سے پہلے کبھی جہاز میں نہیں بیٹھا تھا اور میں نے جہاز کے سفر کا بہت رومانٹک تصور باندھا تھا مگر اندر گھستے ہی وہ تصور چکنا چور ہو گیا۔ جہاز میں شدید گرمی اور اسقدر حبس اور گھٹن تھی کہ سانس لینا مشکل تھا۔ اسکے علاوہ جہاز اسقدر بھرا ہوا تھا جیسے کراچی کی بسیں، تازہ ہوا نہ ہونے سے ماحول میں سخت پسینے کی بو تھی مجھے بتایا گیا کہ جب تک جہاز ٹیک آف کے بعد مکمل بلندی پر نہیں پہنچ جائیگا ائر کنڈیشن پوری طرح موثر نہیں ہو پائیگا۔ دوسرا اچنبھا یہ ہوا کہ میں نے سوچا اور سنا تھا کہ جہاز ہوا میں تیرتا ہوا جاتا ہے اسلئے پرواز بیحد ہموار ہوتی ہے مگر تھوڑی ہی دیر بعد جہاز بُری طرح جھٹکے کھانے لگا جس سے مجھے بہت خوف آیا۔ بہرحال کوئی ساڑھے چار گھنٹے کے بعد ہم عراق کے دارالحکومت بغداد پر اترے مسافر مستقر کی عمارت میں گئے کافی اور سینڈوچ سے ہماری تواضع کی گئی۔ میں ہمیشہ سوچتا ہوں کہ پاکستان سے باہر جس سرزمین پر سب سے پہلے میرے قدم پڑے تھے وہ بغداد کی سرزمین تھی۔

جہاز کا دوسرا پڑاؤ جرمنی کا شہر فرینفرٹ تھا اور اسکے بعد پیرس، اس وقت پیرس کا ہوائی اڈہ بہت معمولی تھا اور آخر کار کچھ ہی دیر بعد ہم لندن پر پرواز کر رہے تھے یہ صبح سات بجے کا وقت تھا، جہاز نیچے آ گیا تھا اور لندن کی عمارتیں نظر آ رہی تھیں میں بہت جذباتی ہو گیا کہ اس شہر کو دیکھنے کی تمنا بچپن سے تھی اور جو میرے کنبے کے مالی حالات تھے مجھے کبھی یہ امید نہ تھی کہ میں لندن دیکھ پاؤں گا۔

کچھ دیر بعد ہم زمین پر تھے، کسٹم سے نکل کر جب میں باہر نکلا تو مجھے میرا دوست ڈاکٹر چندر کہیں نظر نہ آیا۔ اسکا وعدہ تھا کہ وہ مجھے لینے وہاں ہوگا۔ میری جیب میں صرف پانچ پاؤنڈ کا نوٹ تھا اس لئے میں بہت پریشان ہوا، کافی انتظار کے بعد بھی جب وہ نہیں آیا تو میں نے ایک ٹیکسی والے کو اس کے ہسپتال کا پتہ بتا کر وہاں لے جانے کی درخواست کی مگر وہ میری انگریزی کا لہجہ نہ سمجھ سکا، بہرحال اس نے کہا مجھے لکھا ہوا پتہ دکھاؤ، مجھے کچھ جھنجلاہٹ اور شرمندگی ہوئی کیونکہ مجھے اپنی انگریزی بولنے کی صلاحیت پر بڑا ناز تھا، بہرحال وہ مجھے لندن کی نہایت پتلی اور کچھ گہری سبز اور سیاہ رائی زدہ عمارتوں کے درمیان گلیوں سے گزارتا ہوا بہت قدیم سرخ اینٹوں کی بنی، قدرے غلیظ عمارت کے سامنے اُتار گیا کہ یہی سینٹ لینارڈ ہسپتال تھا۔ میں بیحد مایوس ہوا۔

بہرحال میں نے اندر جا کر چندر کے بارے میں پوچھا تو بتایا گیا وہ ہسپتال میں نہیں ہے۔ ایک سینئر نرس نے بتایا کہ وہ ہسپتال کی سب سے اوپری منزل پر ایک کمرے میں رہتے ہیں وہ کمال کا بھروسے کا زمانہ تا۔ اس نے میری بات پر یقین کر لیا اور وہ مجھے اس کے کمرے میں لے گئی اور ماسٹر چابی سے تالا کھول کر مجھے کمرے میں بٹھا دیا۔ میں نیند اور تھکن سے نڈھال تھا فوراً ہی چندر کے بستر پر پڑ کر ایسی گہری نیند سویا کہ کئی گھنٹوں کے بعد چندر نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ اس نے کہا وہ تو ائرپورٹ پر تھا مگر کسی وجہ سے مجھ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ وہ سمجھا میں آیا ہی نہیں ہوں مایوس ہو کر واپس آیا تو مجھے اپنے کمرے میں اپنے بستر میں سوتا ہوا پایا۔ ہم بہت ہنسے وہ کچھ حیران ہوا کہ میں خود ہی صحیح پتے پر پہنچ گیا۔

چندر لندن کے جس محلے میں رہتا تھا اس کے نزدیک ٹرین کا لیور پول اسٹریٹ اسٹیشن تھا جو بہت بڑا تھا اور اس کے نیچے ''ٹیوب'' کا بھی پلیٹ فارم تھا یہ سب حیران کن تھا۔ میں نے لندن کے زیرزمین گاڑیوں کا بڑا ذکر سنا تھا جنہیں ٹیوب کہتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ کوئی ٹیوب ہوتا ہوگا جس میں سے گاڑیاں گذرتی ہیں مگر یہ تو ایک عام سی سرنگ تھی جس میں ٹرین کی لائینیں بچھی تھیں۔ میں سیڑھیوں سے پلیٹ فارم سے اتر رہا تھا کہ ایک ٹرین آ کر رکی، میں تیزی سے اسکی جانب دوڑا کہ کہیں گاڑی چھوٹ نہ جائے پھر اگلی گاڑی نہ جانے کتنی دیر بعد آئے، چندر نے مسکراہٹ سے میرا ہاتھ پکڑ کر روکا اور کہا اگلی گاڑی تین منٹ میں آئے گی۔ یہ میرے لئے بہت ہی حیرت کی بات تھی کیونکہ میرپورخاص سے حیدرآباد کی گاڑی ہر گھنٹے پر چلتی تھی جسے ہم بہت جلدی سمجھتے تھے۔ اس کے بعد ہم لندن کی مشہور جگہوں جیسے پیکاڈلی سرکس اور ٹرافالگر چوک گئے اور دیر تک شہر کی سیر کی، دریائے ٹیمز پر بجرے چل رہے تھے ٹکٹ لیکر ان میں بھی سواری کی۔ لندن کی سیر یا سفرنامے پر تو پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے اور لکھی گئی ہے اس لئے میں اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔ لیکن یہاں اپنا یہ تاثر ضرور لکھنا چاہتا ہوں کہ اس زمانے میں کراچی کی سڑکیں بہت چوڑی، پختہ اور صاف ستھری تھیں اور انکے درمیان گھاس کے سبز قطعات لگے تھے اس لئے لندن کی انتہائی پتلی اور تنگ گلیاں اور پرانی سرخ اینٹوں کی عمارتیں بہت مایوس کُن لگیں اور مجھے کراچی جسے میں چھوڑ آیا تھا۔ لندن سے کہیں اچھا لگا۔

لندن سے امریکا کو روانگی

لندن میں پانچ دن رہنے کے بعد میں امریکا کے لئے روانہ ہوا۔ میرا ٹکٹ جاپان ائرلائین کا تھا جو مجھے نیویارک لے کر جاتی اور اسکے بعد نیویارک سے امریکن ائرلائین سے مجھے ڈیٹرائٹ جانا تھا۔ جہاز بہت صاف ستھرا تھا اور چونکہ وہ ہوائی اڈے کی عمارت سے ایک سرنگ کے ذریعہ جڑا ہوا تھا اس لئے

اسکا ائر کنڈیشن بہت اچھی طرح چل رہا تھا۔اس میں نہایت خوشگوار ٹھنڈک تھی۔زیادہ تر مسافر گورے تھے اور ماحول بہت اچھا تھا۔ نیو یارک تک کا سفر ساڑھے چھ گھنٹے کا تھا اس لئے راستے میں دو انگریزی فلمیں بھی دکھائی گئی۔لندن سے پرواز کرتے ہی بحر اوقیانوس کا وسیع سمندر شروع ہوتا ہے اور نیو یارک کے ساحل تک بس صرف سمندر ہی سمندر ہوتا ہے دن کی فلائیٹ تھی مگر نیچے دیکھنے کو سوائے نیلے پانی کے کچھ نہ تھا۔ مجھے اس بات کا شکرانے کے ساتھ احساس تھا کہ میں بڑا خوش نصیب ہوں کیونکہ اس زمانے میں پاکستان کے بہت کم لوگوں کو یہ موقع نصیب ہوتا ہے کہ وہ لندن سے آگے امریکا جاسکیں۔

نیو یارک کا وقت لندن سے پانچ گھنٹے پیچھے ہے یعنی جب لندن میں شام کے پانچ بجے ہوتے ہیں تو نیو یارک میں دوپہر کے بارہ بجتے ہیں۔تو جب میں وہاں اترا تو مجھے کچھ گھنٹوں کا فائدہ ہوگیا۔نیو یارک کا کینیڈی ائر پورٹ ایک مکمل اور شہر جتنا بڑا لگا۔وہ عجب زمانہ تھا(آج کل ان سہولتوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا) چونکہ مجھے امریکن ائرلائین کی فلائیٹ پکڑنی تھی اور اسکا ٹرمنل کافی دور تھا تو مجھے حیرت ہوئی کہ میرا استقبال کرنے کو جاپان ائر لائین کا نمائیندہ ایک گتے کے بورڈ پر جس پر میرا نام لکھا تھا کھڑا تھا اسنے کہا باہر کار کھڑی ہے اور میں آپکو وہاں پہنچادونگا۔باہر اتنی بڑی کار کھڑی تھی، میں نے اتنی بڑی کار نہیں دیکھی تھی بہر حال مجھے گیٹ تک پہنچا کر وہ میرے لئے نیک خواہشات کا اظہار کر کے چلا گیا۔یہ بھی میرے لئے نئی چیز تھی کہ کوئی غیر ملکی شخص میرے لئے ایسی خواہشات کا اظہار کرے۔اب مجھے معلوم ہے کہ یہ تو امریکی اخلاقیات ہے کے سودا خریدتے وقت جب لڑکی آپ کے حوالے تھیلا کرتی ہے تو خواہشات کا اظہار کرتی ہے۔دو گھنٹے کی پرواز پر میں ڈیٹرائیٹ کے ہوائی اڈے پر تھا۔ ڈیٹرائیٹ امریکا کا تیسرا بڑا شہر ہے اور دنیا میں کاریں بنانے کی فیکٹریوں کی وجہ سے مشہور تھا(اس زمانے میں کاروں کی تیاری اور فروخت میں جاپان کو کوئی نام ونشان نہ تھا)۔یہاں بھی ایک گول مٹول سی نہایت سرخ وسفید امریکی عورت میرے لئے کھڑی تھی۔وہ مجھے لیکر ''گریس ہسپتال'' کی طرف۔یہ یونیورسٹی ہسپتال تھا جس نے مجھے سکالرشپ پر امریکا بلایا تھا۔ایک بہت بڑی اور چوڑی سڑک پر کار نہایت تیز رفتاری سے چل رہی تھی اور راستے میں بار بار ہرے رنگ کے بورڈ آتے تھے جن پر EXIT لکھا تھا۔یہ سب میرے لئے حیران کن باتیں تھیں۔یہ ''ایکسپرس وے'' جو میں نے پہلی دفعہ دیکھی۔کافی دیر بعد ہماری منزل آگئی۔یہ ایک جدید عمارت تھی۔وہ مجھے لیکر لفٹ سے چوتھی منزل پر آئی اور کمرہ نمبر۴۰۲ کھولکر پہلے مجھے داخل ہونے کے لئے کہا۔کمرہ بہت ہی خوبصورتی سے آراستہ تھا بستر کے نزدیک ایک چھوٹا فرج تھا اور بہت بڑی کھڑکی پر بردہ پڑا تھا۔اس نے رسی کھینچ کر پردے کو ایک جانب کیا، میں نے جھانک کر دیکھا دور دور تک بلند اور خوبصورت عمارتیں تھیں جن میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔یہ سب میرے لئے نیا تھا کیونکہ مجھے پاکستان چھوڑے صرف دو دن ہوئے تھے اور اس سے پہلے میں کبھی پاکستان سے باہر نہیں گیا تھا۔مگر میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ فوراً سو گیا۔وہ خاتون مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ صبح ہسپتال کی کیفیٹیریا میں ناشتہ مفت ہے میں وہاں جا کر ناشتہ کرسکتا ہوں۔

صبح جلد آنکھ کھل گئی،اب دن میں آس پاس کا نظارہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ چہار طرف سیاہ فام افراد کا ایک سمندر تھا، دراصل امریکا کے زیادہ تر یونیورسٹی ہسپتال شہر کے ان حصوں میں قائم ہیں جو سیاہ فام لوگوں کی بستیاں ہیں۔ تیار ہو کر میں ہسپتال کی جانب چلا دو سڑکیں پار کر کے ہسپتال تھا۔ ہماری رہائش گاہ تو بہت ہی جدید تھی مگر ہسپتال کی عمارت بیحد بوسیدہ اور پرانی تھی۔اندر داخل ہوا تو وارڈس بھی پرانے اور بوسیدہ تھے۔مجھے تو ذہنی جھٹکا لگا اس لئے کہ کراچی کا سیونتھ ڈے ہسپتال جہاں سے میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی شروع کی تھی، بہت ہی خوبصورت اور جدید تھا اور اس سے پہلے لیاقت میڈیکل کالج بھی بہت ہی خوبصورت اور صاف ستھرا تھا(میں یہیں لکھ دوں کہ واقعی وہ عمارت ڈیڑھ سو سال پرانی تھی اور دو ہی سال بعد اسے مکمل طور پر مسمار کر دیا گیا اور اسی سرزمین پر ایک بہت ہی شاندار اور قابل دید ہسپتال قائم کر دیا گیا)

کیفیٹیریا میں بہت ہجوم تھا کاؤنٹر پر درجنوں قسم کے کھانے پینے کی چیزیں سجی تھیں۔دوسری طرف سیاہ فام ویٹرس پیلے ایپرن باندھے سر پر ٹوپیاں لگائے اور ہاتھوں پر دستانے سجائے کھانا دے رہی تھیں۔ہسپتال کے عملے میں نوے فیصد گورے تھے خاص طور سے نرسیں سب گوری تھیں۔میں کسی کو نہیں جانتا تھا میں اپنی ٹرے لیکر ایک میز پر بیٹھ گیا مگر مجھے اکیلے دیکھ کر از راہِ اخلاق دو نرسیں اور دو گورے ٹیکنیشن میرا ساتھ دینے میرے قریب بیٹھ گئے اور مجھ سے تعارف کے بعد مجھے خوش آمدید کیا اور پیشکش کی کہ اگر کسی قسم کی ضرورت ہو تو ان سے کہوں۔مجھے یہ پہلی صبح بہت اچھی لگی اور خاص طور سے سب کا برتاؤ بھی مجھے اچھا لگا اور اس سے میرا حوصلہ بڑھا۔

شہر اور ہسپتال

ہسپتال پرانا تھا مگر اس میں اس وقت کے موجودہ دور کی تمام سہولتیں موجود تھیں اور اس میں چند ایسے شعبے بھی تھے جو ابھی تک پاکستان میں متعارف نہیں ہوئے تھے۔اسی طرح مریضوں کے ٹیسٹ کرنے کی ایسی مشینیں بھی تھیں جنہیں ہم نے صرف اپنی امریکا یا انگلینڈ کی چھپی کتابوں ہی میں پڑھا تھا۔اس زمانے میں سارے پروفیسر اور دوسرے اساتذہ امریکی تھے(اب ۴۸ سال بعد امیگریشن کی فراخ دل پالیسی کی وجہ سے غیر ملکی اس شعبے میں،خاص طور سے ہندو پاکستان کے ڈاکٹر نمایاں ہیں)۔

ہمیں نو بجے مرکزی ہال میں تعارفی لیکچر کی لئے جمع ہونا تھا۔میں جیسے ہی داخل ہوا ایک پاکستانی لڑکا تیزی سے میری طرف آیا اور اپنا نام خالد لطیف بتا کر نہایت گرمجوشی سے میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگا تم یقیناً فیروز عالم ہو۔میں نے کہا ہاں۔اس نے کہا کہ وہ میرا انتظار کر رہا تھا وہ دو دن پہلے آچکا تھا اور لسٹ پر میرا نام دیکھ چکا تھا۔اس سال کی کلاس میں صرف ہم دو پاکستانی تھے۔اس دن سے ہم دوست اور وطن سے دوری میں ایک دوسرے کا سہارا بن گئے۔آج

اڑتالیس سال بعد بھی ہم دوست ہیں اور رابطے میں ہیں اگرچہ اب ہم دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔

ڈیٹرائیٹ بڑا دلچسپ شہر تھا، یہ ڈیٹرائیٹ دریا کے کنارے تھا۔ دریا کا دوسرا کنارہ کینیڈا کے شہر ونڈسر کا حصہ تھا۔ دریا کے کئی سوفٹ نیچے ایک سرنگ بنائی گئی تھی جس میں ایک وسیع سڑک تھی جس کے ذریعہ لوگ اپنی کار میں آسانی سے کینیڈا جاتے تھے۔ صبح کے وقت کینیڈا سے کئی سولوگ ڈیٹرائیٹ کی فیکٹریوں میں کام کرنے کے لئے یہاں آتے تھے اور شام کو واپس چلے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ دریا کے اوپر بھی ایک بہت لمبا پل بنا ہوا تھا جس پر دونوں شہروں کے بیچ آمدورفت رہتی تھی۔ ہم تیسری دنیا کے لڑکوں کے لئے ایک تو یہ چیز حیران کن تھی کہ جب آپ دریا کے اِس طرف ٹہل رہے ہوتے ہیں تو دریا کے دوسرے کنارے پر جہاں روشنیاں اور عمارتیں جگمگا رہی تھیں ایک دوسرے آزاد ملک کا رچا بسا شہر آباد ہے۔ دوسرے جب ہم دریا کے نیچے سے گذرنے والی سرنگ میں کار سے سفر کرتے تھے تو یہ چیز ہمیں حیران کرتی تھی کہ اوپر ایک بہت بڑا دریا بہہ رہا ہے جس کے اندر یوروپ اور تمام دنیا سے آئے ہوئے بڑے بڑے جہاز چل رہے ہیں۔۔ پھر یہ بھی کہ یہ سرنگ کوئی سوسال پہلے بنی تھی۔ امریکا کی اس ٹیکنالوجی سے ہم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

لٹ گئے

میں اور خالد لطیف ہسپتال کی ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد بہت بور ہوتے تھے۔ سورج تقریباً دس بجے غروب ہوتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ ہمارے پاس کار نہیں تھی بلکہ ہم دونوں کو کار چلانی بھی نہیں آتی تھی۔ وقت نہیں گذرتا تھا۔ کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ ہم نے اس دریا اور اس کے کنارے بنے خوبصورت پارک کے بارے میں سنا تھا۔ یہ ہمارے ہاسٹل سے صرف ایک میل پر تھا۔ ایک دن ہم نے سوچا کہ پیدل ہی نکل جائیں بس ایک سیدھی سڑک اس دریا تک جاتی تھی، اگرچہ ہمیں بتایا گیا تھا یہ علاقہ جرائم کا اڈہ ہے ان گلیوں میں بالکل باہر نہ نکلیں اس لئے کہ وہ مکمل طور پر سیاہ فام لوگوں کا علاقہ تھا اور دن دہاڑے وہاں لوٹ مار ہوتی تھی اور چاقو چھریاں اور گولیاں چلنے کی وارداتیں ہوتی تھی مگر ہم نوجوان تھے اور افروایشیائی اتحاد کے طرفدار اور نسلی تعاصب کے سخت خلاف تھے ہم نے سوچا یہ کمینے گورے بیکار میں ہمیں ان کالوں سے بدزن کر رہے ہیں یہ تو ہمارے دوست ہیں۔ ہم پیدل ہی نکل پڑے۔ غلطی یہ کی کہ جو بڑی اور نسبتاً آباد سڑک دریا تک جاتی تھی اس کے بجائے ہم راستہ چھوٹا کرنے کے لئے اندرونی گلیوں میں گھس گئے۔ یہاں عجب ماحول تھا، چوراہوں پر سیاہ فام نوجوان بئیر کے گلاس لئے جھوم رہے تھے اور ہنسی مزاق کر رہے تھے۔ سیاہ فام لوگوں کا ایک سیلاب تھا اور خوشگوار موسم کی وجہ سے تقریباً ہر شخص باہر تھا۔ کچھ گھروں کے برآمدوں پر جھولوں پر بوڑھے بیٹھے ہوئے شراب پی رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ ہمیں خطرے کا احساس ہوا مگر اب ہم اس علاقے میں پھنس گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ کرتے چار انتہائی کیم شہیم کالے لڑکے ہم پر جھپٹے۔ ہم بھاگے وہ بھی ہمارے پیچھے بھاگے اور چند ہی قدم بعد وہ اچھل کر ہم پر گرے ہمیں نیچے دبا لیا، ہمارا بٹوا، میری گھڑی اور پاس پورٹ خالد کی بھی یہی چیزیں چھینیں کچھ گھونسے اور لاتیں ماریں۔ اور دوڑتے ہوئے دور نکلنے لگے میں چیخا کہ میرا پاسپورٹ تو دیدو (وہ پاسپورٹ کو بھی والٹ سمجھ رہے تھے کیونکہ اس زمانے میں پاکستانی پاسپورٹ چمڑے کی جلد میں ہوتا تھا، ایک لڑکے نے پاسپورٹ پھینکا، ہم چیخے ہمیں بچاؤ مگر کسی نے کوئی مدد نہیں کی۔ ہم دہشت زدہ ہوگئے۔ لڑکھڑاتے قدموں سے کچھ دور چلے تو وہیں پولس تھانہ تھا۔ ہم وہاں پہنچے۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ پولس آفیسر نے کہا خیر ہوئی کم از کم کوئی کاری چوٹ نہیں لگی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ امریکا ہے ہماری شکایت پر پورے محلے کو پولس اپنے گھیرے میں لے لیگی اور اوپر سے ہیلی کاپٹر چکر لگا کر ان لڑکوں کو گرفتار کر لینگے۔ میرے اس حیرت کا اظہار کرنے پر پولس انسپکٹر ہنسا اس نے کہا یہ تو دن میں پچاس بار ہوتا ہے، ہم تمہیں پولس کار میں حفاظت سے ہوسٹل پہنچا دیتے ہیں اور آئندہ خیال رکھنا۔ اس ناخوشگوار واقعے کے اثرات اب بھی قائم ہیں اور ہم کالوں کے علاقے سے دور ہی رہتے ہیں۔

ڈیٹرائیٹ شہر کا نقشہ دلچسپ تھا۔ دریا کے متاوازی ہر میل پر ایک سڑک تھی جو فاصلے کے لحاظ سے پانچ میل روڈ، چھ میل روڈ، ساتھ میل روڈ اور اسطرح بائیس میل روڈ تک جاتی تھی۔ ان سڑکوں کو عمودی طور پر کئی سڑکیں کاٹتی تھی مگر مرکزی سڑک جو شہر کو مغربی اور مشرقی حصوں میں تقسیم کرتی تھی اسکا نام ''وڈ ورڈ WOOWDWARD AVE'' کہتے تھے۔ جس علاقے میں ہمارا یونیورسٹی ہسپتال تھا وہ اکثریتی طور پر سیاہ فام بستی تھی اس لئے بہت اچھی نہ تھی۔ کوئی ایک ہفتے بعد میرے یہ کہنے پر کہ یار یہ امریکا ہے اس سے تو کراچی زیادہ صاف ستھرا تھا تو ایک ہندوستانی لڑکا مجھے شہر دکھانے لے نکلا۔ اس نے ہمیں شہر کے اچھے علاقے دکھائے جو رؤسا کے تھے یعنی جہاں ہنری فورڈ اور مسٹر ڈاج رہتے تھے۔ ان علاقوں کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں یہ علاقے جھیلوں کے کنارے تھے اور اسقدر سرسبز تھے کہ لگتا تھا کہ قدرت نے اپنی فیاضی کے دروازے کھول دئے ہیں۔ جھیلیں اسقدر نیلی اور شفاف تھیں کے انکی تہہ میں سنگریزے نظر آتے تھے۔ ان جھیلوں پر رنگ برنگے بادبانوں والی کشتیاں چل رہی تھیں اور کچھ تیز رفتار کشتیوں کے پیچھے لمبے کمبت جوتے پہنے لوگ پانی پر پھسلتے ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے جو سندھ کے ریگزاروں سے آیا تھا یہ نظارے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے پھر صفائی کا یہ عالم تھا کہ ایک فالتو پرزہ یا پتہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے بعد ڈیٹرائیٹ کے دوسرے علاقے بھی دیکھے حتیٰ کہ درمیانہ طبقے کے لوگوں کے محلے بھی اسی قدر صاف اور خوبصورت تھے۔ معیار زندگی کا یہ عالم تھا کہ ہمارے کیفیٹیریا میں سروس کرنے والی کالی عورتیں بھی اپنی کار میں آتی تھیں۔ ہسپتال میں ''سر'' کہنے کا رواج نہیں تھا اور طلبہ بھی پروفیسر کو ڈاکٹر اور پھر اسکے نام سے پکارتے تھے جیسے ''ڈاکٹر ایڈورڈ''۔ مساوات کی ایک مثال پاکستانی قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی۔ ہمارے شعبے کا سربراہ ڈاکٹر مائر جو بین الاقوامی شہرت کا حامل تھا صبح صبح کیفیٹیریا میں کالی کافی پیتا تھا۔ وہیں ایک گورا

لمبے ڈنڈے کے ساتھ فرش پر پوچھا مارتا تھا۔ جب وہ پوچھا مار چکتا تھا تو وہ بھی اپنی کافی لیکر اس کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کافی پیتا تھا اور گذرے دن کے بیس بال کے میچ پر تبصرہ کرتا تھا۔ یہ چیز عام ہے ہماری ملازمہ کام کرتے ہوئے جب لنچ کا وقت ہوتا ہے تو اپنا لنچ باکس اور تھرماس نکال کر ہماری چھوٹی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا شروع کرتی ہے اور میری بیگم شائستہ کو بھی مدعو کرتی ہے کہ اسکا ساتھ دیں اور کبھی کبھی شائستہ اسکا ساتھ بھی دیتی ہیں۔ ٹریننگ اچھی چل رہی تھی اور ہفتے میں ایک دن دلچسپ مریضوں پر کانفرنس ہوتی تھی۔ لیکچرس بھی ہوتے تھے اور مختلف چیزیں جیسے ایکس ریز اور ای کے جی وغیرہ بھی دکھائے جاتے تھے۔

ایک نئے لڑکے سے ملاقات

میرے ساتھ کھانے کا بڑا مسئلہ تھا کیوں کہ امریکی بے مزہ اور روکھے پھیکے کھانے نہیں کھائے جاتے تھے۔ اللہ نے اسکا حل نکا دیا۔ ایک دن میں لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا کہ لفٹ کھلی اور ایک دیسی ڈاکٹر باہر نکلا۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا اور بہت ہی بے تکلفی سے اردو میں بولا ''تو نیا نیا آیا ہے'' میں نے گڑ بڑا کر کہا ہاں۔ کہنے لگا تو کہاں سے آیا ہے، میں نے کہا پاکستان سے۔ گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا میں بھی، مجھ سے نام پوچھا میں نے بتایا، پھر میں نے نام پوچھا کہنے لگا ''پریم چند کھلی نانی'' مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میں سندھ کے جس شہر سے آیا تھا وہاں بہت سندھی ہندو تھا اور میرے اپنے کئی دوست ہندو تھا۔ اس نے بتایا وہ کراچی سے تھا اور ڈاؤ میڈیکل کالج کا گریجویٹ تھا مجھ سے پانچ سال سینئر تھا اور کینسر میں سپیشلسٹ بن رہا تھا۔ ڈاکٹر کھل نانی نے میرا اور خالد کا بہت ساتھ دیا۔ بالکل بڑا بھائی بن گیا، ہمارے پاس کار نہیں تھی وہ ہمیں جگہ جگہ لئے پھرتا۔ پھر وہ پکا بھجیا بھات کھانے والا تھا اس لئے وہ کھانا خود پکاتا تھا اور بڑے مزے کی پاکستانی بھجیاں دال، چاول اور دوسری چیزیں بناتا تھا اور ہم اسکے ساتھ کھانا کھانے لگے۔ اگرچہ ہسپتال نے ہمارے لئے کار چلانا سکھانے کے لئے ڈرائیور کا انتظام کر دیا تھا مگر شام کو پریکٹس کے لئے وہ ہمیں اپنی کار میں لے جاتا تھا ہم اب بھی اسکے دوست ہیں اور اس کی بڑی عزت کرتے ہیں اور میں جب ڈیٹرائیٹ جاتا ہوں تو ضرور ایک شام مجھے مدعو کرتا ہے۔ بعد میں ہم نے بھی کھانا پکانا سیکھ لیا اس لئے میرے کھانے کی مشکل حل ہوگئی۔

پہلی برفباری اور اس سے پہلے بھوتوں اور چڑیلوں کا فیسٹیول

ہوسکتا ہے کہ آج کے قارئین کے لئے یہ سب کچھ غیر دلچسپ ہو کیونکہ دنیا سمٹ گئی ہے اور ٹیلی وژن پر لوگوں کو سب کچھ کو معلوم ہوگیا ہے کہ امریکا میں کس قسم کے تہوار ہوتے ہیں مگر میں ۱۹۷۰ کی بات کر رہا ہوں جب یہ تمام باتیں نئی اور حیرت انگیز تھیں (کراچی میں ۱۹۸۰ میں بہت سوں کو پیزا PIZZA معلوم نہیں تھا)

موسم خزاں آ گیا تھا اور پتے رنگ بدل رہے تھے۔ یہ منظر قیامت خیز تھا۔ مشی گن بہت سرسبز ہے اور گھنے جنگلات ہیں۔ خزاں میں یہ درخت رنگ بدلتے ہیں، کچھ لال سرخ ہوجاتے ہیں کچھ پیلے، کچھ نارنجی اور کچھ اب بھی سبز رہتے۔ پھر جھیلوں کے کنارے لگے ان درختوں کے رنگ برنگے پتوں کا عکس نیلے پانیوں پر پڑتا ہے تو عجب بہار ہوتی ہے۔ امریکا میں رواج ہے کہ لوگ صرف خزاں کے رنگ دیکھنے قافلوں میں نکل جاتے ہیں۔ میں بھی ان سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اکتوبر کے آخیر میں میں نے دیکھا کہ بہت سے گھروں کے باہر بھوتوں اور چڑیلوں کے پتلے لٹکے تھے اور کچھ گھروں کے سبزے پر مصنوعی قبریں بنی ہوئی تھیں عجب ڈراونی چیزیں تھیں میں نے امریکی دوستوں سے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو بتایا گیا کہ یہ ہالوئین کا تہوار ہے اور اکتیس اکتوبر کو بچے ڈراونے کپڑے پہن کر ہر دروازے پر جا کر چھیڑ چھاڑ کرینگے اور چاکلیٹس لیں گے۔ میرے بچوں نے بھی یہ تہوار خوب خوب منایا۔

اس کے بعد برفباری کی خبریں آنے لگیں، ہم زیادہ تر تیسری دنیا سے آئے تھے اور ہم نے برفباری نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی مشی گن کی روح فرسا سردی، سب نے ہمیں ڈرایا، گرم کپڑے خریدے گئے اور پھر ایک شام کھل کر برف پڑی ہر چیز نے برف کا لبادہ اوڑھ لیا، درخت سڑکیں گھروں کی چھتیں سب برف میں ڈھک گئیں۔ ہلکے روئی کے گالوں کی طرح برف گر رہی تھی ہم سب باہر نکل آئے اور خوب مزہ لیا، عام طور سے جب برف پڑتی ہے تو بہت زیادہ سردی نہیں ہوتی ہے مگر دوسرے دن شدید سردی ہوتی ہے۔

ماحول میں ایک عجیب چمک ہوتی ہے اس لئے کہ روشنی برف کے ذروں سے منعکس ہوتی ہے۔ صبح اٹھے تو ہاموی کاریں برف سے ڈھکی تھیں ہم نے پہلے ہی کچھ کرچھے اور برش خرید لئے تھے اور ہسپتال جانے سے پہلے اپنی اپنی کاروں کو برف سے صاف کیا۔ اسکے علاوہ جوتوں پر خاص قسم کے ربر کے غلاف چڑھائے، ڈرائیونگ بھی مشکل لگی اس لئے کہ کاریں بار بار برف پر پھسل جاتی تھیں، تو یہ تھا شروع کے سالوں کا تجربہ۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے سندھ کے ریگزاروں سے پہلے مشی گن کے مرغزاروں اور پھر کیلی فورنیا کے کہساروں میں لا آباد کر دیا۔

تنہائی

یہاں میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ شروع کے چند دن گذرنے کے بعد مجھ پر سخت تنہائی اور اداسی طاری ہوگئی۔ یہ دور بڑا مشکل تھا۔ شام چار ساڑھے چار بجے اندھیرا ہوجاتا تھا، سخت سردی اور تیز ہوائیں چلتی تھیں اسقدر سناٹا تھا کہ خوف آتا تھا کھڑکی میں سے جھانکنے پر دور دور صرف گرتی ہوئی برف کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا نہ تو انسان نہ ہی کوئی جانور، ہوتا بھی کیسے کیونکہ موسم اسقدر شدید تھا کہ کسی جاندار کے بچنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ پھر میں شہر میں نیا تھا اسلئے کوئی ملنے والا بھی نہیں تھا، بس حسرت سے فون کو تکتا تھا کہ کاش یہی بج اٹھے مگر اتنے بڑے شہر میں کوئی شناسہ نہیں تھا۔ اس اثنا میں خالد لطیف کی ایک فلی پینی لڑکی سے دوستی ہوگئی تھی اور پھر جلد ہی انکی شادی ہوگئی اس لئے وہ اب مجھے وقت نہیں دے سکتا تھا۔ میں گھنٹوں اپنی کھڑکی سے

نیچے دیکھتا رہتا اور کبھی کبھی زور سے چیخیں مار کر روتا تھا۔ مجھے کراچی کی رونقیں، پاکستان میں اپنے دوست اور میرے گھر والے یعنی ابا اماں اور چھوٹی بہن دردانہ یاد آتی۔ میں بالکل پاگل ہوگیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں یہ سب کچھ چھوڑ کر واپس پاکستان چلا جاؤنگا۔ میرے پاس ایم بی بی ایس کی ڈگری تھی مجھے کراچی میں کہیں نہ کہیں اچھی نوکری مل جائیگی۔ میں یہ مزید برداشت نہیں کرسکتا۔ اس موقعہ پر ایک تو مجھے اپنے کنبے کی کم مائیگی کا احساس ہوتا اور میں سوچتا کہ مجھے اپنے حالات بدلنے کے لئے خود پر قابو پا کر اور دل مار کے یہیں رہنا پڑیگا اس لئے کہ اسی میں میرے کنبے کی بھلائی ہے۔ پھر بھی میں اس منزل پر آ گیا تھا کہ کسی دن بھی استعفیٰ دے کر کراچی واپس چلا جاتا مگر اس مرحلے پر ڈاکٹر کھلنانی نے مجھے بہت سہارا دیا اور قائل کر دیا کہ کم از کم ایک سال گذار دوں سال کے آخیر پر چھٹیوں میں پاکستان جاؤں ادھر میں ویسے بھی اپنی اماں سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ سال سے پہلے پاکستان ضرور آؤنگا۔ میں بڑی بے تابی سے سال کے آخیر کا انتظار کرنے لگا اور آئندہ سال یعنی بیس جون ۱۹۷۱ء کی دوپہر جب شدید بارش پڑ رہی تھی میں ڈیٹرائیٹ کے ہوائی اڈے پر جہاز میں بیٹھا کھڑکی سے باہر جھانک کر شہر کو اس نظر سے دیکھ رہا تھا کہ اب میں اس شہر کو شاید دوبارہ نہ دیکھ سکوں اس لئے کہ میں نے یک طرفہ ٹکٹ لیا تھا اور میں عازم پاکستان تھا۔

پاکستان آنے پر میرا شاندار استقبال ہوا ہوائی اڈے پر خاندان کے بہت لوگ تھے۔ مگر کراچی آ کر مجھے اپنی حقیقت معلوم ہوئی، مالی حالات ابتر تھے، کراچی کی میونسپل ڈسپینسریوں کی ساڑھے تین سو روپوں میں کسی اچھے مستقبل کی امید نہیں تھی نتیجہ یہ کہ میں تین ہفتے بعد دوبارہ ڈیٹرائیٹ جا رہا تھا۔ اس سال پاکستان سے تین لڑکے ڈاکٹر قمر، اشرف اور ایک مشرقی پاکستان کا لڑکا انور آئے تھے میں نے انہیں اپنے پروں میں لے لیا ان کے آنے سے میری بھی تنہائی دور ہوگئی اور میرا کچھ کچھ دل لگ گیا۔ ۱۹۷۱ء کے آخیر میں سقوط ڈھاکا کا سانحہ ہوا جس نے ہم سب پاکستانیوں کو نہ صرف بہت دکھ پہنچایا بلکہ ہمیں اسقدر احساس شرمندگی ہوئی کہ ہم سب سے اور خاص کر ہندوستانیوں سے منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ جنگی قیدیوں کے لئے ہم نے ایک احتجاجی مظاہرہ کیا، اس وقت ڈیٹرائیٹ میں بچوں سمیت پاکستانیوں کی کل تعداد چار سو سے کچھ کم تھی (اب ماشااللہ تقریبا دس ہزار ہے)

اس کے بعد کچھ حالات معمول پر آ گئے انور حالانکہ مشرقی پاکستانی تھا مگر وہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا، ہم امریکا میں بھی کچھ سیٹل ہوگئے تھے۔ اگلے تین سال میں کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا۔ میں ہر سال پاکستان آتا رہا۔ میری ٹریننگ بہت اچھی چل رہی تھی اور میں اپنے بیچ کا (جس میں کئی غیر ملکی اقوام کے لڑکے تھے) سب سے اچھا ڈاکٹر تسلیم کیا جا چکا تھا اور اسی لئے چوتھے سال میں جو ڈگری کا آخری سال تھا مجھے ''چیف ریزی ڈنٹ'' مقرر کیا گیا۔ یہ بہت باعزت پوزیشن تھی اس لئے کہ یہ شعبہ طب کے سربراہ کے نائب یا اسکے نمائندے کی حیثیت رکھتی تھی۔

کچھ ماہ بعد یعنی اگست ۱۹۷۴ء میں ہماری کلاس گریجویٹ ہوگئی۔ یہ ایک قسم کا کانووکیشن تھا جو ایل شاندار ہوٹل میں ہوا۔ زیادہ تر لوگ سیاہ سوٹ اور کالی بوتائی میں تھے، روائت کے لحاظ سے خواتین بھی زرق برق لباس میں تھیں اور ڈنر کے بعد آرکسٹرا کی دھنوں پر والٹز اور فوکس ٹراٹ کے رقص کئے گئے۔ ڈگریاں باٹی گئیں مجھے بھی میری ڈگری دی گئی، یہ شام میری یادوں میں آج بھی زندہ اور تابندہ ہے۔ اسی شام فارغ ہونے والے طلبہ کو مزید ٹریننگ کے لئے کچھ پیشکشیں ہوئیں مجھے بھی امراض قلب میں فیلوشپ پیشکش ہوئی مگر میں واپس پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکا تھا اس لئے میں نے شکریہ کے ساتھ اسے رد کر دیا۔

میں اگست ۱۹۷۴ء میں پاکستان پہنچا۔ میرے پاس امریکا کی اعلیٰ ڈگری تھی مگر امریکا سے سوائے جاپان کے راستے ایک نئی کار لانے کے علاوہ میرے پاس کوئی روپیہ نہیں تھا اس لئے کہ ٹریننگ کے زمانے میں وظیفہ بہت کم تھا اور میں ہر سال پاکستان بھی آتا تھا۔ ہم نے ناظم آباد میں ایک درمیانہ سا گھر کرائے پر لے لیا مگر گھر میں اب بھی صرف چارپائیاں تھیں اور کوئی قابل ذکر فرنیچر نہ تھا۔ نوکری کی تلاش ہوئی مگر سخت مایوسی ہوئی اس لئے کہ اس وقت پاکستان میں امریکی ڈگری نہیں مانی جاتی تھی۔ مجھے میرے شفیق استاد پروفیسر صالح میمن نے سندھ کے چھوٹے شہر دادو جانے کی آفر کی مگر بوجوہ میں نے اسے قبول نہیں کیا۔ مجھے میرے سینئر ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ میں رمپا پلازہ پر کمرہ لے کر پریکٹس شروع کر دوں اور ان کے بقول وارے نیارے ہوجائینگے مگر رمپا پر کمرے کی ''پگڑی'' ایک لاکھ روپئے تھی۔ نہ صرف میرے پاس ایک لاکھ روپئے نہیں تھے بلکہ مجھے تو گھر چلانے کے لئے بھی روپئے کی ضرورت تھی۔ مجھے نوید کلینک پر وقتی ملازمت مل گئی تھی مگر یہاں نرسنگ کا معیار بہت خراب تھا اور میں یہاں اڈجسٹ نہیں ہو سکا اس لئے میں نے دو ہفتوں کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ اب میں شدید مشکل میں تھا مالی حالات نہایت ابتر تھے۔۔ مجھے رہ رہ کر امریکا یاد آ رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے واپس امریکا جانا چاہئے۔ میں نے امریکا میں اپنے پروفیسر کو خط لکھا اور صرف اتنا لکھا کہ شاید مجھے واپس آنا پڑے کیا آپ مجھے مشورہ دے سکتے ہیں۔۔ میں کیسے اس کی تعریف کر سکتا ہوں اس کے جواب میں مجھے ایک موٹا لفافہ ملا جس میں مجھے شعبہ میڈیسن میں انسٹرکٹر کی پیشکش تھی اور مکمل کانٹریکٹ کے ساتھ پیشگی رقم اور جہاز کا ٹکٹ تھا۔ میری اماں بہت روئیں کہ تم واپس جا رہے ہو مگر میں نے انہیں سمجھا دیا۔ ادھر میری چھوٹی بہن اور ابا نے کہا کہ بہت ضروری ہے کہ تم کراچی میں کم از کم ایک گھر بنوالو تاکہ ہمارے سر پر ایک چھت ہو۔ اب امریکا میں میری تنخواہ بھی اچھی تھی۔ میں واپس ڈیٹرائیٹ آیا اور پہلا کام یہ کیا کہ قرض لے کر نارتھ ناظم آباد میں بنگلہ بنوانے کے لئے ایک زمین خریدی۔ اس دور میں ڈیٹرائیٹ میں وقت اچھا گذرا، اب یہ شہر میرا جانا پہچانا تھا، پرانے دوست بھی مل گئے تھے اور مالی حالات بھی اچھے تھے۔ میں نے شہر کے سب سے اچھے علاقے میں ایک بہت اچھا اپارٹمنٹ کرائے پر لیا اور اسے بیحد خوبصورتی سے سجایا۔ اس کی بالکنی کے سامنے ایک جھیل تھی جس میں

سفید ہنس تیرا کرتے تھے، میں شام کو اس بالکنی میں بیٹھ کر انکا نظارہ کرتا تھا۔ میں نے کراچی میں گھر کی تعمیر جسکی دیکھ بھال میرے بہنوئی اظہار بھائی کر رہے تھے، کے اخراجات کے لئے پارٹ ٹائم ملازمت بھی کر لی تھی۔

میں جب بھی شکاگو جاتا تھا تو مجھے ایک تو وہ شہر بہت اچھا لگتا تھا دوسرے وہاں میرے کچھ رشتہ دار بھی آ گئے تھے اس لئے میرا وہاں بہت دل لگتا تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں وہاں منتقل ہو جاؤں۔ یہ اپریل ۱۹۷۶ تھا۔ شکاگو کے ایک بہت ہی شاندار ہسپتال کا اشتہار نظر سے گذرا انہیں اپنے ایک شعبہ کے سربراہ کے لئے ضرورت تھی۔ میں تو ابھی تیس سال کا بھی نہیں تھا اور انہیں تجربہ کار ڈاکٹر چاہئے تھا۔ مگر میں نے اس کے لئے قسمت آزمائی کا ارادہ کیا، مجھے معلوم تھا کہ ایسی ملازمتیں امریکا میں صرف ذاتی رابطوں سے ملتی ہیں میں نے اپنے باس جو یہودی تھا اور مجھے بہت چاہتا تھا سے کہا کہ وہ شکاگو میں ہسپتال کے ڈائرکٹر کو فون کرے کیونکہ اگر میں صرف درخواست بھیجونگا تو وہ ردی کی ٹوکری کے حوالے ہو جائیگی۔ میرے باس نے شکاگو فون کر کے وہاں ڈائریکٹر کو فون کر کے میرے بارے میں بتایا۔ مجھے دوسرے دن اسکا فون ملا کہ وہ مجھے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیج رہا ہے تاکہ میں انٹرویو دینے آؤں۔ میں شکاگو گیا، ڈاکٹر شیفرڈ سے ملا جو خود بھی یہودی تھا مگر نہایت ایماندار اور ملازمت دینے کے معاملے میں دیانتدار اور فرشتہ خصلت انسان تھا مجھ سے متاثر ہوا اور دو دن بعد اس نے مجھے ملازمت دے دی۔ یہ بہت اعلیٰ پوزیشن تھی اور اسکی تنخواہ ڈیٹرائیٹ سے دگنی تھی۔ میں جولائی ۱۹۷۶ میں شکاگو منتقل ہو گیا شروع میں دس دن وسیم اور نوشی کے یہاں رہا اور پھر اپنے نئے اپارٹمنٹ میں آ گیا، یہاں میرے کزن منصور اور عابد بھی تھے اس لئے دل بھی لگ گیا۔

میں شکاگو کے اس ہسپتال میں گیارہ سال رہا اور نہ صرف اللہ تعالیٰ نے اس دور میں بہت عزت دی بلکہ میں اپنے طلبہ میں بہت ہر دلعزیز بھی ہوا۔ اس کے علاوہ میری مالی حالت بھی بہت اچھی ہو گئی۔ اس عرصے میں میں اپنی والدہ سے ملنے اور اپنا وعدہ نبھانے کے لئے ہر سال پاکستان بھی جاتا رہا۔ پھر دنیا کے حالات بھی بدل رہے تھے اور امریکا کی فرخدلانہ امیگریشن پالیسی کی وجہ سے بے شمار لوگ پاکستان سے شکاگو آ کر بس گئے تو سماجی طور پر بھی ہم تارکین وطن کی ضروریات بھی بدرجہ اتم پوری ہونے لگیں۔

شکاگو کے دور میں مجھے یونیورسٹی آف الی نوائے کے میڈیکل کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کا رتبہ بھی مل گیا اور میں انڈر گریجویٹ کے علاوہ پوسٹ گریجویٹ کلاسیں بھی لینے لگا۔ مجھے یونیورسٹی کی اکیڈیمک کانسل کے بھی کئی اجلاسوں میں شریک ہونے کا موقعہ ملا اور مجھے یہ ذمہ داری بھی سونپ دی گئی کہ امریکن بورڈ کے امتحان میں بیٹھنے والے امیدواروں کے کاغذات کی بھی تصدیق کروں۔ اس زمانے میں انتہائی نگہداشت کا شعبہ نسبتاً نیا تھا اور ہمارے ہسپتال میں اس وقت تک INTENSIVIST تعینات نہیں ہوا تھا اس لئے مجھے اسکی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی اور میں اس وارڈ کے مریضوں کو بھی دیکھ نے لگا تھا۔ غرض میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی سے بیحد مطمئن تھا اور خدائے تعالیٰ کے شکرانے ادا کرتا تھا کہ اس نے مجھے یہ سب کچھ عطا کیا تھا۔

میرے ابا کا انتقال

میرا خیال ہے کہ ہر وہ شخص جو ملک چھوڑ کر باہر گیا ہے اس کے ذہن کے کسی کونے میں ہر وقت یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں گھر سے کوئی بری خبر نہ آ جائے۔ خاص طور سے اگر تارک وطن کے ماں باپ بڑھاپے کا شکار ہوں۔ میرا دل بھی دھڑکتا رہتا تھا کہ کہیں کوئی بری خبر نہ آ جائے۔ سرکاری کاغذات میں میری تاریخ پیدائش ۱۹۴۳ اکتوبر لکھی ہے۔ بارہ اکتوبر کی رات کو میں اپنے کزن وسیم اور نوشی کے گھر بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا اس لئے کہ کراچی میں اس دن نوشی کی چھوٹی بہن رضوانہ کی منگنی تھی جس میں میرے ابا اور اماں بھی شریک تھے۔ بہت ہی پر مسرت ماحول تھا باتوں میں دیر ہو گئی، پھر میرا گھر بھی دور تھا میں کوئی بارہ بجے رات گھر پہنچا اور جلد ہی گہری نیند سو گیا۔ تقریباً رات دو بجے میرے دروازے کی گھنٹی بجی، میں گہری نیند میں تھا کئی گھنٹیوں کے بعد آنکھ کھلی، یا اللہ خیر کون ہو سکتا ہے۔ میں نے اٹھ کر دیکھا نوشی اور وسیم دروازے پر کھڑے تھے میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا خیریت تو ہے انہوں نے کہا نہیں خیریت نہیں ہے۔ میں گرنے والا تھا میں نے دروازہ پکڑ لیا۔۔۔ میری اماں کی صحت خراب رہتی تھی اور وہ بہت کمزور رتھیں۔ میں نے اتنا ہی کہا ''کیا۔۔اماں؟'' نوشی نے کہا ''خالو جی'' وہ میرے ابا کو خالو جی کہتی تھی۔ اف آج اس لمحے کو ۴۲ سال گذر گئے ہیں مگر میں یہ لکھتے ہوئے اسی وقت میں واپس پہنچ گیا ہوں اور لگتا ہے کسی نے ایک نوکیلا خنجر میرے سینے میں اتار دیا ہو۔ اس لئے بھی کہ میں نے تو چند گھنٹے پہلے ان سے بات کی تھی۔ وہ بیمار بھی نہیں تھے۔ میں خود پر قابو نہیں پا سکا اور دہاڑ دہاڑ کر رونے لگا، بس اسکے بعد سونا تو ممکن نہیں تھا۔ صبح کیسے ہوئی میں نے پہلی فلائیٹ پکڑی اور کراچی کے لئے روانہ ہو گیا راستہ کیسے کٹا معلوم نہیں پورے راستے روتا رہا، کئی دفعہ عملے نے پوچھا اور تسلیاں دیں مگر دل کو قرار نہیں آتا تھا۔ میرے ابا نے نہایت پرمشقت زندگی گذاری تھی قدرت نے بہت زیادہ مالی فارغ البالی عطا نہیں کی تھی مگر وہ بیحد محنتی انسان تھے اور انہوں نے ہم بچوں کو جس طرح بھی ممکن تھا آرام اور آسائیشیں فراہم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا چھوڑی تھی دو دو نوکریاں کی تھیں اور یہ سچ تھا کہ انہوں نے روکھی سوکھی کھا کر ہمیں اچھا کھلایا پلایا تھا، میری بڑی خواہش تھی میں کچھ بن کر انکو وہ سب کچھ فراہم کرونگا جس کے وہ حقدار تھے مگر قدرت نے مجھے یہ موقع نہیں دیا۔ انہیں بڑا ارمان تھا کہ ہمارے پاس اپنا مکان اپنی چھت ہو، میں نے ابھی کراچی میں اپنا بنگلہ بنوانا شروع کیا تھا اور بس نیو ہی کھدی تھی اور پلنتھ بن رہی تھی، وہ روز زیر تعمیر بنگلے کو دیکھنے جاتے تھے۔ کچھ فخر اور بے صبری سے اس کے مکمل ہونے کا انتظار کر رہے تھے مگر اللہ نے انہیں اوپر اٹھا لیا۔ مجھے آج بھی اس کا ملال ہے کہ میں انہیں وہ آرام اور وہ زندگی نہ دے سکا جسکا میں نے انکے لئے تصور کیا ہوا تھا اور جس کے وہ صحیح طور پر حقدار تھے۔ میں جب

تک تیس گھنٹے کی پرواز کے بعد کراچی پہنچا تو گھر میں سوئم کی رسم ہورہی تھی۔بس قبر پر جاکر گلاب کی چند پتیاں بکھیرنے اور فاتحہ پڑھنے کے علاوہ کیا کرسکتا تھا، آنسوؤں کے ساتھ انکی مغفرت کی دعا کے ساتھ خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا۔اللہ انکے مرتبے بلند کرے۔آمین۔یہ اتفاق تھا کہ انکا انتقال میری سالگرہ کے دن ہوا،اس دن کے بعد میں نے اپنی سالگرہ منانا ترک کردی۔

میں ابا کی پہلی برسی پر اکتوبر ۱۹۷۷ء میں پاکستان گیا۔اس دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ پہلے قاہرہ جاؤنگا کیونکہ مجھے اہرام مصر دیکھنے کا شوق تھا، پھر وہاں سے عمرہ اور پھر کراچی۔میں اس اثنا میں یورپ کے کئی شہر دیکھ چکا تھا وہاں سیاحت کی بہترین سہولتیں موجود ہیں۔ہوائی اڈے پر سیاحت کے شعبے کے کاؤنٹر ہوتے ہیں جو مطلوبہ کمرہ بک کردیتے ہیں اور وہ ہی ٹیکسی کروا کر ہوٹل تک پہنچوا دیتے ہیں۔میں قاہرہ پر رات کے دو بجے اترا تو ایک بدنظمی کا عالم تھا۔کسی قسم کی سہولت نہ تھی۔عمارت سے باہر نکلا تو ہوٹلوں کے ایجنٹ پاکستان کی طرح ''چار پائی بستر ا'' کی آوازیں لگا رہے تھے۔اور مسافروں کی کھینچا تانی کر رہے تھے۔ایک لمبا چوڑا عرب جو کالے چوغے میں ملبوس تھا اس نے میرا مختصر سامان اٹھایا اور تیزی سے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف دوڑا۔میں اس کے پیچھے پیچھے۔زبان کا الگ مسئلہ تھا۔وہ ایک پرانی پرائیویٹ کار کے قریب پہنچا اور سامان ٹرنک میں رکھ دیا۔مجھے یا اخی یا اخی اور ''نو پرابلم'' کہتے ہوئے مجھے اگلی سیٹ پر بٹھا دیا اور اونچی اونچی آواز میں کچھ کہتے ہوئے ڈرائیور سے چلنے کو کہا۔ابھی ہماری ٹیکسی کچھ ہی دور چلی تھی کہ ایک شخص نے ہاتھ اٹھا کر کار روکی، ایجنٹ نے اس سے بھی کچھ باتیں کیں اور اسے بھی اپنے ساتھ پچھلی سیٹ پر بٹھا لیا۔ائر پورٹ سے شہر کا راستہ ویران تھا، دور شہر کی روشنیاں نظر آرہی تھیں مگر اسنے پہلے ہی ایک موڑ کاٹ کر مزید ویرانی کی طرف جانا شروع کردیا، میں کوشش کررہا تھا کہ اسے سمجھاؤں مگر یہ ممکن نہ تھا۔میں بیحد خوف زدہ تھا۔وہ برابر ''نو پرابلم'' کہہ رہا تھا۔معلوم ہوا کہ اس نے اس مسافر کو بھی بٹھا لیا تھا جسے کسی کچی آبادی میں چھوڑنا تھا۔بہر حال اسے اتارنے کے بعد کار پھر پہلی سڑک پر آئی اور آخر ہم شہر میں داخل ہوئے۔ہم ایک تپلی اور تاریک گلی میں ایک عمارت کے سامنے رکے مگر اس پر کسی ہوٹل کا بورڈ نہیں تھا۔ وہ تپلی سی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا میں ڈر گیا کہ یا اللہ، میں کہاں ہوں وہ واپس آیا اس کے ساتھ ایک سیاہ فام شخص اترا یہ بھی کالے چوغے میں تھا اور سر پر سفید پگڑ باندھے تھا میں سخت حیران تھا۔وہ شاید وہاں کا پورٹر تھا اس نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور اوپر چلا۔دوسری منزل پر ایک لابی تھی اور ایک نسبتاً خوش شکل نوجوان لڑکا بیٹھا تھا۔وہ انگریزی بول رہا تھا۔ہوٹل دوسری منزل پر تھا نہایت گھٹیا اور پسماندہ۔اس نے مجھے کمرہ دکھایا اور مجھے تسلی دی میری جان میں جان آئی اس رات میں جس خوف سے گذرا وہ ناقابل فراموش ہے۔میں تھکا تھا گہری نیند سویا صبح اٹھا اور ناشتہ کیا۔اس تجربہ سے میں بہت بدمزہ ہو چکا تھا۔سوچا صرف اہرام مصر دیکھ کر عمرہ کے لئے جدہ چلا جاؤنگا اگر چہ مجھے یہاں چار دن ٹھہرنا تھا۔اہرام دیکھنے گیا، وہ یقیناً دنیا کے عجوبے میں شمار ہوتے ہیں مگر بظاہر دیکھنے میں صرف ریت میں تین مخروتی اسٹرکچر ہیں آس پاس فقیر اور کچھ نیم برہنہ بچے دوڑ بھاگ رہے تھے۔میں بڑا مایوس ہوا۔بہر حال میں نے انہیں بہت تفصیل سے دیکھا ایک غار میں رینگ تے ہوئے اوپر چوٹی تک گیا۔ہوٹل آکر ٹکٹ بدلوانے کی کوشش کی جو ناکام ہو گئی۔دوپہر کو قاہرہ کا میوزیم دیکھا جہاں ممیاں اور فراعین کی دوسری اشیا تھیں۔ رات کو اہرام پر ایک ''روشنی اور سائے'' کا پروگرام تھا جو بہت اچھا اور متاثر کن تھا۔ایک شام دریائے نیل کے کنارے بنی سڑک اور پل پر بھی ٹہرا۔جامعہ اظہر بھی دیکھا الغرض کسی نہ کسی طرح چار دن گذار دئے اور جدہ روانہ ہوا۔

۱۹۷۷ء کا جدہ اور عمرہ

میں جدہ دوپہر کے وقت اترا، اکتوبر تھا مگر گرمی کا یہ عالم تھا کہ سورج سوا نیزے پر لگتا تھا۔ائر پورٹ کی ایک چھوٹی سی عمارت تھی، جہاز دور کھڑا ہوا، ہم پیدل عمارت تک پہنچے مگر دروازے پر ایک آدمی کھڑا تھا ایک خستہ حال میز پر ڈبوں میں دو قسم کی گولیاں رکھی تھیں ان کے علاوہ کاغذ کے گلاس اور ایک بڑے جگ میں پانی، کسی کو وہ گولیاں کھائے بغیر اندر نہیں جانے دیتا تھا۔میں بڑا پریشان ہوا مگر وہ کوئی جواب دینے کے قابل نہیں تھا کہ زبان کا مسئلہ تھا۔وہ اڑ گیا کہ پہلے یہ حلق سے اتارو، چار و نا چار میں نے وہ گولیاں نگلیں، پانی سے بھی خوف تھا کہ کیسا ہے مگر کوئی چارہ نہ تھا۔عمارت نہایت بوسیدہ تھی اور شاید سوڈان کی فلائیٹ آئی تھی اس لئے ہال، سوڈانی عورتوں سے جو اپنے خاص ساڑھی نما لباس میں تھیں کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ہوٹل کی بکنگ کا کوئی انتظام نہ تھا۔بیحد پریشانی کا عالم تھا یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں اور کیسے جاؤں۔پی آئی اے کے ایک مہربان ملازم نے میری رہنمائی کی اور ٹیکسی کر کے مجھے مرکز شہر میں بھجوا دیا۔شہر بہت پرانا ٹوٹا پھوٹا اور پسماندہ تھا، ایک بہت ہی غیر معیاری ہوٹل میں مجھے ایک کمرہ مل گیا جسکا باتھ روم بھی بس ایسا ہی تھا کہ انسانی ضرورت پوری ہو جائے۔اطراف میں زیادہ تر گلیاں کچی تھیں اور ریت کو دبانے کے لئے چھڑکاؤ کیا گیا تھا اس لئے کیچڑ تھی میں نے امریکی پریس میں پڑھا تھا کہ دولت کی ریل پیل ہے اور اونٹوں کے ساتھ ساتھ رولس رائس کاریں کھڑی ہوتی ہیں مگر یہ ۱۹۷۷ء تھا اور ابھی سعودی عرب میں ترقی کی بس ابتدا ہی ہوئی تھی۔جدہ مجھے سندھ کے پرانے شہروں جیسے روہڑی یا ٹنڈو آدم جیسا لگا۔میں تو ایک مقدس فریضہ کے لئے آیا تھا۔میں نے احرام خریدا دکاندار پاکستانی تھا اسی نے کمرے پر آکر غسل کے بعد وہ احرام باندھ دیا میں ایک پرانی سی بس میں مکہ روانہ ہوا۔مغرب کے وقت حرم شریف پہنچا حرم شریف کا فرش زیادہ تر کچا تھا اور ریت پر پانی چھڑکا ہوا تھا اس لئے نرم اور ٹھنڈی ریت اچھی لگی۔پہلی دفعہ جب خانہ کعبہ پر نظر پڑی تو ایسی رقت طاری ہوئی کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔بس وہ جذبات وہ تجربہ کچھ ایسا تھا کہ میں اسے کبھی بھی، لاکھ چاہوں تو بھی بیان نہیں کرسکتا۔چار عمرے کئے ایک ابا کے لئے، ایک اماں کے لئے اور دو اپنے لئے، جوان تھا اس لئے سعی کرنے میں بھی کوئی دشواری

نہیں ہوئی اب پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر کرتا ہوں۔ان عمروں کے درمیان مستقل روتا رہا، ابا کے لئے عمرہ کرتے ہوئے زیادہ ہی رقت طاری ہوگئی۔جدہ واپس آتے آتے صبح ہوگئی تھی، ایک ڈھابے نما جگہ پر ناشتہ کیا، لنچ کے لئے بھی کوئی معیاری ریسٹورانٹ نہیں تھا۔شام تین بجے کراچی کی فلائیٹ تھی۔میں مغرب کے جھٹ پٹے کے وقت کراچی پہنچا۔یہاں میری چھوٹی بہن میری نئی کار اور ڈرائیور کے ساتھ کھڑی تھی، ہم ائر پورٹ سے نکل کر جب شاہراہ فیصل سے کارساز روڈ پر مڑے تو شام کے اس جھٹ پٹے میں کارساز کی کوٹھیاں جن پر پھولوں سے لدی بوگین ویلا کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں اور ان کے ٹیریس پر روشنیاں جگ مگ کر رہی تھیں مجھے کراچی پر بڑا پیار آیا اور میرا دل فخر سے پھول گیا کہ قاہرہ اور جدہ دیکھنے کے بعد مجھے کراچی دنیا کا سب سے خوبصورت شہر لگا۔وائے قسمت اب جدہ دنیا کے خوبصورت اور جدید شہروں میں ہے اور کراچی بدل گیا ہے اور ٹوٹے پھوٹے کھنڈر نما شہروں میں شمار ہوتا ہے، اس میں کسی کا نہیں صرف ہمارا قصور ہے۔

۱۹۷۷ء کے اکتوبر میں میں ابا کی پہلی برسی پر عمرہ کرتے ہوئے پاکستان گیا تھا۔میرے پاس پاکستان میں صرف دو ہفتے تھے۔چونکہ یہ ہمارے ابا کی پہلی برسی تھی اس لئے ماحول کچھ غمناک تھا۔میرے تمام بہن بھائی بھی کراچی میں جمع تھے زیادہ تر ابا ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔اس اثنا میں میری شادی کا بھی ذکر آیا۔دراصل شادی تو ۱۹۷۲ء میں ہونی چاہئے تھی مگر بوجوہ تاخیر ہوتی رہی تھی۔ میری اماں اور بہنوں کا خیال تھا کہ اس سفر میں میں شادی کر کے امریکا جاؤں مگر ایک تو گھر کا ماحول غمناک تھا دوسرے میں اس ذہنی حالت میں نہ تھا کہ شادی رچاؤں پھر اتنے قلیل عرصے میں یہ سب کچھ ممکن نہ تھا اس لئے میں اس کے لئے تیار نہ ہوا۔

شکاگو میں میری زندگی معمول پر آچکی تھی اور کوئی نئی بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں مزید مستحکم ہوگیا تھا۔اب میرے سر پر سب سے اہم ذمہ داری یہ تھی کہ جلد سے جلد کراچی کے بنگلے کی تعمیر مکمل کی جائے اور کوئی صحیح رشتہ دیکھ کر چھوٹی بہن دردانہ کی شادی کی جائے، وہ اسی سال بی اے کی ڈگری لینے والی تھی۔اسی زمانے میں یعنی ۱۹۷۸ء کے شروع کے مہینے میں مجھے کچھ عجیب قسم کی علامات ہونے لگیں، میں ویسے بہت اچھی صحت میں تھا اور بظاہر کوئی بیماری نہیں تھی مگر میرے جسم کے عضلات پھڑکتے تھے۔نہ صرف ہاتھ پاؤں کے بڑے بڑے مسلز میں twitching ہوتی تھی بلکہ گردن یہاں تک کہ زبان میں بھی اس کا احساس ہوتا تھا۔میں خود طب کا پروفیسر تھا، مجھے معلوم تھا کہ یہ اچھی علامت نہیں۔شروع میں میں نے یہی سمجھا کہ یہ صرف اعصابی کشیدگی (nerves) کی وجہ سے ہو رہا ہے مگر اول تو مجھے کسی قسم کی nervousness نہیں تھی دوسرے مجھے معلوم تھا کہ یہ کسی اور ہی کی طرح کی علامت ہے۔دراصل یہ علامت ایک ایسی بیماری کی ہے جس میں رفتہ رفتہ نسیں سوکھنا شروع ہو جاتی ہیں اور مریض عام حالت میں چھ مہینوں میں انتقال کر جاتا ہے۔امریکا کے قومی کھیل بیس بال کا سب سے اچھا اور مقبول کھلاڑی اس بیماری کا شکار ہو کر عین جوانی میں مر چکا تھا اس لئے اس بیماری کا عوامی نام اسی پر رکھا گیا ہے یعنی ''LOU GEHRIG DISEASE''۔خوش قسمتی سے یہ بیماری بہت عام نہیں ہے مگر آج بھی اسکا کوئی علاج نہیں ہے اور اگر اسکی حتمی تشخیص ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال جینے کی امید کی جاسکتی ہے۔حقیقت میں یہ ایک دہشت ناک بیماری ہے۔میں نے اپنی علامات کا معروضی طور پر جائزہ لیا، کچھ اور پہلوؤں سے صورتحال کا پرکھا مگر مجھے اس بات کا یقین ہوگیا کہ میں اسی بیماری کا شکار ہوں۔جس دن مجھے یقین ہوا کہ مجھے لوگیرگ نام کی بیماری ہے وہ دن میری زندگی کے چند تاریک ترین دن میں ایک تھا۔جوانی میں مرنا کوئی نئی بات نہیں، کوئی ایک سال پہلے میرا ایک ہم جماعت جوہر علی بنگش امریکا ہی میں اپنی جوان بیوی اور ایک سال کے بچے کو چھوڑ کر کنسر میں مبتلا ہو کر چل بسا تھا۔

یہ ایسی کیفیت تھی جسے میں بیان نہیں کرسکتا، یہ کیفیت صرف وہی جانتے ہیں جنہیں موت کی سزا سنادی گئی ہو اور پھانسی کی تاریخ بھی طے کردی گئی ہو۔مجھے اپنے مرنے کا بھی دکھ اور خوف تھا مگر اس سے زیادہ اس بات کی بھی فکر تھی کہ ابھی میرا بچا کھچا کنبہ یعنی میری اماں اور چھوٹی بہن دردانہ کی تمام ذمہ داریاں صرف اور صرف مجھ پر تھیں اور ابھی تو ہم اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہیں ہوئے تھے، کراچی کے بنگلے کی صرف دیواریں کھڑی ہوئی تھی، اور دردانہ اور اماں کی کفالت کے لئے کسی قسم کا کوئی اثاثہ نہیں تھا۔امریکا میں بھی میرے پاس کوئی جمع پونجی نہ تھی، جو بہت تھوڑی تھی وہ کراچی کے بنگلے کی شروعات کے لئے اس میں خرچ ہوگئی تھی۔ایک اس بات سے تسلی تھی کہ میری اپنی شادی نہیں ہوئی تھی اور میں کسی جوان بیوہ یا چھوٹے بچے کو چھوڑ کر نہیں جا رہا تھا۔اب خیال آیا کہ اللہ جو کرتا ہے اس میں کوئی مصلحت ہوتی ہے، میری شادی میں تاخیر اسی لئے ہوئی تھی کہ مجھے اس جہانِ فانی میں چند ہی دن رہنا تھا۔

جذبات کی ندی چڑھتی رہی اور آخر جب رات کے بارہ بجے تو میں اس قدر پریشان ہو چکا تھا اور میرے اعصاب اس قدر کشیدہ ہو چکے تھے جیسے ستار کے کھنچے ہوئے تار جو ہلکی سی آہٹ پر جھنجھنا اٹھتے تھے۔آخر میں اس کی تاب نہ لا سکا اور میرا بندھ ٹوٹ گیا۔میں اس قدر رویا اسقدر رویا کہ میری ہچکی بندھ گئی، دیارِ غیر میں اپنوں سے دور کوئی تسلی دینے والا بھی نہیں۔میں اس زمانے میں کبھی کبھار ہی نماز پڑھتا تھا۔جب رو رو کر ہلکان ہوگیا تو میں نے وضو کیا، رات کا ایک بجا تھا۔میں جانماز پر کھڑا ہوا اور دیر تک سجدے کرتا رہا اس عرصے میں مستقل روتا رہا اور میرے آنسو بہہ کر جانماز پر گرتے رہے اور میں اس بات کی دعا مانگتا رہا کہ یارب مجھے بس اتنی مہلت دے کہ میں دردانہ اور اماں کا کوئی بندوبست کرسکوں۔ میرے دل کو کچھ سکون ہوا، میں نے فیصلہ کیا کہ کل صبح میں اس بیماری کے سب سے بڑے ڈاکٹر کو دکھا کر بیماری کی حتمی تشخیص کرواؤنگا اور جو بھی نتیجہ نکلے گا اس کا مردانہ وار مقابلہ کرونگا۔اس سے پہلے میں اس امتحان سے کترا رہا تھا۔اسلئے بھی

کہ میں نے جب غیر رسمی طور پر کچھ ڈاکٹروں سے پوچھا تھا تو اگرچہ وہ مجھے تسلی دیتے تھے مگر مجھے اس تسلی کے جھوٹے ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ اب میں نے سوچا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو ہی جانا چاہئے۔

دوسرے دن میں نے ڈاکٹر روزن بلوم (جو امریکا کے زیادہ تر ڈاکٹروں کی طرح یہودی تھا) سے رجوع کیا۔ اس نے بہت غور سے میری شکایات سنی اور میرا معائنہ کیا اور پھر میرے گوشت میں کئی جگہ سوئیاں چبھوئیں اور پھر تاروں کے ذریعہ مجھے ایک مشین سے جوڑ دیا اور بجلی کے شاٹ لگا کر کاغذ پر لکیروں کی ریکارڈنگ کی۔ بس یہ لمحہ تھا کہ میری زندگی کا فیصلہ ہونا تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میرا نتیجہ وہی ہوگا جس کا ہم سب کو خدشہ ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان حالات میں اس ٹیسٹ کا نارمل ہونا معجزے سے کم نہیں۔ ڈاکٹر روزن بلوم بہت ہی پروفیشنل تھا اور وہ اس ٹیسٹ کے دوران اور بعد میں بھی اس وقت تک مکمل طور پر خاموش رہا جب تک اس نے رزلٹ کی پورے طور جانچ نہ کر لی۔ اس کے بعد اس نے میرا ہاتھ تھاما اور مسکرا کر کہا Good luck, Feroz, your test is normal یہ یقیناً ایک معجزہ تھا۔ میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے۔ مجھے آج بھی یہ نہیں معلوم کہ کس کی دعائیں تھیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو میرے حال پر رحم آ گیا۔

اس نتیجے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ مجھے نئی زندگی مل گئی، ایک پھانسی کی سزا جس پر عملدرآمد کی تاریخ بھی طے ہو گئی تھی نہ صرف وہ ٹل گئی بلکہ مجھے آزاد کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک عجب احساس تھا جو صرف انہیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جو ایسے کسی مرحلے سے گذرے ہوں۔ مجھے زندگی بیحد حسین لگی اور ایک بار پھر یہ احساس ہوا کہ زندگی کس قدر ناقابل یقین ہے اور کل ہی کچھ ہو سکتا ہے اس لئے اس سے مکمل طور پر لطف اندوز ہونا چاہئے اور چھوٹی موٹی فکروں، جھگڑوں اور شکووں میں اس پر وقت برباد نہیں کرنا چاہئے۔

میں نے کچھ ماہ کے بعد ایک ماہ کی چھٹی لی اور عازم پاکستان ہوا تا کہ اپنوں سے ملوں جن میں سرفہرست میری اماں تھیں۔ کراچی ائرپورٹ پر میری بہن دردانہ میرے استقبال کے لئے کھڑی تھی ہمارا ڈرائیور ہمیں لے کر چلا اس نے بتایا کہ ہمارا بنگلہ بھی مکمل ہو چکا ہے اور میں اسے دیکھ کر خوش ہوں گا۔ جب ہم گھر پہنچے تو شام کے آٹھ بجے تھے اندھیرا ہو چکا تھا، اماں دروازے سے باہر ڈرائیو وے پر کھڑی تھیں۔ ہماری کار اندر داخل ہوئی، میں نے اپنے گھر کو دیکھا، تقریباً سب لائٹیں جلی ہوئی تھیں، گھر جگر جگر کر رہا تھا۔ اس قدر خوبصورت، میری توقعات سے کہیں زیادہ خوبصورت۔ بس میں اماں کے گلے سے لپٹ گیا اور بلند آواز میں اللہ کی اس نعمت پر اسکا شکر ادا کیا۔ ہمارا کنبہ جو ہمیشہ ریلوے کوارٹرز میں رہا تھا اس کے لئے یہ اللہ کا خاص تحفہ تھا جس کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ سوائے اس کے کہ یہ میرے ابا کی تمنا تھی کہ انکی زندگی میں انکے سر پر انکی چھت ہوتی، افسوس اللہ نے انہیں اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ اس بنگلے کو دیکھ سکتے۔ یہاں یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کی تعمیر میں میرے بہنوئی اظہار سعید کا تمام تر ہاتھ تھا اور محنت تھی کیونکہ میں تو یہاں تھا اس لئے اسکی تعمیر میں انہوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا اور اس قدر ایمانداری کے ساتھ کہ میرے منع کرنے پر بھی انہوں نے مجھے ایک ایک پیسے کا حساب دیا۔ اسی سال دردانہ کا ایک اچھا رشتہ آیا اور ہم اس فرض سے بھی بخوبی سبکدوش ہو گئے۔

میں واپس امریکا چلا گیا۔ اب ۱۹۷۹ شروع ہو چکا تھا۔ ایک مسئلہ یہ ہو گیا تھا کہ اب اماں اتنے بڑے گھر میں تنہا رہ گئی تھیں میای بڑی بہن و بہنوئی نے بڑی کوشش کی کہ وہ انکے بنگلے میں منتقل ہو جائیں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ بارشوں کے موسم میں، بجلیوں کے جانے پر اندھیری راتوں میں انکا اکیلے رہنا ہم سب کے لئے بڑی تشویش کی بات تھی۔

میں نے یہ سوچ کر کہ شاید انکا امریکا میں دل لگ جائے اور وہ اپنے بیٹے کے پاس رہنا قبول کر لیں، میں نے انہیں امریکا بلوا لیا مگر یہاں ایک تو میرے ہسپتال جانے پر وہ گھر میں تنہا ہو جاتی تھیں، پھر غیر ملک تھا، زبان دوسری تھی اس لئے وہ سخت ناخوش ہوئیں اور انہوں نے یہ کہہ کر کہ "تم نے تو مجھے پنجرے میں بند کر دیا" ایک ہی ہفتے میں واپس پاکستان چلی گئیں۔ انکی ضد تھی کہ میں واپس پاکستان آ کر یہاں بس جاؤں اس لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے اپنی ایک شاندار ملازمت سے استعفیٰ دیا اور پاکستان آ گیا۔

یہاں آ کر مجھے کوئی نوکری پسند نہیں آئی۔ کراچی طبی سہولیات کے لحاظ سے پسماندہ تھا۔ کئی مہینے پریشانی میں گذرے مگر اس دوران یہ اہم بات ہوئی کہ بالکل بزرگوں کی پسند سے میں نے بغیر دیکھے اپنی اماں کی پسند پر قناعت کر کے شادی کر لی۔ یہ شادی بارہ سال تاخیر سے ہوئی۔ میری اہلیہ کراچی کالج آف ہوم اکنومک سے گراجویٹ ہیں، میرے دو بچے ہیں، حماد عالم اور حرا حریم۔ حماد ماشاء اللہ امریکا میں بیرسٹر ہیں اور حرا ڈینٹسٹ ہیں۔ ابھی ابھی اللہ نے مجھے ایک بیحد پیارے سے نواسے سے بھی نواز دیا ہے جو مجھے دیکھ کر کلکاریاں مارتا ہے تو میرے دل میں ہزاروں پھول کھل جاتے ہیں۔

۱۹۸۷ میں مجھے آغا خان ہسپتال میں پہلی فیکلٹی کے ساتھ امریکا سے جاب کی آفر ہوئی کہ میں امراض گردہ کا شعبہ سنبھالوں، پانچ سال میں نے یہاں اسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر کام کیا، آج کراچی میں چند بہت شہرت یافتہ اور کامیاب ڈاکٹر میرے طلبہ میں شامل ہیں۔ ہمارے کلچر کے رواج کے مطابق وہ اب بھی جب ملتے ہیں وہ مجھے "سر" کہتے ہیں۔ آغا خان ہسپتال کی سینئر فیکلٹی کے زمانے میں مجھے صدر پاکستان غلام اسحٰق خان کے ساتھ ڈنر، محترمہ بے نظیر وزیر اعظم کے ساتھ لنچ اور پرنس کریم کے ساتھ برنچ کرنے کا موقعہ ملا، یہ سب اس باری تعالیٰ کی خاص نوازشیں تھیں۔

بس یہ ہے میری زندگی کی کہانی، میر پور خاص کے ایک درمیانے درجے کا لڑکا جسے اللہ کی عنایتوں اور خصوصی مدد نے ہوا کے دوش پر اڑا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

الکحل یا شراب

ڈاکٹر فیروز عالم

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

الکحل، یعنی نشہ آور مشروبات جنہیں عرفِ عام میں شراب کہا جاتا ہے، تہذیب کے اولین دور سے انسانی معاشرے کا حصہ رہی ہے۔ سب سے پہلے شراب کہاں کشید کی گئی، اس کے متعلق تو کچھ کہنا مشکل ہے اور نہ اس وقت ہمارا یہ موضوع ہے مگر یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ از نینوا و بابل تا موہنجو داڑو اور ہڑپہ اس کے وجود کے شواہد ملتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مختلف معاشرتی قدروں کی نسبت اس کی حیثیت کے تعین میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ جہاں اسلامی معاشرے میں یہ ام الخبائث، نجس اور انتہائی ناپسندیدہ اور حرام شے ہے وہیں عیسائی معاشرے میں اس کی ممانعت نہیں بلکہ اسے ایک طرح سے مذہبی اور پاکیزہ حیثیت حاصل ہے۔

زیرِ نظر مضمون قطعاً ایک سائنسی مضمون ہے اور اس کا مقصد اس متنازعہ اور ہمارے لیے مکمل طور پر حرام شے کی کیمیائی ساخت اور خصوصاً جسم پر اس کے مضر اثرات کا احاطہ کرنا ہے۔

الکحل کیا ہے؟

علم کیمیا کی اصطلاح میں ہر وہ مرکب جس کے آخر میں آکسیجن اور ہائیڈروجن کا ایک ایک ذرہ یعنی ہائیڈروکسل (Hydroxyl) گروپ ملحق ہو، اسے الکحل کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں شراب کیمیائی طور پر ایتھائل الکحل (Ethyl Alcohol) ہے جو میٹھے یا رسدار پھلوں اور مختلف قسم کے اناج جیسے چاول یا جو میں خمیر اٹھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ مختلف مشروبات میں الکحل کا تناسب مختلف ہوتا ہے کسی بھی شراب میں نشے کی شدت اسی الکحل کے تناسب کی مرہونِ منت ہے۔ بیئر (Beer) عام طور سے مختلف اناج سے حاصل کی جاتی ہے۔ اس میں الکحل کا تناسب دو فیصد سے آٹھ فیصد تک ہوتا ہے۔ وائن، جو پھلوں کا رس اور خاص طور سے انگور کے رس سے حاصل ہوتی ہے بارہ فیصد اور سخت مشروب جیسے وہسکی، جن یا واڈکا میں یہ تناسب پچاس فیصد تک ہوتا ہے۔

جسم میں الکحل کا انہضام اور اخراج

چونکہ الکحل معدے میں کسی قسم کے ہاضمے کے مرحلے سے نہیں گزرتی اس لیے استعمال کے فوراً ہی بعد یہ خون میں جذب ہو جاتی ہے اور خون میں اس کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ دورانِ خون کے ذریعے یہ جسم کے مختلف حصوں تک پہنچتی ہے اور تقریباً ہر حصے پر اپنے مضر اثرات مرتب کرنا شروع کر دیتی ہے۔ آخر کار جگر اس کو کیمیائی طور پر غیر موثر بناتا ہے اور اس کا بڑا حصہ پیشاب کے ذریعے خارج ہوتا ہے۔

الکحل کے معاشرے پر اثرات

مجھے امید ہے کہ قارئین مضمون کے اس حصے کو بہت غور سے پڑھیں گے۔ اگرچہ کچھ معاشروں میں الکحل کے استعمال کو جائز قرار دیا گیا ہے مگر ان معاشروں میں بھی سماجی مفکر اور کارکن اس بات پر متفق ہیں کہ الکحل نے معاشرے کو جتنا نقصان پہنچایا ہے وہ کسی اور چیز نے نہیں پہنچایا۔ اس کی وجہ سے امریکہ میں ہر سال لاکھوں لوگ مختلف عارضوں کا شکار ہو کر نہ صرف خود مرتے ہیں بلکہ اس کے زیرِ اثر ایسی کارروائیاں بھی کر گزرتے ہیں کہ جس کے نتیجے میں سینکڑوں معصوم افراد جن کا الکحل سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

الکحل کے جسم پر اثرات

یہ حیرت انگیز بات ہے کہ حقیقت میں الکحل کا دماغ پر اثر اسے Stimulate کرنا نہیں بلکہ اسے پست کرنا، یعنی Depression ہے۔ اول مرحلے میں دماغ کے وہ حصے جو اعلیٰ ترین کام اور ذہانت کے ذمہ دار ہوتے ہیں سب سے پہلے کام کرنے کے نااہل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ تہذیبی اور اچھی قدروں کے تحت سیکھے ہوئے طور طریقے سب سے پہلے اس کا شکار ہوتے ہیں اور بے حیائی، بے باکی اور پیشاب کا بار بار آنا وغیرہ جیسی چیزیں اس کے زیرِ اثر عام ہیں۔ اس کے علاوہ جسم کی اعلیٰ فنکارانہ صلاحیتیں بھی منفی طور پر متاثر ہوتی ہیں۔ یعنی انسان ٹائپ کرنے، ڈرائیونگ کرنے، خطاطی یا مصوری وغیرہ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ آخری مدارج میں چکر آنا، توازن کھونا اور بے ہوش ہو جانا شامل ہیں۔ خاص طور پر اس کے زیرِ اثر فیصلہ کرنے کی صلاحیت بالکل ہی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک طویل عرصے تک اس کے استعمال سے دماغ کی ساخت میں نقصان دہ اثرات ظاہر ہوتے ہیں اور پورا جسم رعشے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک غلط مفروضہ یہ ہے کہ الکحل سے سردی کا احساس کم ہو جاتا ہے اور سخت سردی میں بھی برانڈی کا ایک گھونٹ گرمی پہنچاتا ہے۔ دراصل یہ کیفیت قطعاً عارضی اور بالکل عارضی ہوتی ہے اور اس کے بعد جسم الکحل کے زیرِ اثر سردی سے مدافعت کی قوت کھو بیٹھتا ہے۔ حقیقتاً الکحل سے جلد میں موجود خون کی رگیں کھل جاتی ہیں جس کی وجہ سے جلد میں گرمی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ سردی میں بھی پسینہ آنے لگتا ہے اور چہرے کی رنگت سرخ ہونے لگتی ہے۔ یہ سب کچھ محض بالکل عارضی اور وقتی ردِعمل ہوتا ہے اور حقیقتاً جسم اپنی اندرونی حرارت اور گرمی کھونے لگتا ہے اور اس کا جسم جس سے وہ سردی سے بچاؤ کر سکے۔ وہ سردی کے جواب میں قدرتی اور نارمل ردِعمل ظاہر کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ الکحل کا شکار بہت سے لوگ سردی کا شکار ہو کر موت کے منہ میں پہنچ جاتے ہیں۔

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ کیجیے

''طائف کے مسافر''

نعت شریف

اُسؐ رحمتِ عالم کے جو فیضاں نہیں ہوتے
ہم آدمی رہتے کبھی انساں نہیں ہوتے

مہتاب جو سیرت کا فروزاں نہیں ہوتا
تہذیبِ دل و ذہن کے ساماں نہیں ہوتے

رنگوں کے تعاقب میں نکل جاتے حدوں سے
عکس اُسؐ کے نگاہوں میں جو درخشاں نہیں ہوتے

ہوتی ہے کہاں اُن کے نصیبوں میں شفاعت
جو اپنی خطاؤں پہ پشیماں نہیں ہوتے

نسبت ہمیں طائف کے مسافر سے ہے سو ہم
یلغارِ مصائب سے پریشاں نہیں ہوتے

سینے جو مدینے کی محبت سے ہوں خالی
رہتے ہیں بیاباں ہی گلستاں نہیں ہوتے

اک سایۂ رحمت ہے شب و روز سروں پر
یونہی تو کٹھن مرحلے آساں نہیں ہوتے

جلیل عالی
(راولپنڈی)

نعت رسول مقبولؐ

میری قسمت میرے حالات بدل جاتے ہیں
غم جو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں وہ ٹل جاتے ہیں

مجھ پہ ہو جاتی ہے پھر ان کے کرم کی بارش
شعر جب میرے کسی نعت میں ڈھل جاتے ہیں

قافلہ جب کوئی بڑھتا ہے مدینے کی طرف
خشک آنکھوں میں سمندر سے مچل جاتے ہیں

جہاں تعظیم سے رُک جائیں فرشتوں کے قدم
آپ اُس حد سے بھی اور آگے نکل جاتے ہیں

نامِ احمد سے ہر اک کام سنور جاتا ہے
ہو کرم اُن کا تو گرتے بھی سنبھل جاتے ہیں

پوچھتی ہوں میں پتہ جن سے گلی کا اُن کی
وہی جھونکے مجھے جُل دے کے نکل جاتے ہیں

تسنیم کوثر
(لاہور)

چھنال

رضیہ اسماعیل

(یوایس اے)

''اری او چھنال۔۔۔کہاں مرگئی؟

مجال ہے جو اس رانڈ کے کانوں پر جوں تک رینگ جائے۔ کب سے دو بوند پانی کے لیے ترس رہا ہوں۔''

بڑے سے آنگن کے ایک کونے میں برگد کے درخت تلے پڑی کھاٹ پر، شام کے ملگجے اندھیرے میں بے حس و حرکت پڑا ہوا دیپو کافی دیر سے چلّا رہا تھا۔

''میری ٹانگوں میں دم ہوتا تو تیرے پیچھے جا کر اپنے یار کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑتا، سو جوتے مار کر، چٹیا سے پکڑ کر گھر سے نکال باہر کرتا۔ ہائے رام اب میں کیا کروں!'' دیپو نے روہانسا ہو کر کہا۔

دیپو کی واہی تباہی نے سارے ماحول کو اداس کر دیا تھا۔

درخت پر بیٹھے ہوئے پنچھی بھی دن بھر دانہ دنکا چگنے کے بعد ستانا چاہ رہے تھے مگر دیپو کا واویلا سن کر سب ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

تھان سے بندھی گییا بھی سب کچھ سمجھنے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہی تھی۔ وہ سامنے پڑے ہوئے چارے کو یوں حسرت سے تک رہی تھی جیسے ایک لاچار اور بے بس ماں اپنے جاں بلب بچے کو آخری سانسیں لیتے ہوئے دیکھ کر امید اور ناامیدی کی دلدل میں دھنستی چلی جا رہی ہو۔ لیکن پھر جیسے اسے ایک ہڑکا سا لگا اور وہ ہڑبڑا کر اپنی سوچوں سے باہر نکل آئی اور اپنے بچے کو بے اختیار چومنا شروع کر دیا۔

گییا بھی تھوڑے وقفے کے بعد کچھ نہ سمجھتے ہوئے گھبرا کر بڑی بے چارگی سے چارے پر منہ مارنا شروع کر دیتی تھی۔

وقت نے جیسے سرگوشی کی ''مکان صرف چھتوں، دیواروں، کھڑکیوں، دروازوں، دالانوں، برآمدوں، ڈیوڑھیوں، آنگنوں اور ممٹیوں سے ہی قدر و منزلت حاصل نہیں کرتے بلکہ ان کا اصل شرف تو اُن کے مکین ہوتے ہیں۔'' بقول اسداللہ خان غالبؔ:

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا تو جنگل اداس ہے

اور اس مکان کا اصل شرف تو دیپو کی ماں ساوتری دیوی تھی جو بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ مانگ سے سیندور پونچھ کر بیوگی کا سفید چولا پہن کر، ننھے سے دیپو کو سینے سے چمٹائے اُس کی مسکراہٹوں کی لَو سے جیون کی سنسان اور تاریک راہوں کو روشن کرتی رہی مگر لب پر کبھی حرفِ شکایت نہ لائی۔

پارسائی کی ایک مثال بن کر جوانی کے کڑے کوس کاٹ دیئے۔

گاؤں کے بڑے بزرگ سب اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ راہ چلتی ساوتری دیوی کو دیکھ کر سب ادب سے راستہ چھوڑ دیتے تھے کیونکہ ساوتری دیوی نے عزم و ہمت کی جوالا مکھی بن کر ناری جاتی کے مان سمّان کو جلا بخشی تھی۔ مجال ہے جو کبھی کمزور پڑی یا جھکی ہو۔ بس جیون بھر ترشول کی طرح تنی کھڑی رہی۔ جیسے وہ گوشت پوست کی عورت نہیں پتھر کی ایک چٹان ہو۔

لیکن کون جانے اس چٹان میں اندر ہی اندر کتنے جھرنے پھوٹ پھوٹ کر بانجھ ہو چکے تھے؟

دیپو کے سہرے کے پھول کھلنے اور گھر کے بڑے سے آنگن میں پوتے پوتیوں کی معصوم کلکاریاں سننے کے سپنے آنکھوں میں سجائے ساوتری دیوی نے جیون کاٹ دیا۔

دیپو کے پتا نے چند بیگھے زمین چھوڑی تھی جس سے کسی کا احسان لیے بغیر اس کی گزر اوقات ڈھنگ سے ہو جاتی تھی۔

ساوتری دیوی نے ساتھ کے گاؤں میں ایک بھلا مانس گھرانا دیکھ کر دیپو کے لگن کی بات بڑھائی تو بس جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہو گیا۔ ساوتری دیوی کی خوشی دیدنی تھی۔ بیاہ کی تیاریوں کو دیکھ کر اگر کوئی دبی زبان سے کچھ کہتا بھی تو ساوتری دیوی ہنستے ہوئے کہتی ''ارے، میری ایک ہی تو سنتان ہے، کون سے دس بارہ بچے ہیں جن کے بیاہ رچانے ہیں مجھے۔ میں تو دیپو کے بیاہ پر جی بھر کر اپنے ارمان نکالوں گی۔''

دیپو کا بیاہ اس قدر دھوم دھام سے ہوا اور بھوجن ایسا مزے کا تھا کہ گاؤں والے بہت دنوں تک انگلیاں چاٹ چاٹ کر چٹخارے لیتے رہے۔ دیپو اور جیوتی کی جوڑی سچ مچ دیپک اور جیوتی کے موافق ہی ثابت ہوئی۔ یک جان و دو قالب۔ دیپو تو جیوتی کو دیکھتے ہی اس پر جی جان سے فدا ہو گیا تھا۔ ماں کے صدقے واری جاتا تھا کہ کتنی اچھی جیون ساتھی ڈھونڈی اس کے لیے۔ دیپو اور جیوتی کے پریم کے چرچے رفتہ رفتہ گاؤں میں سب ہی کے زبان پر آ گئے۔

گاؤں کی کچی کنواریاں اکثر پنگھٹ پر ان کے پریم کے قصے سنا سنا کر مزے لیتیں اور پھر شرم سے دوہری ہو کر منہ ڈھانپ کر کھلکھلا کھلکھلا کر خوب ہنستیں۔

''چنتا نہ کرو جب تمہارا لگن ہو گا تو تمہارا پتی بھی ایسا ہی تمہارا دیوانہ ہو گا۔ مرد تو روپ اور جوانی کا بھوکا ہوتا ہے۔ شیر کی طرح تمہاری بوٹیاں نہ نوچ لے تو میرا نام بدل دیجیو۔'' شانتی موسی نے گویا روپ والی ساری کنواریوں کو چنوتی دے دی۔

لگتا تھا ادھیڑ عمر شانتی موسی کو اپنی جوانی کے دن یاد آ رہے تھے جبھی تو وہ بات کرتے کرتے لجا سی جاتی۔

اُدھر ساوتری دیوی، دیپو اور جیوتی سے کوئی خوش خبری سننے کے لیے دن رات بھگوان سے پرارتھنا کرتی۔ مندر میں چڑھاوے چڑھاتی۔ بس اس کا یہی ارمان تھا کہ دیپو کی سنتان کا منہ دیکھ لے تو سمجھے گی اس نے گنگا نہالیا مگر ساوتری دیوی کے پاس وقت کم پڑ گیا۔ گاؤں میں اچانک ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی جس سے بہت سے لوگوں کی طرح ساوتری دیوی بھی دیکھتے ہی دیکھتے پرلوک سدھار گئی۔

ماں کی اچانک موت کا جانکاہ صدمہ دیپو کی برداشت سے باہر تھا۔ ماں کی چتا کو آگ دکھاتے ہوئے وہ یوں بلک بلک کر رو یا کہ لگتا تھا کہیں چتا کی آگ اس کے آنسوؤں کی نمی کے سبب وقت سے پہلے ہی ٹھنڈی نہ ہو جائے۔

گہری اداسیوں میں ڈوبے ہوئے دیپو کو اپنی بکھری ہوئی ہستی کو سمیٹنے میں بہت وقت لگ گیا۔ ایسے میں جیوتی کی دل جوئی اور خاطر مدارات نے اس کے لیے مرہم کا کام کیا اور وہ رفتہ رفتہ زندگی کی طرف لوٹنے لگا۔

لگتا تھا دیپو اور جیوتی کی پرکشا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ٹریکٹر کی ٹکر سے دیپو ایسا زخمی ہوا کہ کمر کی چوٹ سے وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر اٹھنے کے قابل نہ رہا۔ جیوتی کے جیون کی تو جیسے جوت ہی بجھ گئی۔ ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا۔ جیوتی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

ساوتری دیوی نے تقریباً ساری پونجی دیپو کی شادی پر لٹا دی تھی۔ کوئی مال دار سگا سمبندھی بھی نہیں تھا کہ روپے پیسے سے ان کی مدد کرتا تا کہ وہ دیپو کو شہر کے بڑے ہسپتال میں لے جا کر علاج کرواتی۔ میکے میں لے دے کر رشتے کا ایک غریب ماما تھا جس نے جیوتی کے ماتا پتا کے سورگ باشی ہونے کے بعد ان کی اکلوتی بٹیا کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری اٹھائی اور مناسب بر دیکھ کر اس کا بیاہ کر دیا۔

جیوتی کے نصیب اچھے تھے کہ اس اناتھ کو ساوتری دیوی کا گھرانا مل گیا۔ دان دہیج لیے بنا ہی ساوتری دیوی نے اس کے ماما کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا جس پر غریب ماما بے حد پرسن تھا۔

ان حالات میں گاؤں کے وید سے ہی جو دوا دارو بن پڑتا تھا جیوتی وہی کروا رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ دن رات بھگوان سے پرارتھنا کرتی کہ وہ دیپو کو جلدی اچھا کر دے۔

شروع شروع کے دنوں میں تو صدمے سے نڈھال اور مستقبل کی سوچوں سے پریشان جیوتی گم سُم سی ہو کر دیپو کی کھاٹ سے لگ کر بیٹھی رہی۔ نہ کھانا، نہ پینا، نہ بولنا، نہ ہنسنا۔ بس خالی خالی نظروں سے سب کو تکتی رہتی مگر آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہ لے رہے تھے۔

جیوتی کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر چند روز تو محلے والوں نے اسے کھانا پینا دیا مگر کب تک؟

دیپو کی بیماری نے بڑی سمسیا کھڑی کر دی تھی۔ اب زمینوں پر کام کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر ایک روز جیوتی کچھ سوچ کر اٹھی، ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھے اور گاؤں کے مُکھیا کی حویلی جا پہنچی۔ مُکھیا یوں اچانک جیوتی کو حویلی میں پا کر قدرے حیران ہو گیا۔

''کہو، جیوتی! کیا بات ہے؟'' مُکھیا نے نرم لہجے میں جیسے ہی جیوتی سے بات کی، اس کے آنسو پھر سے پلکوں پر لرزنے لگے۔

''مالک، آپ تو دیپو کی حالت جانتے ہیں۔ نہ جانے کب کھاٹ چھوڑے گا وہ؟ زمینوں کی دیکھ ریکھ کرنے والا اب کوئی نہیں۔ اگر ابھی سے چارہ نہ کیا تو تمام کی تمام کھڑی فصل برباد ہو جائے گی۔ ایسے میں آشا کی کرن بس آپ ہی ہیں۔ کرپا کیجیے۔ اس وقت آپ ہی ہمارے لیے بھگوان ہیں۔''

جیوتی کی سچی اور سیدھی سادی باتوں نے نرم دل مُکھیا کا دل پگھلا کر رکھ دیا۔ وہ دیپو کی ماں ساوتری دیوی کی بہت عزت کرتا تھا۔ ان کے گھر کے حالات سن کر بہت دکھی ہوا۔ دیپو کے ٹھیک ہونے تک اس نے زمین کے سلسلے میں تمام کاموں کی ذمہ داری قبول کر لی اور بدلے میں فصل کا کچھ حصہ باقاعدگی سے جیوتی کو دینے پر رضامندی ظاہر کر دی جس پر جیوتی نے سُکھ کا سانس لیا۔

اُدھر دیپو جیسا کڑیل جوان کھاٹ پر پڑے پڑے چند مہینوں میں ہی برسوں کا بیمار دکھائی دینے لگا۔ مزاج میں بہت زیادہ چڑچڑاہٹ آ گئی تھی۔ چلتی پھرتی جیوتی کو دیکھ کر اس کے دل پر آرے چلتے تھے۔ جیوتی کا رنگ روپ جس کا وہ کبھی دیوانہ تھا اب اُسے کھلنے لگا تھا۔ دن رات جانے اَن جانے اندیشے اُس کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔

جیوتی کی دن رات کی سیوا بھی اب اسے زہر لگنے لگی تھی۔ اسے لگتا کہ جیوتی اس پر ترس کھا کر سب کچھ کر رہی تھی۔ جب کہ جیوتی اپنا پتی پرمیشور دھرم نبھاتے ہوئے ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

ایسے میں جیوتی کے کاموں میں سو سو کیڑے نکالنا اور بہانے بہانے سے اسے گالیاں دینا دیپو کا معمول بن چکا تھا جس سے گھر کا ماحول ہر وقت کشیدہ رہنے لگا تھا۔

دیپو کی حالت دیکھ کر جیوتی نے ہار سنگھار چھوڑ دیا۔ سادہ سوتی ساڑھی پہن لی۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے جس سے دیپو خوش ہو کر اسے وقت بے وقت کوسنے دینے سے باز رہے۔

''آخر اسے بھی ہمدردی کے دو بولوں کی ضرورت ہے۔ انسان ہے کوئی پشو پکشی تو نہیں کہ جیسے چاہو ہانکتے چلے جاؤ''

پلکوں پر لرزتے آنسوؤں کو سہارا دیتے ہوئے اُس نے سوچا۔

''ناری کا من کتنا بھی وشال ہو مگر مرد کی بداعتمادی سے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔''

حالات کی سولی پر لٹکی ہوئی جیوتی کی ذہنی حالت اور اس کے دکھ درد سے دیپو قطعی بے خبر تھا۔

ادھر کچھ دنوں سے جیوتی شام ہوتے ہی دیپو کو بھوجن کرا کر کچھ کہے

سنے بنا ہی گھر سے خاموشی سے نکل جاتی اور رات گئے واپس لوٹتی۔ تب تک دیپو انتظار کرتے کرتے اور اسے کوسنے دیتے ہوئے سو چکا ہوتا تھا۔

آج پھر شام کے بعد جیسے ہی جیوتی نے گھر کی چوکھٹ پار کی دیپو نے چھنال چھنال کی رٹ لگانا شروع کر دی۔

شام کے وقت گلی سے گزرنے والے سب ہی لوگ اب ان گالیوں کے عادی سے ہو چکے تھے۔

میں اور باپو بھی ہر شام مندر میں گیتا کے پاٹھ سے فارغ ہو کر واپسی پر گھر جاتے ہوئے اس گلی سے گزرا کرتے تھے۔ دیپو کی باتیں سن کر باپو کی تیوری پر بل پڑ جاتے اور وہ نہایت ناگواری سے اپنی ناک سکیڑ لیا کرتا تھا جیسے بدبو کا زبردست بھبکا اس کے نتھنوں میں گھس گیا ہو مگر اس گلی سے گزرنا ہماری مجبوری تھی۔ کیوں کہ ہمارے گھر کو جانے والا ایک ہی قریبی راستہ تھا۔

میں اکثر باپو کے چہرے کی ناگواری کو نظر انداز کرتے ہوئے قدرے ایڑیاں اٹھا کر دیپو اور جیوتی کے گھر کی کچی چار دیوار کے پار جھانکنے کی ناکام کوشش کرتا تو باپو مجھے بُری طرح جھڑک کر تیز تیز قدموں سے چلنے کا بھاشن دے ڈالتا۔

''ہر شام یہی ناٹک ہوتا ہے۔ اس عورت کے لچھن کچھ اچھے نہیں لگتے۔'' باپو منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہتا۔ لیکن مجھے کبھی ہمت نہ پڑی کہ میں باپو سے پوچھ سکوں کہ اس کی بات کا کیا مطلب ہے؟''

میں اپنی عمر کی سمجھ اور ناسمجھی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ کچھ باتیں تو میری سمجھ میں آ جاتی تھیں مگر بہت سی باتیں سر کے اوپر سے ہی گزر جاتیں۔ ایسے میں ماں اور باپو کے سوا کوئی بھی نہیں تھا جو میرے سوالوں کا جواب دیتا۔ ماں تو پھر بھی کچھ بتا دیا کرتی تھی جب کہ باپو کا جواب اکثر ''ہوں۔ ہاں'' میں ہی ہوتا جو میرے لیے بڑی الجھن کا باعث بنتا۔

باپو کافی عرصے سے گاؤں کے چھوٹے سے سکول میں ماسٹری کر رہا تھا اور اب وہ ریٹائر ہونے کے قریب تھا۔ کچھ مدت سے اس نے شام کو مندر میں گیتا کا پاٹھ بھی پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ شاید اس خیال سے کہ سکول کی نوکری چھوڑنے کے بعد گیان دھیان کی کوئی مصروفیت تو بنی رہے۔

ایک دن ماں کو رسوئی کے کام میں مصروف دیکھ کر میرے جی میں آیا کہ جیوتی دیدی اور دیپو بھیا کے بارے میں کچھ پوچھوں۔ ماں سے سوال پوچھنے کا یہ وقت بہت اچھا ہوتا تھا، کیوں کہ کام کی مصروفیت یا شاید بے دھیانی میں ہی وہ میرے بہت سے الٹے سیدھے سوالوں کے کھرے کھرے جواب دے دیا کرتی تھی۔

''ماں! یہ چھنال کیا ہوتی ہے؟''

انہماک سے برتن مانجھتی ہوئی ماں نے تیوری پر بل ڈال کر مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا'' کہاں سے سنا ہے یہ تو نے؟'' پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولی'' دیپو سے سنا ہوگا، ہائے رام! کیا کل یگ ہے، کہاں ساوتری دیوی اور کہاں یہ جیوتی؟ خاندان کی ناک کٹوا دی اس نے تو۔ دیپو نے کھاٹ کیا پکڑی یہ گل چھرّے اڑانے لگی۔''

''ماں! بتاؤ نا چھنال کیا ہوتی ہے؟''

''ارے چھنال بہت ہوشیار اور چالاک ناری کو کہتے ہیں۔'' ماں نے اپنی دانست میں بڑی بے ضرر سی وضاحت کی۔

''مگر ہوشیار ہونے میں تو کوئی برائی نہیں ہے۔ باپو تو سکول میں ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ جیون میں ہر ایک کو ہوشیار ہونا چاہیے۔''

''ارے میرا مطلب پڑھائی میں ہوشیار ہونے سے نہیں ہے'' ماں بولی۔

''تو پھر کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''ارے یہ کیا کورٹ کچہری کے وکیلوں کی طرح تم نے تکرار شروع کر دی ہے؟'' ماں کچھ دیر کو رُک کر جیسے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگی۔ پھر ایک لمبی آہ بھر کر بولی'' یہ بہت ہی چالاک، ہوشیار بلکہ چلتر ہن ناری کو کہتے ہیں جو مردوں سے آنکھ مٹکا کرتی پھرے۔''

''چلتر ہن'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پھر ماں سے پوچھا۔

''ہائے رام! اب اس ناسمجھ کو کیسے سمجھاؤں کہ چلتر ہن ناری کیا ہوتی ہے؟'' ماں نے میرے پے در پے سوالوں سے زِچ ہو کر کہا۔

''چلتر ہن ناری وہ ہوتی ہے جو غیر مردوں سے الٹی سیدھی باتیں کرتی پھرے اور پتی ورتا ہونے کے نام پر بٹہ لگائے۔''

''مگر میں نے تو جیوتی دیدی کو کبھی کسی دوسرے مرد سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ تو ہر وقت دیپو بھیا کی دیکھ ریکھ میں ہی جتی رہتی ہے۔'' میں نے جیوتی دیدی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا مگر ماں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ماں کی طویل خاموشی سے تنگ آ کر میں نے پھر سوال جڑ دیا۔'' ماں اگر مرد دوسری عورتوں سے آنکھ مٹکا کریں تو کیا انہیں بھی چھنال کہتے ہیں؟''

اب کی بار ماں نے میری بات کا ترنت جواب دیا'' نہیں نہیں، مرد تو گندے جوہڑ میں سو ڈبکیاں بھی لگائے تو پھر بھی پوتر کا پوتر ہی رہتا ہے۔ چھنال تو بس ناری جاتی ہوتی ہے۔'' ماں نے قدرے افسردہ لہجے میں کہا۔

''مگر ایسا کیوں؟ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے قدرے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ بس سنسار میں ایسا ہی ریتی رواج ہے۔ ہم کون سے مہاتما ہیں جو سماج سدھار کرتے پھریں'' ماں نے میرے تابڑ توڑ سوالوں سے چڑ کر مجھے جھڑکتے ہوئے کہا'' کیا ناری بھون کھولنے کا ارادہ ہے تیرا، جہاں تو لوگوں کو بھاشن دے دے کر بتائے گا کہ کون سی ناری پوتر ہے اور کون سی بھرشٹ؟''

''نہیں ماں! ایسی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''بس اب جا، الٹے سیدھے سوالوں سے میرا سر نہ کھا۔'' اس کے ساتھ ہی سوال جواب کا سلسلہ گویا منقطع ہو گیا۔

سچ تو یہ ہے کہ ماں کی باتوں سے میری تسلی نہیں ہوئی تھی۔

مجھے سندرسی جیوتی دیدی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ جب سے بیاہ کر ہمارے گاؤں آئی تھی اس کی ہنس مُکھ طبیعت اور موہنی سی صورت نے سب کا دل موہ لیا تھا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے وہ اکثر مجھے پاس بلا کر پیار کیا کرتی تھی اور کبھی کبھی کوئی میٹھی چیز بھی کھانے کو دے دیا کرتی تھی۔ آج کئی دنوں کے بعد میرا جی چاہا کہ میں جیوتی دیدی کے گھر جاؤں۔

باپو شہر گیا ہوا تھا اور شام سے پہلے گاؤں لوٹنے والا نہیں تھا۔ ماں کو کچھ بتائے بغیر میں وہاں سے کھسک گیا وگرنہ وہ تو لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ جاتی اگر اسے اس بات کی بھنک بھی پڑ جاتی کہ میں جیوتی دیدی کے ہاں جانے والا ہوں۔

آنگن میں قدم رکھتے ہی میری نظر جیوتی دیدی پر پڑی جو بڑی مشکل سے دیپو بھیا کی کھاٹ کو گھسیٹ کر برآمدے کی طرف لے جا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

''ارے راجن! تم آج کہاں سے ٹپک پڑے؟ اچھا ہوا تم آ گئے، ادھر آؤ۔ کچھ مدد کرو، دیکھو تمہارے دیپو بھیا کب سے آنگن میں سے برآمدے میں آنے کا کہہ رہے تھے۔ آج دھوپ میں تپش کچھ زیادہ ہی ہے۔''

میں خوشی خوشی بھاگ کر گیا اور جیوتی دیدی کی مدد کرنے لگا۔

جیوتی دیدی بولتی جا رہی تھی۔ دیپو بھیا آنکھیں موندھے ہوئے تھے۔ میرے آنے پر بھی کوئی ردِّعمل ظاہر نہیں کیا بس بے حس و حرکت پڑے رہے۔

میں نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینا شروع کر دیا ''ساوتری نواس'' ایک گہری اداسی کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ بڑے سے آنگن کے ایک کونے میں گئیا چارے پر منہ رکھے خالی خالی نگاہوں سے ہر شے کو تک رہی تھی۔ یہ ساوتری دیوی کے دنوں کی گئیا تھی جس کی ناز برداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی تھی مگر آج اس گھر کے مکینوں کو اپنی ہی پڑی ہوئی تھی۔ ایسے میں اس بے زبان کے نازنخرے کون اٹھاتا؟

دیپو بھیا کے کبوتر بھی چھتری پر حواس باختہ بیٹھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ بھی دیپو کی بیماری پر غٹرغوں کرنا بھول چکے تھے۔

آنگن کے بیچوں بیچ تلسی کا پودا بھی اشک بار نگاہوں سے گئے وقتوں کی رونقیں یاد کر کے اداس ہو رہا تھا۔

برآمدے میں لٹکے ہوئے سنہری پنجرے میں گانی والا خوب صورت طوطا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پھڑ پھڑا کر ماحول کے سکوت کو توڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ طوطا جیوتی اپنے میکے سے ساتھ لائی تھی۔ بس یہی ایک نشانی تھی میکے کی جسے دیکھ کر جیوتی کا من شانت ہو جاتا تھا۔ لگتا تھا کہ اب طوطا بھی دیپو کی طرح جیوتی سے بدگمان ہو چکا تھا۔ دن رات دیپو کی چھنال چھنال کی رٹ سن کر طوطا بھی جیوتی کو دیکھ کر چھنال چھنال کی گردان کرنے لگتا تھا جس سے جیوتی دل مسوس کر رہ جاتی کہ اب پنچھی بھی اسے شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔

دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے بوڑھے برگد کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے پنچھی گاہے گاہے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

''یہ جیوتی ہر شام کہاں چلی جاتی ہے، دیپو کو بتائے بغیر؟'' ایک نے کہا۔

''رام ہی جانے۔'' دوسرے نے آہستگی سے جواب دیا۔

''میں تو دیپو کی ہر روز کی کِل کِل سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔'' تیسرے پنچھی نے کہا ''لگتا ہے اب کوئی اور ٹھکانا دیکھنا پڑے گا۔'' اس نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ٹھکانا دیکھ تو سکتے ہیں مگر ہمارا اس آنگن اور برگد کے ساتھ ناتا بہت پرانا ہے۔'' ایک تجربہ کار پنچھی نے سنجیدگی سے کہا۔

''برے وقت میں کیا ہم بھی اس گھر کے مکینوں کا ساتھ چھوڑ دیں؟'' سیانے پنچھی نے گویا سب کو سوال کی زد پر رکھ دیا۔ مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ پھر خود ہی بولا ''ایسا کام صرف انسان ہی کر سکتے ہیں، ہم پنکھ پکھیرو نہیں۔ ہم یہاں سے کہیں اور نہیں جائیں گے۔ انہی شاخوں پر بیٹھ کر پرارتھنا کریں گے کہ اس گھر کی کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹ آئیں۔'' بوڑھے پنچھی کی بات سے سب کے سراسیمہ چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور ان سب نے مل کر کچھ اس انداز سے چہچہانا شروع کر دیا کہ میں اور جیوتی دیدی سر اٹھا کر برگد کی شاخوں کو حیرانی سے تکنے لگے اور یہ سوچ کر مسکرا دیے کہ شاید پرندوں کی چہچہاہٹ میں اچھے وقتوں کا سندیسہ ہو۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی دیپو جیوتی کے چلتر کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیتا مگر جیوتی سنی اَن سنی کر کے گھر کے کاموں میں جٹی رہتی۔

دونوں کے درمیان اب بات چیت بہت کم ہو گئی تھی۔

جیوتی اگر کبھی دیپو سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو اس کے جلے کٹے جواب سن کر خاموشی میں ہی عافیت سمجھتی۔ اس نے پلٹ کر دیپو کی کڑوی کسیلی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیا تھا جیسے ایسا کرنے سے اسے دھرم بھرشٹ کا اندیشہ ہو۔

ادھر کچھ روز سے جیوتی نے گاؤں کے مالشیئے کو دیپو کی کمر اور ٹانگوں کی باقاعدگی سے مالش کرنے کا کہہ دیا تھا۔ ہر دوسرے روز دینو کاکا ایک گھنٹے کے لیے دیپو کی مالش کرنے وقت پر پہنچ جاتا۔

پہلے پہل تو دینو کاکا کو دیکھ کر دیپو نے کچھ احتجاج کیا مگر پھر تھک ہار کر ہتھیار ڈال دیے۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے دیپو اپنی ٹانگوں میں ایک نئی توانائی محسوس کرنے لگا تھا۔

پھر ایک روز اس نے معجزاتی طور پر اپنے پاؤں کی انگلیوں کو حرکت کرتے ہوئے محسوس کیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے مہینے بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد اس کے پاؤں کی انگلیاں حرکت کرنے لگی تھیں۔ کبھی کبھی تو

اسے شک ہونے لگتا تھا کہ اس کے پاؤں کی انگلیاں واقعی حرکت کر رہی تھیں یا یہ اس کا وہم تھا۔ مگر کئی بار آزمانے پر بھی واقعی اس کے پاؤں کے انگوٹھے کے ساتھ والی دونوں انگلیاں ہل رہی تھیں۔ دیپو اس چمتکار پر حیران وششدر تھا۔ اسے تو لگتا تھا کہ اب وہ جیون بھر کے لیے کھاٹ کا ہو کر رہ جائے گا مگر اس نے اس بات کا ذکر نہ دینو کاکا اور نہ ہی جیوتی سے کیا کیونکہ اس کے من میں تو کچھ اور ہی پل رہا تھا۔

چند ہی ہفتوں میں اس کے دونوں پاؤں کی تمام انگلیاں حرکت کرنے لگی تھیں۔ اب وہ اپنے دونوں پاؤں ہلا جلا سکتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اس کی ٹانگوں میں جیسے جان پڑ رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی دلی کیفیت کو چھپا رہا تھا۔ اب وہ جیوتی سے بھی بدظن نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی اُسے کوسنے دیتا تھا۔ بس خاموش خاموش سا کھاٹ پر پڑا نیلے آکاش کو تکتا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا دکھائی دیتا تھا۔

دیپو سوچ رہا تھا کہ ایک دن جب وہ بالکل بھلا چنگا ہو کر چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا تو جیوتی کا پیچھا کر کے اسے رنگ ہاتھوں پکڑے گا اور اس چھنال کو جو ساری ساری رات گھر سے باہر رہ کر اپنے تن کی آگ بجھاتی تھی ساری پنچایت کے سامنے ننگا کرے گا کیونکہ اس نے ان کے خاندان اور اس کی سورگ باشی ماں کی نیک نامی پر کلنک لگا دیا تھا۔

دیپو اپنے مشن کی تکمیل کے بارے میں دن رات سوچتا رہتا تھا۔

جیوتی کو اب اس کی اس قدر گھمبیر خاموشی سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

''کیا بات ہے دیپو نہ اب بُرا بھلا کہتا ہے نہ ہی کوئی بات کرتا ہے۔ جو بھی کھانے کو دو خاموشی سے کھالیتا ہے ورنہ پہلے تو وہ غصے میں آکر اکثر کھانے سمیت ہی برتن آنگن میں پھینک دیا کرتا تھا۔'' جیوتی دن رات انہی سوچوں میں ڈوبی ہوتی تھی مگر سوچ کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

جیوتی کو گھر سے باہر جاتے ہوئے آج چالیسواں روز تھا۔ اب دیپو کی ٹانگوں میں اتنی توانائی آچکی تھی کہ وہ اس کا پیچھا کر سکتا تھا۔

آج شام ڈھلے جیسے ہی جیوتی نے گھر کی چوکھٹ پار کی، دیپو بھی آہستہ آہستہ قدموں سے قدرے فاصلے پر رہ کر اس کا پیچھا کرنے لگا۔ آج وہ بہت خوش تھا کہ جیوتی جیسی بدکار عورت کی پارسائی کا پردہ چاک کرنے جا رہا تھا۔

گھر سے کافی دُور بہنے والی ندی کے گھاٹ پر جا کر جیوتی رُک گئی اور ندی کنارے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ کافی دیر تک وہاں بیٹھی رہی۔ پھر ہاتھ اٹھا کر پرارتھنا کرتے ہوئے اس پر رقت طاری ہوگئی اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی مگر دیپو کو اتنے فاصلے پر ٹھیک سے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

چندرما کی چٹکی ہوئی چاندنی میں ندی کنارے بیٹھی ہوئی جیوتی کوئی اپسرا معلوم ہو رہی تھی۔ جسے دیکھ کر ایک مدت کے بعد دیپو کا دل بھی پگھلنے لگا مگر جلد ہی اس نے خود پر طاری ہونے والی مدہوشی پر قابو پالیا۔

پرارتھنا ختم کرنے کے بعد جیوتی نے ندی کے پانی سے منہ ہاتھ اور پاؤں دھوئے۔ پھر جیسے ہی وہ اٹھ کر واپس جانے کے لیے پلٹی تو اپنے پیچھے کھڑے دیپو کو دیکھ کر خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔

''دیپو، تم یہاں؟ تم کیسے آئے؟ تم اچھے ہو گئے ہو؟ تم چل سکتے ہو؟'' یہ کہتے کہتے وہ تقریباً بے ہوش ہو کر دیپو کے بازوؤں میں جھول گئی۔

دیپو نے ندی سے پانی لے کر جیوتی کے منہ پر چند چھینٹے مارے جس سے جیوتی ہوش میں آ گئی۔

''مجھے کسی گیانی نے چالیس راتیں ندی کے گھاٹ پر تپسیا کرنے کے لیے کہا تھا جس کا تمہیں پتا نہیں چلنا چاہیے تھا۔ میں ہر رات یہاں اسی لیے آیا کرتی تھی۔'' جیوتی نے جیسے اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہی۔

''بس چپ ہو جاؤ جیوتی!۔۔۔ تو اس ویرانے میں چالیس راتوں سے میرے لیے آ رہی تھی اور میں تم سے اس قدر بدگمان تھا۔۔۔ دھتکار ہے مجھ پر۔۔۔ دھتکار ہے!''

جیوتی کے آنسو جھر جھر بہہ رہے تھے۔ دیپو نے روتی ہوئی جیوتی کو پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا: ''تم نے یہ سب مجھ سے کیوں چھپایا؟ چھنال کہیں کی!''

دیپو کی بات سن کر جیوتی شرم سے لال ہو کر بیر بہوٹی بن گئی۔

دور گھاٹ پر رات کے سناٹے میں کسی منچلے کے گانے کی آواز آ رہی تھی:

کھلے شگوفے پیڑوں پر، رُت پیا مِلن کی آئی
من ہی من دیکھ کے اُس کو، گوری ہے شرمائی

روح کا نظارہ

چین نے دنیا کے سب سے طاقتور دماغ کا اسکینر تیار کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ یہ اسکینر انتہائی مضبوط مقناطیسی فیلڈ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھے گا۔ جس سے انسانی دماغ میں ہر نیوران کی ساخت اور سرگرمیوں کا مشاہدہ ہو سکے گا۔ یہ Magnetic Resonance Imaging نہ صرف تصویر (سنیپ شاٹ) فراہم کرے گا بلکہ اعصابی نظام میں اہم سگنل دینے والے سوڈیم فاسفورس اور پوٹاشیم جیسے کیمیائی ایجنٹس کی بھی نشاندہی کرے گا جن سے پارکنسنز اور الزائمر جیسی بیماریوں کے مطالعے میں مدد ملے گی۔ دماغی مطالعے میں یہ آلہ مختلف تصاویر پیش کرے گا جو اس سے پہلے دنیا کے سامنے نہیں آسکی یہاں تک کہ اس آلہ کی مدد سے روح کو بھی دیکھا جا سکے گا۔

مختصر کہانیاں

مشتاق اعظمی

(اسنسول، بھارت)

خدا کا بندہ

وہ شہر کی ایک عظیم الشان مسجد تھی۔ ایمان کی حرارت والوں کی شب و روز محنت اور عزم و حوصلے کا نادر کارنامہ۔ آج سے کوئی پچاس برس پہلے اس کی تعمیر میں پورے پندرہ لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ مسجد کی دیواروں اور محرابوں پر جا بجا لال، ہرے، پیلے اور نیلے رنگوں کی گلکاریاں تھیں۔ بیرونی لوگ اس شہر میں آتے تو مسجد کی آرائش و زیبائش اور اس کے چھوٹے بڑے گنبد والے میناروں کو دیکھ کر مسلمانانِ شہر کی دینی حمیت اور اعلیٰ ذوق کی تعریف کیا کرتے تھے۔

مسجد کے وسیع و عریض صحن میں ہوا بھی خوب آتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے باغِ جنت کا کوئی دریچہ اسی رخ میں کھول دیا ہو۔ پڑوس اور اطراف کے اکثر لوگ ہر شب تکیہ بستر بغل میں دبائے اس صحن میں پہنچ جاتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بھولا بھٹکا مسافر بھی شب گزاری کی نیت سے وہاں آ جاتا تھا۔

صبح کی اذان کے بعد مؤذن سونے والوں کے پاس آتا اور ایک ایک کو جھنجوڑ کر جگایا کرتا تھا کیونکہ ان میں سے کچھ لوگ صبح کی نماز بھی پڑھا کرتے تھے۔

ایک دن صبح کی اذان کے بعد مؤذن نے حسب معمول لوگوں کو جگانا شروع کیا اور جب اس نے ایک اجنبی مسافر کو جگانے کی کوشش کی تو اس نے ''اوں۔۔۔اوں۔۔۔'' کرتے ہوئے دوسری کروٹ لے لی۔ مؤذن نے کہا

''اللہ کے بندے اٹھو بھی۔۔۔نماز پڑھ لو۔ چاہے پھر سو جانا!''

''ن۔۔۔ما۔۔۔ج'' مسافر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا یہ مسجد ہے؟''

مسافر کے سوال میں حیرانی تھی۔۔۔''ہاں! تم نے کیا سمجھا تھا؟''

مؤذن کے جواب میں استفسار شامل تھا۔ ''دھرم شالہ!۔۔۔'' سادہ لوح مسافر انگوچھا اپنے کندھے پر رکھتے ہوئے اُٹھا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

حرامزادے

شہر میں فساد کی آگ تو سرد پڑ چکی تھی لیکن مئی کی چلچلاتی دوپہر اب بھی قہر برسا رہی تھی۔ پولیس لائن میں بنے سرکاری کوارٹروں کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے تاکہ گرم ہوا کی کوئی لہر اندر نہ جانے پائے۔

دفعتاً کوئی زور سے چیخا ''پکڑ لو!''

یوں لگا جیسے کالونی میں فائر ہوا ہو۔۔۔دروازے کھٹاک کھٹاک کھلنے لگے۔

''ہاں، پکڑ لو! جانے نہ پائے۔۔۔'' ایک ساتھ کئی آوازیں ایک دوسرے کے تعاقب میں شامل ہو گئیں۔ چشمِ زدن میں پولیس کے متعدد جوانوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ لات مکّے چلنے لگے۔

انکشاف ہوا ''پولیس چوکی پر بم کے گولے اسی نے پھینکے تھے''

تائید ہوئی ''سب انسپکٹر اسی کے بم سے مرا تھا''

یہ سننا تھا کہ اس پر رائفلوں کے کندوں کی بارش ہونے لگی۔۔۔وہ تڑپا، چھٹپٹیا اس کے بعد بے سُدھ ہو گیا۔

ایک پولیس مین تھوڑی دور جا کر ایک وزنی پتھر اٹھا لایا۔ اس نے وہ پتھر بے سدھ پڑے ہوئے آدمی کے سر پر پوری قوت سے دے مارا، گویا اس نے پولیس برادری کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا۔

اس درمیان میں پولیس کالونی کے تمام جوان وہاں اکٹھا ہو چکے تھے۔ لاش زمین پر یوں پڑی تھی جیسے کسی کو خون کی چادر پر لٹا دیا گیا ہو۔ پولیس والوں کے چہرے پر سرخی تھی۔ انہوں نے ایک فرقہ کے اُس نامی بدمعاش کو ختم کر دیا تھا جس نے شہر کے حالیہ فساد میں پولیس چوکی کو بم کا نشانہ بنایا تھا۔

اتنے میں بھیڑ کو چیرتا ہوا ایک پولیس افسر تیزی سے آگے آیا۔ وہ بڑی دیر تک لاش کے بگڑے ہوئے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔۔۔اور پھر یکایک وہ پھٹ پڑا۔

''یہ کیا کیا تم لوگوں نے؟ اپنے ہی آدمی کو مار ڈالا؟''

پولیس کے جوان پیچھے ہٹنے لگے۔ افسر روہانسا ہو کر بولا۔

''بے وقوفو! یہ وہ کتّا نہیں جس نے پولیس چوکی پر حملہ کیا تھا۔۔۔یہ تو اپنا سورما تھا۔۔۔سورما۔۔۔اس نے تو اس بس کو پٹرول چھڑک کر پھونک دیا تھا جس میں حرام زادوں کے بچے اسکول جا رہے تھے!''

ذہانت

سائنسی ماہرین نے نئی تحقیق میں دعویٰ کیا ہے کہ بچوں میں ذہانت ماں سے منتقل ہوتی ہے۔ تازہ ترین تحقیق کے مطابق ماں کی جینیاتی خصوصیات طے کرتی ہیں کہ بچہ کتنا ذہین ہوگا۔ ریسرچ کے مطابق ذہانت کا تعلق ایکس کروموسوم سے ہوتا ہے جو خواتین میں دو ہوتے ہیں جس کے باعث ماں کی دماغی صلاحیتیں بچے میں منتقل ہوتی ہیں۔ جبکہ باپ میں ایکس کروموسوم کی تعداد صرف ایک ہوتی ہے اس لیے والد سے بچے کو موروثی طور پر ذہانت نہیں ملتی۔

میں نے ایک زندگی بچائی

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

میرا دوسرا سمسٹر ختم ہو گیا تھا، نیا سمسٹر دو ہفتے کے بعد شروع ہونا تھا۔ یونیورسٹی کے ساتھ زندگی کتنی مصروف ہو جاتی ہے۔۔۔

صبح جلدی اٹھنا، یونیورسٹی بھاگنا اور یونیورسٹی میں ایک کلاس مشرق میں ہے تو ایک مغرب میں، دوڑتے دوڑتے حشر ہو جاتا ہے پھر لائبریری میں بیٹھ کر سمسٹر کی تیاری کرنا۔ بہر حال دوسرے سمسٹر سے جان چھوٹ گئی تھی اور میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی تھی۔

ایک بڑا بوجھ جو اتر گیا تھا میرے سر سے۔ جی ہی جی میں چھٹیوں کا پلان کرتی جاتی اور اپنا پسندیدہ گیت گنگناتی جاتی۔۔۔ مجھے اگلے سمسٹر کی تیاری شروع کر دینی چاہئے، ہائی پر سینٹیج جو لانا ہے۔۔۔ لیکن نہیں اگلا سمسٹر تو ابھی دور ہے کیوں نہ میں لندن بھائی کے پاس چلی جاؤں وہ مجھے کب سے بلا رہے ہیں۔ میں نے سوچا۔ اور بھی بہت سی چیزیں کرنے کے لئے ذہن میں آرہی تھیں۔

پھر میں نے سوچا اپنی Best Friend سعدیہ سے بات کرتی ہوں۔ سعدیہ نے ہائی اسکول کے بعد جوب شروع کر دی تھی لیکن ہماری دوستی اب بھی اسی طرح برقرار تھی۔ فون ملایا اور اس کو خوشی خوشی بتایا کہ "میرا سمسٹر ختم ہو گیا ہے اور نئے سمسٹر میں دو ہفتے باقی ہیں، ہم کچھ دنوں کی چھٹیاں پلان کر سکتے ہیں۔"

"سوری یار! مجھے جوب کی طرف سے First Aid Instructor Training کے لئے بھیجا جا رہا ہے یہ ٹریننگ دو ہفتے کی ہے اور چونکہ جوب کی طرف سے لازمی ٹریننگ ہے، اس لئے چھٹی بھی نہیں مل سکتی۔"

سعدیہ اور میں تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر اچانک سعدیہ بولی۔

"شرمین! تم بھی کیوں نہ میرے ساتھ یہ ٹریننگ جوائن کر لو ہم دونوں کا ساتھ بھی رہے گا اور تمہیں First Aid Instructor Training کا کریڈٹ بھی مل جائے گا۔"

"ابھی تو اتنی جان جوکھم سے کچھ دنوں کے لئے نجات ملی ہے اور پھر ایک نئی مشقت۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو جوب کی طرف سے بھیجا جا رہا ہے۔ لیکن اگر تم چاہو تو اس ٹریننگ کے بعد گھر بیٹھے آرام سے جوب بھی کر سکتی ہو۔ انٹرنیٹ پر اگر ڈال دو گی تو جن اداروں کو ضرورت ہے وہ خود ہی تم سے رابطہ کر لیں گے۔"

"چلو اچھا میں سوچتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

میں تو ان چھٹیوں میں خوب گھومنا پھرنا چاہتی تھی۔ پڑھائی کرتے کرتے تھک گئی تھی، تھوڑا Relax ہونا چاہتی تھی اور اب یہ دو ہفتے کی ٹریننگ۔۔۔ مگر اکیلے گھومنے پھرنے میں مزہ بھی نہیں آئے گا۔ بھائی کے پاس جاؤں گی وہ سب بھی مصروف ہوں گے۔ صبح سے چار بجے تک میں گھر میں اکیلی رہونگی، بیٹھے بیٹھے ٹی وی دیکھتی رہوں گی۔ چار بجے کے بعد ہی بھائی، بھابی اور بچے آتے ہیں۔ اور پھر کہیں گھومنے پھرنے جانے کے لئے ویکنڈ کا انتظار۔۔۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر نیچے گئی۔ backyard کا شیشہ ہٹا کر ڈیک پر کھڑی ہو گئی۔ پورا بیک یارڈ باغ و بہار بنا ہوا تھا گلابی رنگ کے پھول اور لال رنگ کے پھول ایک دوسرے پر اپنے رنگوں کی مدد سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور ایک گوشے میں چنبیلی اور موگرے خوش فعلیوں میں مصروف تھے۔ بھینی بھینی خوشبو سے پورا ماحول معطر تھا۔ تھوڑی دیر تک میں اس نظارے سے لطف اندوز ہوتی رہی پھر اندر آکر فیملی روم میں صوفے پر بیٹھ گئی ٹی وی پر میرے چھوٹے بھائی کا بچوں کا پروگرام چل رہا تھا۔ چھٹی کے دن صبح کے وقت ٹی وی پر ان کا حق ہوتا ہے۔ کیا مجال جو کوئی ان کا پروگرام تبدیل کر سکے۔ میں بھی دیکھنے لگی، اتفاق سے First aid کے متعلق بتایا جا رہا تھا، جس وقت میں نے دیکھنا شروع کیا اس وقت CPR کر کے دکھایا جا رہا تھا۔ مجھے یہ پروگرام دیکھکر بہت مزہ آیا۔ اس پروگرام کی وجہ سے مجھے اس فیصلے تک پہنچنے میں بہت مدد ملی کہ مجھے چھٹیاں گھومنے پھرنے میں گزارنا چاہئے یا پھر سعدیہ کی بات ماننا چاہئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے First aid کی ٹریننگ لے لینا چاہئے۔ ٹریننگ کے ساتھ ساتھ سعدیہ کا ساتھ بھی رہے گا۔ سعدیہ اور میری دوستی پہلی کلاس سے شروع ہوئی اور اب تک ہم دونوں بہت اچھے دوست تھے۔ سمر کی چھٹیاں جب ہوتی تھیں تو سب لوگ بہت خوش ہوتے تھے مگر میں اور سعدیہ بہت اداس ہوتے تھے کہ اب ہم روزانہ مل نہیں پائیں گے۔

لیکن پھر بھی ہر دوسرے تیسرے دن میں سعدیہ کے گھر ہوتی تھی۔۔۔ یا پھر سعدیہ میرے گھر۔۔۔ اسکول کے بعد سعدیہ کو جوب کرنا پڑی اور میں نے یونیورسٹی جوائن کر لی۔ ہم دونوں ہی اتنے زیادہ مصروف ہو گئے تھے کہ کئی کئی دنوں تک ہم نہیں مل پاتے، البتہ دو تین روز میں فون پر بات ہو جاتی۔۔۔ میں اس بات سے بہت خوش تھی کہ اتنے عرصے کے بعد اسی بہانے کچھ عرصہ ہم دونوں کا ساتھ رہے گا۔ میں نے سعدیہ کو فون ملایا اور بتایا کہ میں تمہارے ساتھ ٹریننگ جوائن کر رہی ہوں۔

"سچ!" اس نے خوشی سے بھر پور لہجے میں چیخ کر کہا۔ پھر بولی "شرمین! تمہارے اس فیصلے سے میں کس قدر خوش ہوں تمہیں اندازہ نہیں"

اور یوں سارے گھومنے پھرنے کے خیالی پلاؤ کو چھوڑ کر میں نے ٹریننگ جوائن کر لی۔ دو ہفتے تک ہم دونوں دوست ساتھ رہے۔ ساتھ لنچ کرتے، باتیں کرتے، خوش ہوتے، خوب ہنستے اور ٹریننگ کی ذمہ داریوں کو بھی پورے

انہماک سے نبھاتے۔ دو ہفتے ایسے گزرے کہ پتہ بھی نہیں چلا۔

ان دو ہفتوں کو پلٹ کر دیکھا تو ٹریننگ لینے پر بڑی طمانیت ملی۔ میں نے سوچا چھٹیوں میں بہت اچھا وقت گزرا۔ یہ ٹریننگ کتنی اہم اور لازمی ہے۔ اندر ہی اندر میں نے یہ چاہا کہ ''میری مانند میرے سب جاننے والے اس ٹریننگ سے مستفید ہوں۔''

پھر میں نے سوچا کہ میں ایسے لوگوں کے مقابلے میں کچھ ''خاص'' ہوں جن کو یہ ٹریننگ حاصل نہیں۔

وقت گزرتا رہا۔ میری یونیورسٹی ختم ہوگئی تھی۔ مصروفیتوں میں کمی نہیں آئی تھی البتہ بدلتے موسموں کی مانند یہ مصروفیتیں بھی بدل گئیں تھیں اور ہاں شہر بھی بدل گیا تھا۔ سعدیہ بھی بچھڑ گئی تھی، یونیورسٹی کے سب ساتھی بھی کب کے بچھڑ گئے تھے۔ نئے شہر میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

سمر کی ایک شام میں واک کرتی ہوئی بازار جارہی تھی جو میرے گھر سے بہت نزدیک تھا۔ ابھی کچھ دور ہی گئی ہونگی کہ سائڈ واک پر ایک بھیڑ نظر آئی، میں رک گئی۔ پہلی سوچ میرے ذہن میں آئی کہ بھیڑ سے ہٹ کر گزر جاؤں۔ مجھے بھیڑ بھاڑ سے ویسے بھی بہت وحشت ہوتی ہے۔ لیکن میرے قدم میری خواہش کے خلاف آگے بڑھتے گئے۔ میرا تجسس بڑھا یا شاید کوئی قوت مجھے آگے دھکیلنے لگی، میں مجمعے میں جگہ کرتی ہوئی آگے کی طرف بڑھی تو دیکھا ایک شخص زمین پر پڑا تھا اس کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا۔ بچوں کے پروگرام میں جو فرسٹ ایڈ'' دیکھا تھا اور پھر سعدیہ کے ساتھ ٹریننگ میں جو کچھ سیکھا تھا وہ میرے اندر سے باہر آرہا تھا۔ ''اس آدمی کو فوری طور پر CPR دینا ہوگی۔ کسی کو آتا ہے تو آگے آئے میری مدد کے لئے۔'' میری آواز میں تحکم نجانے کہاں سے آگیا تھا بہرحال یہ میری آواز نہیں تھی۔ مجمع نے مجھے جگہ دی اور میں نے یہ کہتے ہوئے کہ جلدی سے کوئی 911 کال کردے اس شخص کے نزدیک جاکر زور سے آواز لگائی ''Are u ok'' پھر اس کے دونوں شانوں کو ہلایا۔ کوئی Response نہ ملنے پر میں نے CPR شروع کردی '' with 30 chest compressions ,before 2 Rescue breaths'' پہلے میں نے دو مرتبہ منہ کے ذریعے سانس پہنچائی اور پھر تیس چیسٹ کمپریشنز دیئے۔ تین مرتبہ یہ عمل دوہرانے کے بعد جیسے ہی چوتھی مرتبہ چیسٹ کمپریشنز شروع کئے تو اس نے اچانک سانس لی، اور پھر آہستہ آہستہ اس کی سانس بحال ہونے لگی، وہ ایک بار پھر جیتی جاگتی دنیا میں واپس آگیا۔ اسکے دل کا پمپ دھڑک دھڑک کر پورے بدن کی نسوں میں خون دوڑانے لگا۔ اس کے چہرے کا نیلا پن بھی کم ہوتا چلا گیا۔ اسی دوران 911 والے آگئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''میرا مریض'' (اس شخص کو اپنا مریض ہی کہونگی اگر چہ میں ڈاکٹر نہیں تھی) پیرامیڈ کے ہاتھوں میں تھا۔ میں وہاں سے جانے کو ہوئی تو پیرامیڈ کا سینئیر آفیسر میری طرف بڑھا، چمکتی ہوئی آنکھوں سے اس نے مجھے دیکھا میرا شکریہ ادا کیا اور میرا نام اور فون نمبر لے لیا۔

وہاں پر موجود اتنے لوگوں میں سے کسی کو بھی CPR دینا نہیں آتی تھی۔ میں۔۔۔ میرا سارا وجود سرشار تھا۔ میں شاید خوش تھی۔۔۔ خوش ہی نہیں بے حد خوش تھی۔ ''کیا سچی خوشی ایسی ہی ہوتی ہے؟'' میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔۔۔ یا شاید اپنے آپ کو یقین دلایا۔

فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ لیے ہوئے دو سال ہوچکے تھے، میں نے اس کو کبھی دوہرایا بھی نہیں تھا، جب کہ کرنا چاہئے تھا۔

لیکن ۔۔۔ میرے خدا نے مجھ سے یہ کام کروالیا۔ میں ایک زندگی بچانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ متعلقہ محکمے نے ایک تقریب میں مجھے اعزازی سند اور تمغے سے بھی نوازا۔۔۔ اس کے لئے بھی ان سب کی اور اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں۔

''پُر مشقت دن''

ابوالکلام اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی والدہ ملازمت بھی کرتی تھیں اور گھر کا کام کاج بھی وہی کرتی تھیں۔

ایک رات کھانے کے وقت انہوں نے سالن اور جلی ہوئی روٹی میرے والد کے آگے رکھی۔ میں والد کے ردعمل کا انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ غصہ کا اظہار کریں مگر انہوں نے انتہائی سکون سے کھانا کھایا اور پھر مجھ سے دریافت کیا کہ آج سکول میں میرا دن کیسا گزرا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا جواب دیا لیکن اسی اثنا میں میری والدہ نے روٹی جل جانے کی معذرت کی۔ مگر میرے والد نے کہا کہ ان کو یہ روٹی کھا کر لطف آیا۔ اسی رات اپنے والد کو شب بخیر کہنے میں ان کے کمرے میں گیا تو ان سے سوال کیا کہ کیا واقعی انہیں جلی روٹی کھا کر لطف آیا؟ انہوں نے پیار سے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور جواب دیا کہ تمہاری والدہ نے ایک پُر مشقت دن گزارا اور پھر تھکنے کے باوجود گھر آکر ہمارے لئے کھانا بھی تیار کیا۔۔۔ ایک جلی ہوئی روٹی کچھ نقصان نہیں پہنچاتی مگر تلخ ردعمل اور بدزبانی جذبات کو مجروح کرتی ہے۔

میرے بچے!

زندگی بے شمار ناپسندیدہ اشیا اور شخصیات سے بھری ہوئی ہے۔ میں بھی کوئی بہترین یا مکمل انسان نہیں ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے اردگرد لوگ اور عزیز واقربا بھی غلطی کرسکتے ہیں۔ لہذا ایک دوسرے کی غلطیوں کو درگزر کرنا، رشتوں کو بخوبی نبھانا اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنا ہی تعلقات میں بہتری کا سبب بنتا ہے۔ زندگی اتنی مختصر ہے کہ اس میں معذرت اور پچھتاوں کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔

نجات دہندہ

اے۔خیام
(کراچی)

اُس روز تحفے تحائف سے لدے پھندے وہ گھر پہنچے تو سب حیرت زدہ رہ گئے۔ان سبھوں کو تشویش تھی کہ وہ بہت رنجیدہ ہوں گے، چہرہ لٹکا ہوا ہوگا، آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔انھوں نے سارے تحائف میز پر رکھ دیے اور سب کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی بڑا معرکہ سر کر کے آرہے ہوں۔

انھوں نے باری باری سب کی طرف دیکھا، پھر بولے،''بھئی کیا تم لوگ میری آزادی سے خوش نہیں ہو؟''

سب پھر بھی خاموش رہے۔

''ہاں بھئی کمانڈر!تم تو کچھ بولو۔''

''ڈیڈی ہم تو سمجھ رہے تھے.....''مظہر نے اپنے بات پوری نہیں کی۔

''یار ریٹائر ہی تو ہوا ہوں۔اور یہ تو ہونا ہی تھا۔چھتیس سال تک اپنا خون پسینہ ایک کرتا رہا ہوں۔اچھے بُرے اوقات کو خوشی خوشی قبول کر لینا چاہیے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے ڈیڈی،اور اب ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔اب آپ آرام کریں،چھتیس سال بہت ہوتے ہیں۔''

''نہیں بیٹے،ابھی مجھے ایک بہت ضروری کام کرنا ہے،اور شاید اسی لیے میں خوش بھی ہوں کہ اب میں وہ کام سرانجام دینے کے قابل ہوسکوں گا۔''

پھر ایکدم خاموشی چھا گئی۔مظہر نے مما کی طرف دیکھا۔طاہر نے نظریں اٹھائیں،مما کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔

''میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں ڈیڈی۔''مریم اٹھ گئی۔

''بھئی تم لوگ کیا کیا سوچ رہے ہو؟ میں واقعی ایک مہینہ خوب اچھی طرح کام کروں گا......اور بی بی تم بھی تو کچھ بولو۔''

صائمہ نے کچھ نہیں کہا۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی، بے جان سی مسکراہٹ تھی۔سب ان کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

''اب تو آرام ہی آرام ہے۔میں نے تو سب نبٹا دیا،اب کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔آپ گھر میں ہوں گے تو خوب باتیں کروں گی، ڈھیر ساری باتیں،جی بھر کر۔''

یہ کہتے ہوئے صائمہ کی آواز بھرا گئی جیسے وہ جی بھر کر باتیں نہیں، جی بھر کر رونا چاہتی ہوں۔

مریم چائے لائی تو گفتگو نے ذرا سا دوسرا رخ اختیار کر لیا۔

''تم سب لوگ مجھے ڈھارس دینے کو اکٹھے ہوئے تھے نا؟''

''جی ڈیڈی۔ ہم نے سمجھا تھا کہ آپ ریٹائرمنٹ پر بہت افسردہ ہوں گے۔آج آپ کی ملازمت کا آخری دن تھا۔پتہ نہیں آپ کیسا محسوس کریں گے اس لیے،ہم سب یکجا ہوگئے۔''

''چلو اسی بہانے سب یکجا تو ہوگئے۔تم سب مل بیٹھتے ہو تو ہمارا خون سیروں بڑھ جاتا ہے۔''

مظہر تو اسی شہر میں تھا۔طاہر پشاور سے آگیا تھا اور مریم ابوظہبی سے آگئی تھی۔

''بھئی کمانڈر تم تو وردی میں ہمارے سامنے آیا کرو۔بہت اچھا لگتا ہے۔''

مظہر مسکرا کر رہ گیا۔

کچھ دنوں پہلے ہی انھوں نے سب کو بتادیا تھا کہ وہ کب ریٹائر ہو رہے ہیں۔دونوں بیٹے تو پہلے ہی اصرار کرتے رہے تھے کہ انھیں اب ریٹائرمنٹ لے لینی چاہیے۔مظہر ونگ کمانڈر تھا،شادی ہوچکی تھی اور ایک بیٹی کا باپ بھی بن گیا تھا۔طاہر انجینیر تھا،ایک اچھی فرم میں اچھے عہدے پر ملازم تھا،مریم اپنے گھر بس چکی تھی۔ بظاہر وہ ہر طرح اپنی ذمہ داریاں پوری کرچکے تھے۔کئی بار گھر میں اس بات پر خوب گرما گرم بحث بھی ہوئی کہ ڈیڈی ریٹائرمنٹ لے کر بیٹوں کے پاس رہنے لگیں۔ انھوں نے کبھی زیادہ سنجیدگی سے اس موضوع پر بات نہیں کی۔بس وہ صائمہ کی طرف دیکھتے،مسکراتے، پھر کچھ افسردہ سے ہو جاتے۔ اس روز بھی کھانے کے بعد یہی موضوع چل نکلا،مریم بھی بھائیوں کی ہم نوا بن گئی،لیکن ان کا رویہ وہی رہا۔

''بھئی اگر دفتر والوں نے بہت تعاون کیا تب بھی واجبات کی وصول میں مہینہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔پھر اپنے کام میں لگ جاؤں گا۔''

''کوئی نئی ملازمت......؟''کسی نے پوچھا۔

''نہیں بھئی،اب ملازمت نہیں۔''

وہ خاموش ہوگئے۔ایزی چیئر کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔چہرے پر جیسے ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔

اگلے روز مظہر ماری پور واپس چلا گیا اور اس سے اگلے روز بیوی اور بیٹی کو وہاں چھوڑ گیا۔ ہفتے بھر بعد طاہر پشاور لوٹ گیا اور مریم پندرہ دنوں بعد ابوظہبی چلی گئی۔ چند دنوں بعد مظہر بیوی اور بیٹی کو لے گیا۔بھرا پُرا گھر آہستہ آہستہ خالی ہوا اور اس دوران ان کے دفتر والوں نے ان سے بے حد تعاون کیا۔مہینے بھر میں ان کے واجبات انھیں ادا کر دیے گئے۔کبھی کبھی دفتر سے کوئی پرانا ساتھی ان سے ملنے آ جاتا اور اسے کبھی کبھی دفتر میں آکر سب سے ملاقات کرنے کی تاکید بھی کر جاتا۔

''بی بی!اب میں اپنا کام شروع کروں؟''

صائمہ کچھ نہیں بولیں۔وہ انھیں دیکھتے رہے۔

''میں نے بہت زیادتی کی ہے تمھارے ساتھ۔سب کچھ دیکھتا رہا، سمجھتا رہا اور کچھ بھی نہ کر سکا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ! اتنی خوشیاں دی ہیں آپ نے...... مجھے اور کیا چاہیے تھا۔''

''نہیں بی بی، مجھے اعتراف کر لینے دو۔ بہت دیر ہوگئی بی بی......''

''کوئی کر بھی کیا سکتا تھا!'' صائمہ نے آہستہ سے کہا۔

انھوں نے صائمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے وقت لے لیا ہے۔ کل تمھیں لے چلوں گا۔''

صائمہ نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا، پھر ہنس پڑیں۔

''آپ ڈاکٹر کے پاس لے چلیں گے؟ ہسپتال؟''

''ہاں...... کیوں؟''

''آپ کسی کی عیادت کرنے تو کبھی ہسپتال گئے نہیں۔ اپنے بچوں کی پیدائش پر بھی ہسپتال کے باہر ٹہلتے رہتے تھے، آپ اور ہسپتال جائیں گے؟''

وہ پھر ہنس پڑیں۔

''بھئی اب ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ کچھ جھینپتے ہوئے بولے، ''میں نے ہسپتال جا کر ڈاکٹر سے تمھارے لیے وقت لیا ہے۔ تم دیکھ لینا، کل میں تمھارے ساتھ رہوں گا۔''

اگلے روز وقت مقررہ پر دونوں ہسپتال پہنچے۔ صائمہ بار بار انھیں دیکھتیں اور جیسے ڈھارس دینے کے انداز میں ان کا ہاتھ پکڑ لیتیں۔ لیکن ان کا رویہ پہلے جیسا نہیں تھا۔ وہ قدم جما جما کر چل رہے تھے۔ ڈاکٹر کے پاس بیٹھ کر صائمہ کے بارے میں بتاتے رہے۔ صائمہ نے پھر خود ہی اپنی کیفیت اور استعمال میں رہنے والی دواؤں کے بارے میں بتایا۔

''دیکھیے ذرا جم کر علاج کرانا ہوگا، ذرا سی کوتاہی مشکل پیدا کر دے گی۔''

''جی ڈاکٹر۔ میں پوری طرح تیار ہوں۔'' انھوں نے بڑے عزم سے کہا۔

ڈاکٹر نے کئی ٹیسٹ تجویز کیے۔ ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ، سی ٹی اسکین، ایم آر آئی، خون کا ٹیسٹ اور پتہ نہیں کتنی دوائیں پابندی سے استعمال کرنے کی تاکید کی۔ وہ سب کچھ بڑی توجہ سے سنتے رہے اور اگلے دن سے ہسپتال اور ڈائگنوسٹک کے مراکز اور لیباریٹریوں کی دوڑ لگنے لگی۔ وہ سب کچھ بڑی تندہی اور پوری توجہ سے کر رہے تھے۔ صائمہ انھیں متفکر دیکھتیں اور پھر انھیں سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

''سنئے، ان باتوں سے کیا حاصل...... خواہ مخواہ پیسے بھی برباد کر رہے ہیں اور پریشان بھی ہو رہے ہیں۔''

''بی بی، پہلے خواہش تھی کہ پیسے ہوں تو برباد کروں، اب ہیں تو برباد کر رہا ہوں۔'' انھوں نے ذرا غیر سنجیدگی سے کہا۔

''میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔ اب کوئی فائدہ نہیں۔''

''کیوں فادہ نہیں۔ ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا، کہہ رہا تھا علاج ممکن ہے۔''

صائمہ نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ان کی آنکھوں میں وہی مایوسی ڈھونڈ رہی تھیں جو خود ان کی اپنی آنکھوں میں تھی، لیکن انھیں ایسا کچھ نظر نہ آیا۔

''بی بی، ذرا اپنی قربانیوں پر تو غور کرو۔ اولاد کی بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت، ان کی تمام ضروریات کو ہر چیز پر فوقیت، شادی بیاہ، ہر چیز کے لیے تم قربانیاں دیتی رہیں۔ اپنا دکھ، اپنی تکلیف، سب چھپائے رکھا کیونکہ تمھاری ترجیحات کچھ اور تھیں!''

صائمہ نے آہستہ سے کہا، ''کیا میری ترجیحات غلط تھیں؟''

ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ شاید ان کی ترجیحات بھی ایسی ہی تھیں۔

''ٹھیک ہے بی بی، تم نے سب ٹھیک کیا۔ لیکن اب میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، وہ بھی ٹھیک ہے نا!''

''آپ شاید سمجھ نہیں رہے ہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا اور ویسے تو...... تب بھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔''

وہ انھیں ہسپتال لے جاتے، وہ چل دیتیں۔ وہ ٹیسٹ کے لیے لے جاتے، وہ اعتراض نہ کرتیں۔ دوائیں پابندیٔ وقت کے ساتھ دیتے، وہ لے لیتیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق جب وہ پہلی بار کیموتھراپی کے لیے جانے لگیں تو بولیں، ''سنا ہے اس میں بڑی تکلیف ہوتی ہے!''

انھوں نے فوراً کچھ نہیں کہا، ''ڈاکٹر نے تو ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن اگر ذرا سی تکلیف سے بہتری کی امید ہے تو......''

لیکن انھیں اپنے ساتھ ہسپتال میں جاتے ہوئے وہ اب بھی ان کا ہاتھ پکڑ لیتیں جیسے انھیں ڈھارس دے رہی ہوں۔

کیموتھراپی کا پہلا سیشن شروع ہوا تو ایسا لگا جیسے انھیں بُری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ جیسے انھیں دیر تک ہر طرف سے کچلا جاتا رہا ہو۔ انھوں نے صائمہ کی طرف دیکھا تو خود بھی لرز سے گئے۔

صائمہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا، ''مجھے گھر لے چلیے۔''

راستے میں انھوں نے صائمہ سے پوچھا، ''اگر کہو تو بچوں کو بلا لوں۔'' پھر جلدی سے بولے، ''تمھارا دل بہلا رہے گا۔''

صائمہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، ''نہیں...... وہ پریشان ہو جائیں گے۔''

پھر صائمہ کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ انھیں اپنے اندر توانائی سی محسوس ہونے لگی۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا۔

''اگلا سیشن چھ مہینے کے بعد ہوگا۔ تب تک آپ دوائیں پابندی سے لیتی رہیں۔''

صائمہ نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر طمانیت تھی۔

اس دوران طاہر کئی بار آیا۔ مظہر کبھی بیوی اور بیٹی کے ساتھ آ جاتا، کبھی یہ دونوں ماری پور جا کر ایک دو روز بیٹے کے پاس رہ جاتے۔ کچھ دنوں

صائمہ کی طبیعت بہتر رہی پھر مردنی چھانے لگی۔ کیموتھراپی کے دوسرے سیشن کے لیے جاتے ہوئے وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''سنئے، بڑی تکلیف ہوتی ہے۔''

''پہلے سیشن سے تمھیں فائدہ ہوا تھا نا، اب دیکھنا، بالکل بھلی چنگی ہو جاؤ گی۔''

وہ بے جان سی ہو کر اٹھیں اور ان کے ساتھ چل دیں۔ سیشن کے بعد وہ ڈہیل چیئر پر باہر لائی گئیں۔ ایک دو دن کے بعد انھوں نے خاصا افاقہ محسوس کیا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، دو سیشن اور ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ جھیل گئیں تو مکمل صحت یابی ممکن ہے۔ چند دنوں بعد وہ پھر انھیں پابندی سے چہل قدمی کے لیے لے جانے لگے۔ پھر وہ گھر کے کام کاج بھی کرنے لگیں۔ انھوں نے ایک دن ڈاکٹر سے پوچھا۔

''ڈاکٹر، اگر انھیں کسی مغربی ملک لے جایا جائے تو......''

''کیموتھراپی سے آگے اور کوئی چیز نہیں۔ دوسری جگہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں ایک لیکچر کے سلسلے میں ہیوسٹن گیا تھا اور اس کیس کو زیر بحث لایا تھا۔ سب نے اتفاق کیا تھا کہ یہی سب کچھ درست ہے جو ان کے ساتھ ہو رہا ہے۔''

''پھر بھی ڈاکٹر......''

''اگر آپ مطمئن نہیں تو اور بات ہے۔''

''نہیں ڈاکٹر، ایسی بات نہیں۔ میں صرف ممکنات پر غور کر رہا تھا۔''

''آپ تو بڑی دلجمعی سے علاج کرا رہے ہیں۔ اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ اپنی بساط سے زیادہ ہی......''

ڈاکٹر نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور انھوں نے ایک نظر ڈاکٹر کو دیکھ کر اس طرح سر ہلایا تھا جیسے کہہ رہے ہیں، آپ کا اندازہ درست ہے۔

کیموتھراپی کے تیسرے سیشن کے بعد وہ خود بھی ٹوٹ پھوٹ گئے لیکن ان کے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی کہ وہ صائمہ کے لیے کچھ بھی کریں گے۔ ایک دن وہ الماری سے کاغذات نکال کر الٹ پلٹ کر رہے تھے کہ صائمہ کی نظر ان پر پڑ گئی۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں، ویسے ہی دیکھ رہا تھا کیا کیا کچھ پڑا سڑ رہا ہے۔''

صائمہ نے انھیں عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ ان دنوں ہشاش بشاش تھیں اور شاید وجہ یہ تھی کہ مظہر، طاہر، مریم سب آئے ہوئے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد سب ایک جگہ بیٹھے تو انھوں نے مرکزی جگہ سنبھال لی۔

''بھئی میں اس انتظار میں تھا کہ سب لوگ اکٹھے ہوں تو کسی فیصلے پر پہنچا جائے۔''

سب ہمہ تن گوش تھے۔ انھوں نے اچانک کوئی اہم بات شروع کر دی تھی۔

''کیسا فیصلہ ڈیڈی؟''

''بتاتا ہوں بھئی...... بتاتا ہوں۔''

وہ آہستہ آہستہ سر ہلاتے رہے جیسے بات شروع کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہے ہوں۔

''بھئی میں سوچتا ہوں کہ اتنے بڑے گھر میں صرف ہم دونوں رہتے ہیں۔ تم لوگ اپنی اپنی جگہ پیر جما چکے ہو، کبھی کبھی عید تیوہار میں آتے ہو تو اس کے لیے اتنے بڑے گھر کی کیا ضرورت ہے۔''

انھوں نے خاموش ہو کر سب کے چہروں پر نظر ڈالی۔ سب سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس گھر کو فروخت کر دوں۔''

سب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''آپ نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے ڈیڈی۔'' مظہر نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

طاہر کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا۔ مریم کی انگلیاں کنپٹی کی طرف رینگ گئیں۔

کچھ دیر بعد سب لوگ اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے تو صائمہ نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''سنئے۔ مظہر اپنی وردی میں کتنا اچھا لگتا ہے۔ میں نے جیسا چاہا تھا، ویسا ہی ہوا۔''

''ہاں بی بی۔''

''طاہر اتنا بڑا انجینئر بنا۔ اتنی اچھی ملازمت۔ یہی تو خواہش تھی میری۔''

''ہاں بی بی۔''

''مرم کا میاں اسے کتنا چاہتا ہے، اچھا کماتا ہے۔ ہماری بیٹی کو خوش رکھتا ہے۔ یہی تو چاہا تھا میں نے......''

''ہاں بی بی۔''

''آپ نے ان سب کے حصول میں کتنی مدد کی میری، میری خواہشات کو ہمیشہ مقدم رکھا۔''

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اب ایک آخری خواہش بھی پوری کر دیجئے نا......'' ان کے گھٹنے پر صائمہ کے ہاتھ کا دباؤ بڑھ گیا۔

انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ فکرمندی سے ان کی طرف دیکھتے رہے۔

''مجھے سہاگن ہی جانے دیجئے نا!''

انھوں نے اپنا ہاتھ صائمہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ کچھ نہ بول سکے۔

صائمہ کی طبیعت ان دنوں بحال تھی۔ طاہر واپس چلا گیا۔ مریم بھی چلی گئی۔ مظہر آتا جاتا رہا۔ ایک دن صائمہ نے کہا۔

''سنئے، میں چند دنوں کے لیے مظہر کے پاس چلی جاؤں۔ کچھ دن وہیں رہوں گی، بہو کے پاس، پوتی کے پاس۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔لیکن دوائیں پابندی سے لیتی رہنا۔''
صائمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
اگلے دن مظہر انھیں لے کر چلا گیا۔ دوسرے دن اس کی ٹیسٹ فلائٹ تھی۔وہ صحن میں ایزی چیئر پر جھولتے ہوئے آسمان کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھے۔اس وقت مظہر کو فضا میں ہونا چاہیے تھا۔ دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی نے انھیں چونکا دیا۔
''ڈیڈی آپ فوراً آجایئے۔''مظہر کی آواز تھی۔
چند لمحوں کے لیے ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔
''کیا بات ہے مظہر،تمھاری مما تو ٹھیک ہیں؟''
''بس آپ جلدی سے آجایئے ڈیڈی۔''
''مجھے بتاؤ،تمھاری مما تو ٹھیک ہیں!''وہ تقریباً چیخ پڑا۔
''آپ آجایئے ڈیڈی،وہ یہاں ہسپتال میں ہیں۔''
انھیں وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔
''میں تو ٹیسٹ فلائٹ پر تھا۔مما کو ٹینا کے ساتھ کھیلتا باتیں کرتا ہوا چھوڑ کر گیا تھا۔ اچانک مجھے کنٹرول ٹاور سے فیول ڈمپنگ ایریا میں جانے کی ہدایت ملی،فیول ڈمپ کرنے کے بعد واپس لینڈ کرنے کو کہا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ مما بے ہوش ہو کر گر پڑی ہیں۔ایمرجنسی میں مما کو یہاں کے ہسپتال میں داخل کرایا گیا ہے۔''مظہر جلدی جلدی انھیں بتا رہا تھا۔
صائمہ آئی سی یو میں آنکھیں بند کیے پڑی تھیں۔وہ شیشے سے اندر کا نظارہ کر سکتے تھے۔
دونوں کلائیوں پر کچھ تار لپٹے ہوئے تھے۔ سینے پر بھی تار تھے اور ان کے سرہانے کی طرف بنے ہوئے ڈیسک پر رکھی مشینوں سے جا ملے تھے۔ کچھ سوئیاں سی حرکت کر رہی تھیں،ناک پر آکسیجن ماسک چڑھا ہوا تھا۔
''یہاں دیکھ بھال میں کوئی کمی نہیں ہو گی ڈیڈی۔''
مظہر کے کوارٹر سے ہسپتال کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔انھیں آئی سی یو میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی لیکن ان کا زیادہ وقت ہسپتال کے کوریڈور میں ہی گزرتا۔ وہ شیشے کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے اور دیر تک صائمہ کو دیکھتے رہتے۔صائمہ کی بہت سی باتیں ان کے ذہن میں سرسراتیں اور پھر سب آپس میں گڈ مڈ ہو جاتیں۔ وہ خیالات کو کوئی شکل دینے کی کوشش کرتے لیکن کوئی واضح صورت نہ بن پاتی۔
اس عرصے میں طاہر کئی بار آیا،کچھ دن رہا،پھر واپس چلا گیا۔مریم بھی کچھ دنوں کے لیے آئی،پھر واپس چلی گئی۔مظہر ڈیوٹی کے بعد آئی سی یو میں صائمہ کو دیکھتا،ڈاکٹر سے باتیں کرتا،پھر ان کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر کوارٹر چلا جاتا۔
''ڈیڈی،ڈاکٹر آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔''
انھوں نے شیشے سے اندر کی طرف دیکھا۔صائمہ کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔
''دیکھیے،آپ کو یہ سن کر تکلیف ہو گی لیکن ہم لوگوں کی تمام کوششوں اور آپ لوگوں کی تمام دعاؤں کے باوجود،ان کی حالت میں اب کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔''ڈاکٹر ان سے کہہ رہا تھا۔
''ڈاکٹر،اتنے مہینوں میں کچھ بھی نہیں ہو سکا!''
''جی بس اتنا ہی ہو سکا کہ مصنوعی سانس وہ قبول کر رہی ہیں۔''
''پھر ڈاکٹر......''
''وہ تکلیف میں ہیں۔''ڈاکٹر نے مختصراً کہا۔
انھوں نے مظہر کی طرف دیکھا۔وہ نظریں نیچی کیے کھڑا تھا جیسے یہ سب کچھ وہ ڈاکٹر سے پہلے ہی سن چکا ہو۔ ڈاکٹر نے میز پر پڑے کلپ بورڈ میں ایک کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔
''اب یہ آپ پر منحصر ہے، وہ تکلیف میں ہیں،آپ ہی انھیں اس تکلیف سے نجات دلا سکتے ہیں۔''
وہ مظہر کے ساتھ کوارٹر آگئے۔غسل خانے میں کافی دیر لگائی، کپڑے تبدیل کر کے ہسپتال جاتے ہوئے انھوں نے مظہر سے کہا۔
''کمانڈر،طاہر اور مریم کو بلوا لو۔''
ڈاکٹر نے انھیں دیکھ کر آنکھوں آنکھوں میں ان کا عندیہ لیا۔وہ آگے بڑھے اور میز پر کلپ بورڈ میں پھنسے ہوئے کاغذ پر دستخط کرنے لگے......تمھاری آخری خواہش کیا تھی بی بی......کیا تھی تمھاری آخری خواہش......
ڈاکٹر نے اٹھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
''لیکن ابھی نہیں ڈاکٹر......دو ایک دن بعد......''ان کی آواز حلق میں پھنس گئی۔
ڈاکٹر نے سر ہلایا۔وہ پھر شیشے کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔
''بی بی......''وہ دل ہی دل میں صائمہ کو آوازیں دیتے رہے،لیکن کوئی حرکت نہیں۔
چند دنوں میں مریم اور طاہر بھی آگئے۔ سب شیشے کے سامنے کھڑے تھے،کمرے میں صائمہ کے بستر کے پاس ایک نرس اور ڈاکٹر موجود تھے۔ڈاکٹر نے شیشے کی طرف دیکھا۔انھوں نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔
کلائیوں سے تار الگ کر دیے گئے۔ سینے پر سے تار الگ ہو گئے۔ سرہانے ڈیسک پر رکھی مشینوں کی سوئیاں بے جان ہو گئیں۔ڈاکٹر نے صائمہ کی ناک پر سے آکسیجن ماسک ہٹا دیا۔
''لو بی بی......تمھاری آخری خواہش بھی پوری ہوئی......''
انھوں نے اپنے بچوں کو اپنے سینے سے لگانا چاہا لیکن وہ سب تو پہلے ہی ان سے چمٹے ہوئے تھے۔

☆

گلابی چڑیا

شمع خالد

(راولپنڈی)

میں اپنے لان میں بیٹھی اپنے میکے آنگن کو یاد کر رہی تھی۔ جہاں دادی امّاں رات کے بچے ہوئے ٹکڑے چڑیوں کو ڈالتے ہوئے نعت شریف گنگناتی رہتی تھیں۔ صبح اشراق کے بعد روزانہ یونہی چڑیوں کو حمد ونعت سناتے ہوئے اُن کے دانہ دُنکا کا بندوبست کرتیں۔ میرے لان میں بھی رنگ برنگی چڑیوں نے بہار لگا رکھی تھی۔ لالی کا جوڑا۔۔۔ کوئل اور بلبلوں کے جوڑے میرے سامنے آ کر بیٹھتے اور میں خاموشی سے اُنہیں دیکھتی رہتی۔ وہ مجھ سے آشنا ہو چکے تھے۔ آہستہ آہستہ میرے قریب آ کر بے خوف دانے چگتے۔ یونہی سردی کے آغاز سے انجام تک میں ان پرندوں کے ساتھ رہتی۔ سردی کی دھوپ یہ پرندے اور پودے میرے ساتھی تھے۔

پھر ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ مجھے یہ چڑیوں اور دھوپ بھرا آنگن چھوڑ کر کراچی جانا پڑ گیا۔ جہاں ہسپتال، دوائیں، پٹی اور انجکشن۔۔۔ میں سب کچھ بھول کر نئی جگہ نئے زخم کے مندمل ہونے کے انتظار میں۔۔۔ اندر کی آنکھیں بند کیے اس شہر نا پرساں میں جسم میں لگے زخموں کا۔۔۔ مداوا کروا کے جب اپنے آنگن میں پہنچی تو ایک اجاڑ خنداں میرے انتظار میں تھی۔ نہ وہ پھولوں کی کیاریاں تھیں، نہ ہی اُن میں اترنے والے روشن جگنو تھے، نہ ہی بھینی بھینی خوشبوئیں، رنگ برنگی تتلیاں تھیں نہ ہی محبت سے مسکراتے ہوئے پھول میرے آنے کا مسکرا کر سواگت کر رہے تھے۔ چاروں جانب جھاڑ جھنکار میرے دل کی طرح بے رنگ، خشک، روٹھے روٹھے سے نظر آ رہے تھے۔

ہفتہ بھر کی مالی کے ساتھ تھکا دینے والی مشقت سے پودوں میں کچھ ترتیب آئی۔ چڑیوں کے لیے نیا کٹورہ پانی کے لیے مٹی کا برتن تاروں سے باندھ کر درخت پر باندھا۔ اپنے ہاتھوں سے ڈبل روٹی کا چورا بنا کر زمین پر بکھیرا جو دوسرے دن بھی ویسا ہی پڑا رہا۔ گھبرا کر گھر کے سامنے میدان میں جھانکا وہاں بھی درخت ویران اور میدان نظر آئے۔ اُن سے بھی پرندے روٹھ چکے تھے۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو نہ ہونٹوں پر کوئی دعا تھی نہ جھولی میں کوئی خواہش۔ بس تھا تو چاروں طرف چھایا ہوا سنّاٹا۔ نہ صبح کے وقت اللہ کی حمد کرتیں چڑیوں کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

یا اللہ سائبریا سے آنے والے پرندے راستہ بھول گئے ہیں اور ہماری اپنی مقامی لالی، بلبل، کوئل کدھر چلی گئیں۔ فجر سے پہلے میری آنکھ ان ہی کے شور سے کھلتی تھی لیکن اب میرے چاروں جانب سنّاٹا تھا۔

چڑیوں کے گمشدہ ہونے کا واقعہ میرے لیے معمولی نہ تھا۔ لان میں بیٹھی یہ ہی سوچ رہی تھی کہ کچھ بلیوں کی غرّاہٹ سنائی دی اور کسی پرندے کی آخری چیخ اور دھما کہ جلدی سے ویل چیئر پیچھے صحن کی طرف موڑی تو کبوتر کے بکھرے سفید پر بین کرتے دکھائی دیے۔ مجھے دیکھتے ہی تینوں بلیاں بھاگ گئیں۔

میں واپس لان کی طرف مڑی تو تینوں بلیاں کبوتر کے پرزے ہڑپ کر رہی تھیں۔ جو زور آور تھی وہ زیادہ حصہ لے اُڑی۔ میں اُنہیں دیکھ رہی تھی کہ مجھے اپنے سر کے اوپر پھیلے درخت میں بلبل کی صدا سنائی دی۔ یہ میٹھی آواز میرے کانوں میں امرت گھولنے لگی۔ آج اتنے دنوں بعد یہ رسیلی کوک سنائی دی تھی۔ اس کا مطلب ہے میرے گھر پرندے آ رہے ہیں لیکن یہ بلیاں جانے میرے جانے کے بعد کیسے اس گھر کی مکین بن گئیں۔ میں نے دیکھا ایک طوطا میرے امرود کے درخت پر بیٹھنے کے لیے آیا ہی تھا ایک بلی چھلانگ مار کر دیوار پر چڑھی اور پھر درخت کی شاخ پر پہنچ گئی۔ اُسے دیکھتے ہی طوطا اُڑ گیا۔

مجھے اپنے درختوں اور پودوں کی اداسی سمجھ آ رہی تھی۔ ان بلیوں نے میری سبزی کی کیاریوں کو روند ڈالا تھا۔ میں نے بلیوں سے جان چھڑانے کے لیے بلی مار کی تلاش کی۔ کسی نے بتایا کہ بلیاں پکڑنے والے کو بلایا جائے میں بلیوں کو مارنا نہیں چاہتی تھی بس یہاں سے کہیں اور بھجوانا چاہتی تھی۔

بہر حال ان بلیوں کو یہاں سے نکالنا میرا مشن بن چکا تھا۔ بہت سے لوگوں سے ان سے چھٹکارے کی ترکیب پوچھی۔ پر کوئی ترکیب کارگر نہ ہوئی۔

بلیوں کو بھگانے کے لیے میں نے کوڑے میں ہڈیاں ڈالنا بند کر کے میدان میں پھینکنا شروع کیا۔ یوں ہم سب نے مل کر بلیوں کا راستہ روک دیا۔ میں نے خوفزدہ ہو کر واصف علی واصف کا یہ قول پڑھا ''جہاں رحمت روٹھ جاتی ہے وہاں سے پرندے کوچ کر جاتے ہیں'' تو کیا مجھ سے خدا ناراض ہے۔ کیا رحمت کے دروازے بند ہونے لگے ہیں۔ اس سے آگے میں نہ سوچ سکی۔ لالی کو تو میرا لان اتنا پسند تھا روزانہ صبح دو تین پیلی چونچ والی لالیاں یہاں ڈیرے ڈالتی تھیں۔ کبھی بلبل کبھی رنگین چڑیاں کبھی کوئل کی کوک اور کبھی۔۔۔ کا راگ۔ یہ سب کدھر چلے گئے ہیں۔

یہ بات مجھے بے حد پریشان کر رہی تھی۔ میرے ہی گھر میں نہیں میرے محلے کے سامنے بڑے سے درخت کے پیچھے چڑیوں کی ڈاریں ہمیشہ بیٹھی رہتیں۔ میں نے بہت سارے (Shorts) تصاویر یں بنا کر اپ لوڈ کیں۔ کوّے اور چیل بھی یہاں سے روٹھ چکے تھے۔

میں نے سوچا کسی بزرگ کے مزار سے کوئی دعا، کوئی وظیفہ لوں۔ گوگل پر سرچ کرنے پر پتہ چلا کہ ماحولیات کی آلودگی سے پرندے اور جانوروں کی کئی نایاب نسلیں ناپید ہو رہی ہیں۔ جگنوؤں کے قافلے تو ہمارے بچپن کے ساتھ ہی قصہ پارینہ بن گئے۔ گوگل یہ بھی بتا رہا تھا کہ اگر اسی رفتار سے جانوروں کی نسلیں ختم ہوتی گئیں تو جنگل جانوروں سے خالی ہو جائیں گے۔ ہمارے بزرگ تو ہمیں بتاتے رہتے ہیں کھیت پلازے میں ڈھلنے کے بعد پرندوں کو آشیانے خالی کرنے ہی پڑے۔

میں جب بھی لاہور جاتے ہوئے کلیام شریف سلام کے لیے حاضری

دیتی تو ایک چیز مجھے ہمیشہ ہی حیران کر دیتی۔ ایک سائیڈ کی گندم کٹائی تک سبز رہتی اور دوسری سائیڈ یہ گندم کٹائی کے وقت ہمیشہ کی طرح خشک ہوتی لیکن سبز سائیڈ کے گندم کے خوشے سکھے ہوئے گندم جیسے ہی ہوتے۔ مقامی لوگوں سے پوچھنے کے بعد یہ ہی پتہ چلا کہ ایک دفعہ ایک بزرگ کے اونٹ کھیتوں میں گھس آئے۔ مقامی لوگوں نے انہیں مار مار کر بھگا دیا۔ بزرگ کو اپنے زخمی اونٹ دیکھ کر بے حد غصہ آیا اور انہوں نے بد دعا دی کہ تمہاری گندم کبھی نہ پک سکے۔ دوسرے سال جب واقعی گندم ہری ہی رہی تو یہ دیکھ کر وہ کلیام شریف پر دعائیں اور منتیں چڑھانے لگے۔ لہٰذا میری گندم کی بالیاں پکنے لگیں لیکن پودا ہرا ہی رہنے لگا۔

پچھلے زمانے کے سادہ لوگ واقعہ کو سزا اور جزا کے لیے خود ہی سوچ لیتے تھے اور سزا اور جزا کا فیصلہ بھی خود کر لیتے تھے۔ بچپن میں جب چڑیاں امّی کے آنگن میں اترتی تھیں تو دادی امّاں انہیں روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کر ڈالتی جاتیں اور مجھے سمجھانے لگتیں۔ ان بے زبان چڑیوں کی دعا لینی چاہیے۔ جانتی ہو مغلیہ شہزادے ان کا شکار کرتے تھے اس لیے ان کی حکمرانی کو زوال آیا اور میں ہنستے ہوئے کہتی یہ تو ماہرین تاریخ کو پتہ ہی نہیں۔ آپ کی تھیوری اُن بے وقوفوں کو بتانی چاہیے تا کہ وہ تحقیق کریں کہ کس شہزادے نے زیادہ چڑیاں ماریں اور برباد ہو گیا۔ دادی امّاں کی ڈانٹ کھاتے کھاتے بچپن گزرا اور بڑھاپا کب آیا پتہ ہی نہ چلا۔

مجھے یاد آیا جب میں فجر سے فارغ ہوتی تو جی چاہتا یہ چڑیوں کا شور تھوڑی دیر کے لیے رُک جائے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو شور سہانا لگ رہا تھا اب نیند کے لیے خاموشی چاہیے تھی۔ اپنی اس خود غرض سوچ پر اپنے آپ پہ غصہ بھی آ رہا تھا کہ ہم انسان فطرت کے حسن کو بھی اپنی عادات کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے تو ہم نے اپنے آپ کو ٹیکنالوجی کے شور میں دبا لیا ہے۔ رابرٹ فراسٹ اپنی نظم میں اسی خواہش کا اظہار کرتا نظر آتا ہے:

I have wished a bird would fly away.

And not sing by my house all day

آخری شعر میں فراسٹ میری طرح اپنے آپ سے خفا ہو کر کہتے ہیں:

And of course there must be some thing wrong.

In wanting to silence any song

بس یہی تو سمجھ نہیں آتا کہ ہم کہاں اور کب غلط ہوئے۔ ماضی سے کٹ جانا ہماری مرضی سے نہیں ہوا۔ ترقی کے خواب دکھا کر ہمارا اپنا آپ چھین لیا گیا۔ ہمارے شہتوت، بیر، ٹاہلی کے پیڑ کاٹ کر ہمیں اغیار کے ہاں لائے ہوئے درخت دیے گئے۔ سفیدے نے زمین کا پانی چوس لیا یہ اور ایسے ہی خیالات میں اُلجھی میں نے گاڑی سٹارٹ کی اور اس کے ساتھ FM آن کیا۔ میں اس نغمے کو بھول چکی تھی یہ گانا ''ساڈا چڑیاں دا چنبا وے'' شروع تو میرے بچپن کا یہ سین جو جانے کب سے آنکھوں کے پردے میں اٹکا تھا میرے سامنے آ گیا۔ امّی اور دادی اس گانے کے لگتے ہی آپس کی لڑائی بھول کر ساتھ بیٹھ کر باجماعت رونے لگتیں۔ شروع میں تو ہم اُن کا مذاق اڑاتے تھے لیکن لڑکپن گزرنے کے ساتھ ہم یہ سمجھتے جا رہے تھے کہ یہ دکھ ہر عورت کا ہے۔ کیونکہ سب ہی کو میکہ چھوڑنا پڑتا ہے۔

لیکن آج یہ نغمہ سنتے ہوئے مجھے نہ امّی یاد آئیں نہ دادی بلکہ میرے سامنے خوبصورت سی بچی دھیان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آ موجود ہوئی۔ وہ ننھی سی پیاری گول مٹول گلابی سی لڑکی جسے ڈھیر سارے زعفران کو میدے میں گھول کر اللہ میاں نے بنایا تھا وہ میرے پڑوس میں ہی رہتی تھی۔ چار بڑے بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ سارا محلّہ اُسے نیکی کے نام سے پکارتا تھا اور میں اُسے گلابی چڑیا کہا کرتی کیونکہ اُن دنوں مجھے گرل گائیڈ میں نیلی چڑیا کا گیت سکھایا جاتا۔ میں نے افشی کو نیلی کی بجائے گلابی چڑیا کا نام دیا تھا وہ دروازے میں بیٹھ کر میرا انتظار کیا کرتی۔ میں بھی سکول سے واپسی پر گولیاں، ٹافیاں اور کبھی بھنے چنے اور مکئی کے دانے لے کر آتی اور گود میں اُسے لے کر کھلاتی۔ اسی دوستی میں سکول سے کالج اور کالج سے سسرال آ گئی۔ افشی سکول جانے لگی۔ کافی عرصہ باہر رہنے کے بعد جب میں واپس آئی تو آتے ہی امّی سے پوچھا امّی میری گلابی چڑیا کیسی ہے۔ اب تو جوان ہو چکی ہوگی۔ امّی کے چہرے پر تاسف کا ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ کہنے لگیں پہلے چائے تم پی لو۔ ابھی میں چائے کا ایک گھونٹ پی سکی تھی کہ کمرے کے دروازے پر ایک کمزور کالی سی دیوانی سی لڑکی دکھائی دی۔ امّی نے پیار سے اُسے بلاتے ہوئے کہا ''گلابی چڑیا تمہاری باجی۔۔۔'' وہ آگے بڑھی میں گھبرا کر لاشعوری طور پر پیچھے ہٹنا چاہتی تھی کہ امّی نے ہنکارا بھر کے اشارہ کیا۔ وہ آ کے میرے سینے سے لگ گئی۔ اُس کا دھک دھک کرتا دل میرے دماغ میں دھک بجا رہا تھا۔ ایسا کب اور کیوں ہوا۔۔۔ کافی دیر تک مجھ سے چمٹے رہنے کے بعد وہ واپس بھاگ گئی۔

میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ امّی نے میرے پوچھے بغیر بتانا شروع کیا۔

دعاؤں سے مانگی بچی ماں اور باپ کی آنکھوں کا تارا۔۔۔ بھائی بھی ہر وقت اس کے ناز اٹھاتے۔ ماں کے مرتے اور شادیوں کے بعد ایسے بدلے کہ پتہ ہی نہ چلا کہ لاڈو سے پلی بہن کے دماغ کو کونسا ایسا صدمہ پہنچا کہ ہوش و حواس گنوا بیٹھی۔ آنٹی نے بہت سا زیور اور سامان اس کے جہیز کے لیے بنا رکھا تھا۔ امّی کی آواز کسی کنویں سے آ رہی تھی۔ ماں نے پیسہ بنک میں رکھوایا۔ زیور چاروں بھائیوں نے ماں کی نشانی کہہ کر بیویوں کو دے دیا۔ بنک میں رکھے پیسے گھر کی آرائش میں لگا دیے۔ باپ نے دنیا سے جاتے ہوئے اپنی دکان افشی کے نام لگا دی تھی اور کچھ رقم بھی۔ اُس کے بدلے اسے گیراج میں ایک چارپائی ڈال دی ہے خدا کا شکر ہے کہ بچی اتنی ہوش میں ہے کہ کپڑے دھونا اور پہننا خود کرتی ہے۔

دوسرے دن میں ایک ماہر نفسیات کے پاس افشی کو لے کر گئی۔

ڈاکٹر نے بڑے حوصلہ افزا انداز میں کہا کہ اگر علاج میں کوتاہی نہ کی جائے تو یہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ میں دوائیں لے کر آئی تو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اُس کے بھائی کو دے کر تلقین کی۔ اس کی دوا میں کوتاہی نہ کی جائے۔ اس کی ڈوز آپ نے اپنے ہاتھ سے دینی ہے۔ اس کے ہاتھ دوائیں نہیں لگنی چاہئیں۔ تین مہینے میں امّی

کے گھر ہی رہی۔ تیسرے مہینے دوا نے اثر شروع کیا۔ افشی نے کھانا پینا شروع کر دیا تھا۔ صحت بھی بہتر ہو رہی تھی۔ میں چند دن کے لیے سسرال آ گئی۔ مہینہ بعد واپس آئی تو افشی کو پہلے سے ابتر حالت میں پایا۔ سیڑھی سے گر جانے کی وجہ سے دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں جن میں سرکاری ہسپتال سے راڈ لگوا دیا گیا تھا۔ جب دریافت کیا تو پتہ چلا کہ کبھی اُسے دوا دی جاتی تھی کبھی نہیں کیونکہ بھابیاں اُسے نفسیاتی مریض سمجھتی ہی نہیں تھی۔

میں اُسے چند دنوں کے لیے اپنے پاس لے آئی۔ اُس کی ٹانگوں میں جان آ گئی تھی وہ لاٹھی کے سہارے چلنے لگی۔ دوائیں اثر کر رہی تھیں۔ ہوش آتے ہی وہ اپنے گھر کی طرف دوڑی۔ میں اُسے کیسے روک سکتی تھی اُس گھر میں اُس نے آنکھ کھولی تھی۔ اُس گھر میں اُس نے چلنا سیکھا تھا۔ شام کو اُس کا بھائی اسے لے کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا ''باجی اسے اپنے پاس رکھ لیں یہ میرے بچوں کے ساتھ جھگڑا کرتی ہے۔ کہتی ہے یہ گھر میرا ہے۔ رات دونوں کی لڑائی ہوئی اور غلطی سے ڈنڈا اس کے سر پر لگ گیا'' میں نے دیکھا افشی کے سر پر گومڑ بنا ہوا تھا اور خون بالوں میں چپکا تھا۔ یہ کیسا بھائی تھا جسے بہن کے سر سے بہنے والا خون دکھائی نہ دیا۔

دو سال کیسے گزرے پتہ ہی نہ چلا۔ افشی بہت نارمل زندگی گزار رہی تھی۔ پڑھائی دوبارہ شروع کر کے مڈل پاس کر لیا تھا۔ ساتھ ہی ایک دینی کورس کر کے وہاں بچیوں کو قرآنی قاعدہ پڑھانے لگی تھی۔

میرا ویزہ ختم ہونے والا تھا۔ میں واپس آ گئی۔ امّی نے فون پر بتایا کہ میرے جانے کے بعد وہ پھر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ ایک دن باتوں باتوں میں امّی نے بتایا کہ محلے میں ایک شادی میں بچوں نے اُسے دھکا دیا۔ بیچاری بے حد تڑپ کر روئی تھی۔ امّی اُس کی ٹانگوں میں راڈ لگے ہیں۔ بیچاری کو کتنی تکلیف ہوگی۔ اُس کے بعد امّی نے کبھی اُس کا ذکر نہ کیا۔ آہستہ آہستہ میں بھی مصروف ہوگئی۔ وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ دو سال گزرنے کے بعد مجھے جب میکہ یاد آیا تو میں نے اپنے لیپ ٹاپ پر پاکستان کی اخبارات نکالے۔ ایک اخبار کے صفحے پر میں نے تصویر دیکھی۔ ایک پاگل لڑکی جسے بچے پتھر مار رہے ہیں۔ میں نے سکرین کو بڑا کر کے دیکھا۔ گندے بالوں میں چھپا چہرہ۔ زوم کر کے میرے سامنے آیا تو وہ افشی تھی۔ میری چیخ سینے میں گھٹ کی گھٹ رہ گئی۔ میں نے فون اٹھایا امّی کی آواز سن کر میں نے چیختے ہوئے امّی سے کہا۔

''امّی افشی پاگل ہوگئی''

آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ امّی نے تاسف بھرے لہجے میں کہا ''وہ کب پاگل ہوئی پتہ ہی نہیں چلا'' میرے پڑوس میں اُسے گیراج میں رسیوں سے باندھ کر رکھا گیا۔ جس دن وہ رسی کھول کر بھاگی اُسی دن کی تصویر ہے۔ تمہارے ابو اسی وقت اُسے پاگل خانے چھوڑ آئے۔

رات میں سونے کے لیے لیٹی تو میرے آنگن کی چڑیوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ سب چیخ رہی تھیں۔ شور مچا رہی تھیں۔ ان میں دبی دبی دور سے آتی میری گلابی چڑیا کی آواز بھی تھی۔

Today is Charlie Chaplin's125th birthday -

A Good Day to Recollect his 3 Heart Touching Statements:

(1) Nothing is Permanent in this World,not even our Troubles.

(2) I like Walking in the Rain, because NoBody can see my Tears.

(3) The Most Wasted Day in Life is the Day in which we have not Laughed.

LIFE is to Enjoy with Whatever you have with You,Keep Smiling...!If you feel STRESSED,Give yourself A Break.Enjoy Some..Icecream/ Choclates/ Candy/ Cake...Why...? B'Coz...:STRESSED backwards spelling isDESSERTS...!!

Enjoy...!Very Beautiful lines Pls Store it.

ONE Good FRIENDis equal to ONE Good Medicine...!Likewise ONE Good Group is equal to ONE Full medical store...!!

Six Best Doctors in the World....:

1.Sunlight
2.Rest
3.Exercise
4.Diet
5.Self Confidence
6.Friends

Maintain them in all stages of Life and enjoy healthy life...!If you see the Moon...You see the Beauty of God.....!If you see the Sun...!You see the power of God....And....

If you see the Mirror,You see theBestCreation of GOD...!

So....

Believe in YOURSELF.We all are Tourists & God is our Travel Agent Who has already fixed all our Routes, Reservations & Destinations

So....

Trust him & Enjoy the "Trip" called LIFE...!!

Life will never come Again.!!

Live Today..!

You May Share this to All People who Are Important to You..!!

''تقدیر تماشہ''

بہزادلکھنوی

(●)

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے
ورنہ کہیں تقدیر تماشہ نہ بنا دے

اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے

میں ڈھونڈھ رہا ہوں مری وہ شمع کہاں ہے
جو بزم کی ہر چیز کو پروانہ بنا دے

آخر کوئی صورت بھی تو ہو خانۂ دل کی
کعبہ نہیں بنتا ہے تو بت خانہ بنا دے

بہزادؔ ہر اک گام پہ اک سجدۂ مستی
ہر ذرّے کو سنگ در جانانہ بنا دے

○

آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

جدائیوں کے سمے نت نئے دکھاتا ہے
وہ راستوں سے کئی راستے بناتا ہے

میں اپنے عکس کی خفت کا ہوں تماشائی
ترا سلوک مجھے آئینہ دکھاتا ہے

لہو لہو ہوں مگر روشنی بناتا ہوں
کہ جس سے رات مرا رہ نما بناتا ہے

مرا سخی جو لٹاتا ہے بوریاں دن کو
تو شب کو جھونپڑیوں سے روٹیاں چراتا ہے

صنوبروں کی گھنی چھاؤں شادماں رکھے
پرندِ ہجر مجھے ماہیے سناتا ہے

بحال رکھتی ہیں یہ میل جول بوچھاریں
مری نظر کا بھرے ساونوں سے ناتا ہے

یہ کس کے ذوق سے دانے فروغ پاتے ہیں
یہ کس کا ہاتھ یہاں بالیاں سجاتا ہے

وہ قمقمے تو لگاتا ہے پہلے گھر میں مرے
پھر اس کے بعد یہاں بجلیاں گراتا ہے

چلا گیا کسی دریا کی سیر کو ثاقبؔ
وہ نیک شخص وہاں نیکیاں بہاتا ہے

○

اختر شاہجہاں پوری
(بھارت)

میرا سرمایہ رزقِ ہَوا ہو گیا
بستی والو! یہ کیا حادثا ہو گیا

وہ جو اک حرف تخلیق میں نے کیا
میرے حق میں وہ حرفِ دعا ہو گیا

کارواں سے بچھڑنے میں اک پل لگا
حال سے جیسے ماضی جدا ہو گیا

دوستی خوب تم نے نباہی مگر
دل میرا درد سے آشنا ہو گیا

آئینہ ٹوٹ جانے کا کچھ غم نہیں
تیرا چہرہ ہی جب آئینہ ہو گیا

ذہن و دل پر مسلط ہے اب بھی وہی
میں نے سمجھا تھا کچھ فاصلہ ہو گیا

مجھ سے تو بندگی بھی نہ اخترؔ ہوئی
کس طرح کوئی بندہ خدا ہو گیا

○

غالب عرفان
(کراچی)

جنہیں کھویا تھا میں نے خوابوں میں
ڈھونڈتا ہوں اُنہیں کتابوں میں

گم ہوا سچ کی کھوج میں وہ ، تو
میں بھٹکتا رہا سرابوں میں

وصل کی شب عیاں ہوا جب میں
وہ بھی کھُلتا گیا حجابوں میں

وہ بکھرتا گیا سوالوں میں
میں سمٹتا گیا جوابوں میں

دن تو کسبِ معاش میں گزرا
رات بیتے گی اب کتابوں میں

ہوتا رہتا ہے سب پہ وہ نازل
کون ہے جو نہیں عتابوں میں

تجربہ ہی مرا مدرس ہے
نہ ملا کچھ کبھی نصابوں میں

دوستی کو شمار مت کرنا
نفع نقصان کے حسابوں میں

نشہ کس میں ہے کیا کہوں عرفاںؔ؟
اُس کی آنکھوں میں یا شرابوں میں

○

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

ہو کا عالم ہے گھر کی تنہائی
چاند نکلا تو آنکھ بھر آئی

چپ کا صحرا عبور کرنا ہے
کام آئے گی آبلہ پائی

جب بھی سورج تراشنا چاہا
میری دنیا میں تیرگی چھائی

ہر ستارہ ہے زخم کی صورت
خوب ہوتی ہے شب کی رسوائی

سچ اکیلا رہا زمانے میں
حرفِ حق کی کہاں پذیرائی

شاخِ لب پر نہ کوئی پھول کھلا
گرچہ کہنے کو ہے بہار آئی

اس کا جانا بھی سانحہ ٹھہرا
میں تو کھو بیٹھا جیسے گویائی

رتجگا بھی حسنؔ مقدر ہے
یوں بھی سونے کی ہے قسم کھائی

○

عرش صہبائی

(جموں، کشمیر)

جو مصائب سے کمر بستہ نہیں
اُس کے جینے کا کوئی رستہ نہیں

زندگی رہتی ہے مجھ سے دُور دُور
جس طرح میں اس سے وابستہ نہیں

ہم اگر تحقیق سے کچھ کام لیں
کوئی بھی شے رازِ سربستہ نہیں

ہو گا کیا احساس راحت کا اُسے
وہ بشر جو غم سے وابستہ نہیں

ساتھ اس کے تیز تر کانٹے بھی ہیں
زندگی خوش رنگ گلدستہ نہیں

اس سے آ سکتی نہیں ہرگز مہک
زخم جب تک دل میں پیوستہ نہیں

کوئی بھی ایسا نہیں اس دَور میں
جو کسی اُلجھن سے وابستہ نہیں

اور سہہ پائے نہ اب یہ مشکلیں
حال دل کا اسقدر خستہ نہیں

عرشؔ ہم تخلیق کر لیں گے اسے
جانبِ منزل اگر رستہ نہیں

○

خورشید طلب

(جھارکنڈ، بھارت)

جب بھی جنگل کی طرف تیز ہوا آتی ہے
دیر تک پیڑوں کے رونے کی صدا آتی ہے

ہاتھ اٹھا دیتے ہیں تلوار اٹھانے کی جگہ
کچھ نہیں آتا ہمیں صرف دعا آتی ہے

کبھی رکنے کو نہیں پرورشِ کج کلہی
نسل در نسل یہ تہذیبِ انا آتی ہے

مورچہ کھول کے رکھا ہے جو فطرت کے خلاف
دیکھئے ہوش میں کب خلقِ خدا آتی ہے

اڑ رہا ہے جو ہوا میں اسے معلوم نہیں
پر جو چیونٹی کے نکل آئیں قضا آتی ہے

چھو کے پروائی نے زخموں کو کہا شوخی سے
تیرے ہر زخم سے خوشبوئے حنا آتی ہے

جوش میں آتی ہے جس روز محبت اس کی
چار باتیں مرے یاروں کو سنا آتی ہے

اس سے مل کر بھی اسے ڈھونڈتا رہتا ہوں میں
جب وہ آتی ہے کہیں خود کو چھپا آتی ہے

موت دروازے پہ دستک نہیں دیتی ہے طلبؔ
بے دھڑک آتی ہے بے صوت و صدا آتی ہے

○

اشرف جاوید

(لاہور)

ہاتھ سے ہاتھ چھڑاتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں
مشکل آسان بناتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں

مسئلہ بعد کا ہے کوئی جیے گا کہ نہیں!
ابھی کیوں بات بڑھاتے ہیں! بچھڑ جاتے ہیں

شارعِ عام نہیں عشق کی شارع کوئی
آنے والوں کو بتاتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں

اگر ایمان کو خطرہ ہے وفاداری سے!
اپنا ایمان بچاتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں

ہمیں زیبا نہیں الزام تراشی کا چلن!
کس لیے خاک اُڑاتے ہیں! بچھڑ جاتے ہیں

جڑ پکڑنے لگا ہے کوئی تنازع ہم میں
اس تنازعے کو مٹاتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں

یہ تعلّق تو بچھڑ کر بھی نہیں ٹوٹنے کا
معجزہ کر کے دکھاتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں

جن پرندوں نے محبت کی گواہی دی تھی
اُن پرندوں کو بلاتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں

جانے والوں نے کہاں وصل کی خُو ڈالی ہے!
ریت پُرکھوں کی نبھاتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں

○

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

میں شاعر ہوں رنگیں تخیل ہے میرا
میرے سامنے مسکراتے ہی رہنا
یہ مکھڑا گلابی یہ آنکھیں غزالی
مجھے دیکھ کر چہچہاتے ہی رہنا
میری چاہتوں پر نظر رکھ کے اپنی
دیا پیار کا بس جلاتے ہی رہنا
سماں خوب ہے عالم رنگ و بُو کا
مہک اس میں اپنی ملاتے ہی رہنا
نظر آئے سب کو سماں پیار کا جب
وہ منظر مسلسل دکھاتے ہی رہنا
قسم کھا کے اپنی محبت کی ، جاناں
دلِ ناتواں کو مناتے ہی رہنا
نہیں ساتھ چلتا اگر جگ میں کوئی
قدم پھر بھی اپنے بڑھاتے ہی رہنا
دلِ مضطرب کو نہ مایوس کرنا
جو وعدے کئے ہیں نبھاتے ہی رہنا
یہ دنیا ہے فانی مگر تم عمل سے
وہ لافانی دنیا سجاتے ہی رہنا
اگر راہِ الفت کٹھن ہو تو پھر بھی
قدم سے قدم کو ملاتے ہی رہنا
بہشتِ بریں میں اگر مل گئے پھر
یہ نغمے وہاں بھی سناتے ہی رہنا
یہی رازِ سرشاریٔ زندگی ہے
کڑے وقت بھی جگمگاتے ہی رہنا
ریاضؔ اُن کے آنے سے دل کھِل اُٹھا ہے
سدا پیار کی دھُن بجاتے ہی رہنا

○

عظیم بخت
(بھکر)

اس لیے بھی نوید کوئی نہیں
کیونکہ اب پُر امید کوئی نہیں

جو ہیں شامل ایوانِ بالا میں
ان کے جیسا یزید کوئی نہیں

ہے عدالت امیر لوگوں کی
مفلسوں کی شنید کوئی نہیں

روٹھ جائے گی ایک دن یونہی
زندگی سے بعید کوئی نہیں

سب مسائل کا حل محبت ہے
اور محبت مزید کوئی نہیں

ہم کو فرصت نہیں محرم سے
ہم غریبوں کی عید کوئی نہیں

پیار ہو گا اسے وطن سے مگر
مجھ سے زیادہ شدید کوئی نہیں

○

اپنی اپنی نیند

حنیف باوا
(جھنگ)

میں نے اپنے کچے پکّے گھر کے گرد سے اَٹے صحن میں ایک نیم کا پیڑ لگا رکھا تھا۔ گرمیوں کے دنوں میں جب تپتی ہوائیں چلتیں تو وہ کڑوے پیڑ کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں آمیز ہو کر سرد ہو جاتیں۔

جب گرمی کا موسم آتا تو میں شام پڑنے پر مزدوری کی سختیاں جھیل کر تھکے حالوں گھر لوٹتا تو اسی پیڑ کی چھاؤں میں چھنگلی سی چارپائی بچھا کر لیٹ جاتا جس سے مجھے بہت راحت ملتی۔

ایک روز میں حسبِ سابق تنہا چارپائی پر لیٹا موسم کے مزے لے رہا تھا کہ اچانک میری نظر اوپر اُٹھ گئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسی کڑوے پیڑ کے گھنے پتوں کے سایہ میں ایک ننھا سا گھونسلہ تھا جو کچھ زندہ اور کچھ مردہ تنکوں سے تعمیر کیا ہوا تھا۔ اس ننھے گھونسلے میں دو بچے اپنی زبانیں باہر نکالے چوں چوں کر رہے تھے شاید وہ بھوکے تھے۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ دھرتی پر بسنے والے دولت مندوں کے آہنی کواڑوں سے بہت دُور جھگیوں میں رہنے والے آفت گان کے بچوں کی طرح بھوکے ہوں۔

جب ان بچوں کے خالی شکموں سے برآمد ہوتی ہوئی چوں چوں کی آواز ان کی لنگڑی ماں جو اُس وقت اسی پیڑ کی خوشگوار چھاؤں میں بیٹھی اونگھ رہی تھی کی سماعت سے ٹکرا کر بم کی طرح پھٹی تو وہ جھٹ ہڑ بڑا کر اٹھی اور چلاتی ہوئی جیسے وہ کہہ رہی تھی ''ہائے میرے بھوکے بچے'' میرے صحن سے باہر نکل گئی۔ میں نے جب اُس کی جانب پہلو بدلا تو دیکھا کہ وہ اپنی ایک ہی ٹانگ کے سہارے پھدکتی ہوئی کبھی یہاں سے دانہ دُنکا اٹھاتی کبھی وہاں سے جب اُس کی چونچ چوگے سے بھر گئی تو وہ فوراً وہاں سے اُڑی اور اپنے گھونسلے کے دروازے پر آ کر رُک گئی۔ بچے پہلے ہی اُس کے انتظار میں دروازے کے قریب آ چکے تھے۔ اُس نے باری باری دونوں بچوں کی چونچوں میں چوگا ڈالا اور پھر تیزی سے اُڑ کر نیچے آئی اُس نے پھر پہلے والی جگہ سے دانہ دُنکا اُٹھایا اور اپنے بچوں کی بھوک مٹانے اُسے اُن کی چونچوں کے ذریعے اُن کے شکموں میں اتارا۔ اُس نے یہ عمل متعدد بار دہرایا۔ آخر جب بچے خاموش ہو کر آرام سے لیٹ گئے تو جب اُسے اُن کی بھوک کے دُور ہو جانے کا اطمینان ہو گیا تو وہ نیچے آ کر اُسی کڑوے پیڑ کی چھاؤں میں جہاں میں لیٹا ہوا تھا آ کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر کے ستانے لگی۔

اب بچوں کو اپنی ماں کی کوئی پرواہ نہیں تھی کیونکہ اب وہ گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔ اُن کی اپاہج ماں کہاں ہے اور کس حال میں ہے انہیں اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ شاید اب وہ خبر لینا بھی نہیں چاہ رہے تھے کیونکہ اب ان کے پیٹ بھر چکے تھے۔

شاید دنیا کے تمام بچوں کا بھی ہی رویہ ہوتا ہوگا۔ جب اُن کے جوان ہونے تک کی تمام ضروریات اُن کے والدین کے ہاتھوں پوری ہو چکی ہوتی ہیں تو وہ بھول جاتے ہیں کہ اُن کے پالنے والوں کی بھی کچھ احتیاجات ہیں۔ اُن کا پورا کرنا اب اُن کی ذمہ داری ہے پر وہ تو ایسی نیند میں غرق ہوتے ہیں جس میں کسی بھی ماں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔

شاید وہ اپاہج چڑیا بھی کچھ ایسے ہی حالات سے نبرد آزما تھی۔ وہ اتنی تھک چکی تھی، اتنی نڈھال ہو چکی تھی کہ اُسے اس کڑوے پیڑ کی چھاؤں میں آرام کرنے کے سوا اور کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ اُس کا پیٹ خالی تھا یا بھرا ہوا بھلا ان نیند کے ماروں کو یہ جاننے کی کہاں فرصت تھی۔

یہ لنگڑی چڑیا ایک ہی ٹانگ پر اپنا تمام بوجھ ڈال کر کب تک یہاں بے سُدھ ہو کر بیٹھی رہے گی اُس کی بقیہ زندگی کیسے گزرے گی کیا وہ اپنے آنے والے بچوں کے لیے اپنا نیا گھونسلہ بنائے گی کیا اب اُس میں اتنی سکت رہے گی کہ وہ اپنا نیا گھر تعمیر کرنے کے بارے میں سوچے۔ اس کا نہ مجھے علم ہے نہ آپ کو اور نہ کسی اور کو کیونکہ ہم سب تو اپنی اپنی نیند کے مزے لینے میں مگن ہیں۔

لیکن آخر کب تک؟ بھلا آخر کب تک۔

زندگی

کل ایک جھلک زندگی کو دیکھا،
وہ راہوں پہ میری گنگنا رہی تھی،
پھر ڈھونڈا اُسے اِدھر اُدھر
وہ آنکھ مچولی کر مسکرا رہی تھی،
ایک عرصے کے بعد آیا مجھے قرار،
وہ سہلا کے مجھے سُلا رہی تھی
ہم دونوں کیوں خفا ہیں ایک دوسرے سے
میں اُسے اور مجھے سمجھا رہی تھی،
میں نے پوچھ لیا۔ کیوں اتنا درد دیا کم بخت تُو نے،
وہ ہنسی اور بولی۔ میں زندگی ہوں
تجھے جینا سکھا رہی تھی۔۔۔!!

(شاعر نامعلوم)

پردھان دین دیال شرما کی اکلوتی بیٹی سمیتا کی شادی کی تیاریاں ایک ہفتہ پہلے ہی شروع ہوگئیں۔حویلی کو رنگ برنگی بجلی کی لڑیوں سے سجایا گیا۔ گھر کے باہر گلابی رنگ کے جھالروالے شامیانے لگائے جارہے ہیں۔ہفتہ پہلے ہی ڈھولک اور گانے بجانے کا پروگرام شروع ہوگیا۔شام سے ہی گاؤں کی عورتیں جوان لڑکیاں چھوٹی بچیاں حویلی میں جمع ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔روشنی میں نہائی حویلی اور گانے بجانے کا منظر دیکھ کر لگتا ہے شادی پردھان کی بیٹی کی نہیں پورے گاؤں کی بیٹی کی ہے۔ جس راستے سے بارات نے آنا ہے وہاں سرکاری کارندے صاف صفائی کرکے سڑک کا کام کررہے ہیں۔اوبڑکھابڑ راستے مکھن کی طرح ملائم بن گئے ہیں۔شادی کے بہانے گاؤں کی قسمت بھی سنور گئی۔پردھان کی ہر طرف واہ واہ ہورہی ہے۔

پردھان دین دیال شرما کوئی چھوٹی موٹی ہستی نہیں ہے۔آس پاس کے دو تین گاؤں میں ان کا بول بالا ہے۔گاؤں کی آدھی سے زیادہ زمین اُن کے قبضے میں ہے۔کچھ وراثت میں ملی تو باقی قرضہ وصول نہ ہونے کی وجہ سے قبضے میں لے لی۔یہاں کے کسان پچھلے دو سالوں سے سوکھے جیسے ہی حالات جھیل رہے ہیں۔

اس سال بھی بارش ہوئی بھی تو صرف نام کی۔نہ زمین کی پیاس بجھی نہ کسانوں کی مصیبت کم ہوئی۔سرکار کی طرف سے کسانوں کو معاوضہ تو ملا مگر اونٹ کے منہ میں زیرا کے برابر۔چھوٹے کسان کے لیے روزمرہ کے اخراجات اُس کی پہنچ سے باہر ہورہے ہیں تو مزدوروں کے گھروں کے چولھوں سے اب ایک وقت ہی دھواں نکلتا ہے۔ایسے میں پردھان کی بیٹی کی شادی کی عالی شان تیاریاں گاؤں والوں کے لیے چرچا کا مدعا بھی بن گیا ہے۔سب کی زبان پر شادی کا ہی ذکر ہے۔بڑے بزرگ چوپال میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں تو جوان لڑکیاں سمیتا کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔گاؤں کے نوجوان لڑکوں کو پردھان کی خوشامد کا اچھا موقع مل گیا ہے۔پردھان کے دونوں بیٹے اُن لڑکوں سے خوب کام لے رہے ہیں اور دوسری طرف کرپا اور اس کی ٹولی کے لڑکوں میں بھی مستی، جوش اور اُمنگ پیدا ہوگیا جو بار بار اُنہیں پردھان کی طرف جانے کو اُکساتا ہے۔

آٹھ سال کا کرپا اپنے مزدور باپ مادھو کے ساتھ گاؤں کی سرحد پر بنی غریب بستی کے ایک کمرے کے کچے مکان میں رہتا ہے۔اس بستی کے لوگوں کی حویلی تک رسائی نہیں ہے۔اُن کا حویلی کے اندر جانا ممنوع ہے۔صرف مزدور ہی وہاں جاسکتے ہیں اور باقی صرف دور سے ہی دیکھ سکتے ہیں۔کرپا بھی اپنی ٹولی کے ساتھ وہاں کی رونق دیکھنے صبح شام پہنچ جاتا ہے۔بستی کے سبھی بچے سرکاری سکول میں پڑھنے جاتے ہیں۔والدین کو اُن کو تعلیم دلوانے میں کوئی دلچسپی نہیں مگر ایک وقت کے پیٹ بھر کھانے کے ساتھ مفت کتابیں، کاپیاں اور ہر روز کے حساب سے نقد ایک روپیہ نے اُنہیں مجبور کردیا تھا۔کرپا کا شمار ذہین اور پھرتیلے بچوں میں ہوتا ہے۔حالانکہ دیکھنے میں اپنی عمر سے چھوٹا لگتا ہے۔سانولا رنگ، کالی بڑی بڑی معصوم آنکھیں، دُبلا بدن۔پچھلے سال جچگی کے وقت ماں چل بسی تھی۔ کھانا بنانے کی ذمہ داری اب بابا پر آگئی تھی۔اُن کے ہاتھ کا بے ذائقہ کھانا بھی خوشی خوشی کھالیتا۔ماں کے گزر جانے کے بعد وہ یک دم سیانا ہوگیا تھا۔

باپ سارا دن گرمی، سردی، برسات، طوفان میں کسی طرح لوگوں کے کھیتوں پر مشقت کرتا ہے اور کتنی مشکل سے ایک وقت کی روٹی کما پاتا ہے۔اس تکلیف کا احساس تھا اُسے۔چھٹی والے دن وہ اکثر باپ کے ساتھ جانے کی ضد کرتا۔چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے باپ کی مدد کرنے کی کوشش کرتا۔مادھو اُس کی خوشی کے لیے کچھ دیر تو ساتھ رکھتا پھر اُسے دوستوں کے ساتھ کھیلنے بھیج دیتا۔جانے سے پہلے وہ باپ سے وعدہ لینا نہ بھولتا کہ شام کو گھر دارو پی کر نہیں آئے گا۔کرپا کی خوشی کے لیے مادھو ہفتے میں چار دن ناغہ کرلیتا۔باقی دن بھٹی پر بنائی رمتے کی دیسی شراب گٹک کر غم غلط کرتا لڑکھڑاتے ہوئے گھر پہنچتا۔اُس کی زندگی میں بھی کرپا کے علاوہ اور کوئی خوشی نہیں ہے۔

گرمیوں کی چھٹیاں سکول میں کیا ہوئیں مادھو کی پریشانی بڑھ گئی۔ پہلے کرپا کے صرف ایک وقت کھانے کی فکر ہوتی تھی اب صبح کی بھی ہوتی۔دہاڑی پر مزدوری کرنے والے کو ہر روز نیا کنواں کھودنا پڑتا ہے۔پہلے مثلاً راشن کا انتظام پھر پکانے کی پریشانی۔سوکھے کی وجہ سے کھیتوں میں کام ملنا کم ہوگیا ہے۔مزدور شہر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔مادھو بھی دو وقت کی روٹی کمانے شہر جانا چاہتا مگر کرپا کو کس کے سہارے چھوڑ کر جائے۔ یہاں کچی پکی سر پر اپنی چھت تو ہے۔اپنے لوگوں کا ساتھ تو ہے۔کرپا کو مفت تعلیم کے ساتھ بھر پیٹ کھانا اور مہینے بعد بیس پچیس روپے نقد بھی مل جاتے ہیں۔یہ گرمیوں کے دو مہینے کی چھٹیاں جیسے تیسے کاٹنی ہی ہوں گی۔ اب مادھو بیچ بیچ میں صبح شہر مزدوری کے لیے نکل جاتا اور رات واپس لوٹ آتا۔کمائی کے کتنے پیسے آنے جانے کے کرائے میں خرچ تو ضرور ہوجاتے پھر بھی دو دن آرام سے گزر جاتے ہیں۔ایسے میں پردھان دین دیال کے گھر مزدوری کا کام ملنا کسی نعمت سے کم نہ تھا۔مادھو خوش تھا کہ گاؤں میں ہی پردھان کے یہاں کام مل گیا اور کرپا اس لیے خوش تھا کہ اب باپ کے ساتھ وہاں جانے کا اُسے موقع مل جائے گا۔ وہ بھی شادی کی رونق اور گھر بار کی سجاوٹ قریب سے دیکھ پائے گا۔

صبح اٹھ کر اُس نے بھی ساتھ جانے کی ضد کی تو مادھو نے منع کر دیا۔ مجبوراً اُسے ہر روز کی طرح دوستوں کے ساتھ ہی دن گزارنا پڑا۔سات دوستوں کی نٹ کھٹ ٹولی میں کرپا شرارت میں سب سے آگے رہتا۔بنٹی، ربی، ٹکا، چرن سنگھ، میلا، ببن سب سکول کے ساتھی تھے۔ جب سے سکول میں چھٹیاں ہوئی تھیں پورا دن یہ سب گاؤں میں بھاگتے دوڑتے، پرانے سائیکل کے ٹائر کو ڈنڈے سے

چلاتے، ریس لگاتے، تالاب میں ڈوبکی لگاتے، تیراکی کی ریس لگتی، تالاب میں ڈوبکی لگا کر ہی بھینسوں کی پیٹھ پر چڑھ جاتے۔ گھاس چرتی گائے کو دیکھ کے دودھ دوہنے لگتے۔ سیدھی دھار منہ میں ڈالنے کا مقابلہ ہوتا تو کئی بار گائے کی دُلتی بھی پڑ جاتی۔ اور رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر مالک کی گالیاں اور ڈنڈے بھی کھانے پڑتے جو وہ ہنستے ہنستے جھیل لیتے۔

دوپہر کو کرپا کی ٹولی پھر شادی کی رونق دیکھنے پردھان کے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں کی سجاوٹ اور میلے جیسی رونق دیکھ کر اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ شامیانے میں حلوائی کے چولھے سے اُٹھتی طرح طرح کی خوشبوئیں اُن کی بھوک کو بڑھانے لگی۔ لذیذ پکوان کو قریب سے دیکھنے، سونگھنے اور چکھنے کا اشتیاق بڑھنے لگا۔ یہ ہوا میں بکھری خوشبو اُن کے نتھنوں میں ہلچل مچانے لگی۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے آج کل انہیں ہر طرف پکوان ہی نظر آتے۔ خیال آتے ہی پانی منہ میں بھر جاتا بات کرتے رال ٹپکنے لگتی۔ ابھی وہ شامیانے کے آس پاس گھوم کر خوشبو کا لطف اُٹھا رہے تھے سوچ رہے تھے کہ کس طرح کچھ کھانے کو ہاتھ لگ سکتا ہے کہ پردھان کے لٹھ باز گردھاری لال نے دیکھتے ہی اُنہیں مسکرا کر اشارے سے پاس بلایا۔ بڑے اشتیاق سے اُس کے پاس پہنچے تو اُس نے ہنستے ہوئے بن کا کان پکڑ کر اس قدر زور سے مروڑا کہ وہ درد سے چیخ اُٹھا۔

''اگر تم میں سے کوئی بھی لونڈا مجھے شادی تک آس پاس بھی نظر آیا تو تم لوگوں کا حقہ پانی بند''

بے چارہ بن بُرا پھنسا۔ ظالم نے جب کان چھوڑا اُسے رِہا کیا تو کان سرخ ہو چکا تھا۔ درد سے آنسو بہہ نکلے اور سبھی سر پر پاؤں رکھ وہاں سے بھاگ نکلے۔ اگلے دن پھر وہاں کیسے جلاد کی نظریں بچا کر جایا جاسکتا ہے یہ سب مل کر سوچنے لگے۔

اُس رات خیالوں میں کرپا شامیانے کے آس پاس ہی گھومتا رہا۔ لوازمات کی بھینی بھینی میٹھی میٹھی خوشبو اُس کے وجود کے ساتھ لپٹی رہی۔ پیٹ کی بھوک آنتوں سے ہوتی ہوئی پہلے دل پھر آنکھوں اور پھر دماغ پر چھا گئی۔ صرف کل کا دن تھا اُس کے پاس ان پکوانوں کا ذائقہ چکھ کر لطف اندوز ہونے کا۔ پیٹ سے زیادہ دل اور دماغ کو شرابور کرنے کا۔ پنڈال کے اندر تک رسائی صرف بابا کے ساتھ ہی ہوسکتی ہے۔ اور بابا کو صبح کیسے راضی کرنا ہے ساتھ لے جانے کے لیے یہ سوچتے سوچتے وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلی صبح جب کرپا سو کر اُٹھا تو جسم درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ اُسے سست دیکھ کر مادھو نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو جسم تپ رہا تھا۔ کام پر جانے سے پہلے وہ اُسے سرکاری ڈسپنسری لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے دوائی کی ایک خوراک اُس وقت کھلا دی اور باقی کی مادھو کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے ہدایت دی:

''دوا برابر کھلا دینا اور اگر بخار نہ اُترے یا جسم پر لال نشان اُبھر آئے تو اُسے فوراً ادھر لے آنا آج کل ڈینگو بخار بہت تیزی سے پھیل رہا ہے اور یہ جان لیوا بھی ہوسکتا ہے۔ خیال رہے دوائی کا ناغہ نہ ہو اور کھالی پیٹ نہیں دینی۔''

مادھو دوائی دلوا کر کرپا کو گھر چھوڑنے جانے لگا تو کرپا نے اُس کے ساتھ جانے کی ضد کی۔ گھر پر بھی تو وہ اکیلے پڑا رہے گا کم سے کم وہاں پیڑ کے نیچے آنکھوں کے سامنے رہے گا تو اُسے بھی تسلی رہے گی۔ پھر دوپہر کی دوائی بھی خود اپنے ہاتھوں سے اُسے کھلا دے گا۔ یہ ہی سوچ کر وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

بارات کے استقبال کی تیاریاں زور شور سے چل رہی تھیں۔ مہمانوں کی گہما گہمی ہر طرف رونق، ہر طرف خوش رنگ لباس میں لپٹے خوش رنگ چہرے، پھولوں کی سجاوٹ، ڈھولک کی تھاپ، لذیذ پکوانوں کی میٹھی میٹھی مہک، کہیں کوئی بھاگ کر کام کر رہا ہے تو کہیں کچھ مہمان بیٹھے کھا پی رہے ہیں کہیں قہقہے گونج رہے ہیں۔ دور پیڑ کے نیچے کرپا بیٹھا یہ سب منظر دیکھ کر اپنا بخار بھول گیا۔ اسے لگنے لگا کہ وہ بھی اس ماحول کا حصہ ہے۔ وہ بھی میلے میں گھومنے آیا ہے۔ شامیانے میں حلوائی کی بھٹی سے اُٹھتی خوشبو اُس کے نتھنوں میں پھیلنے لگی۔ اُس کی بھوک بڑھانے لگی پھر بھی وہ ضبط کیے خاموشی سے بیٹھا رہا۔ ادھر اُدھر نظر دوڑائی کہ شاید اس کی ٹولی کے دوست اُس طرف سے نظر آجائیں مگر کہیں کوئی دکھائی نہ دیا۔ اگر وہ دوستوں کے ساتھ ہوتا تو اب تک کچھ نہ کچھ کھانے کا انتظام انہوں نے کر لیا ہوتا۔ بستی سے نکلتے وقت بن نے اُسے بابا کے ساتھ جاتے دیکھ لیا تھا۔

دوپہر کو مادھو اُس کے پاس آکر بیٹھا اور اپنی پوٹلی سے روٹی نکال کر اُسے کھانے کو دی تو کرپا نے کھانے سے انکار کر دیا۔ روٹی کھانی تو ضروری تھی بنا اُس کے دوائی کیسے کھا سکتا تھا۔ مادھو نے پھر دُلار سے پیار سے پچکار کر اُسے روٹی کھلانی چاہی تو اُس کے بھی دل کی بات زبان تک آ گئی۔ مادھو نے ڈانٹ کر اُسے بٹھا دیا۔ وہ بھی ضد پر اڑ گیا کہ وہ حلوائی سے اُس کے لیے کچھ کھانے کو لے کر آئے نہیں تو وہ خود جا کر حلوائی سے مانگ لے گا۔ مادھو نے پھر پیار سے سمجھایا اُس کی توجہ بھی وہاں سے ہٹائی مگر بچے کی ضد نہ ٹوٹی۔ مجبوراً مادھو کو حلوائی کے پاس جانا پڑا۔

پنڈال میں کھانا بناتے حلوائی سے اُس نے کچھ کھانے کو مانگا تو اُس نے باورچی خانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

''ابھی تو ادھر کچھ تیار نہیں تم اندر جا کر رسوئیے سے مانگ لو۔ اندر کھانا تیار ہے وہ دے دینگے۔''

وہ پچھلے دروازے سے رسوئی کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے باہر سے ہی ''مہاراج، مہاراج'' کہہ کر رسوئیے کو پکارا۔ چولھے پر ہانڈی دیگ چڑھی ہوئیں تھیں۔ مسالوں کی بھینی بھینی خوشبو ہوا میں تیر رہی تھی۔ پسینے سے بھرے چہرے کو گلے میں لٹکے گمچھے سے صاف کرتے ہوئے دوبارہ ''مہاراج'' کو پکارا۔ نہ کوئی جواب آیا اور نہ ہی کوئی دکھائی دیا۔ اس نے ایک قدم رسوئی کے اندر رکھ کر آگے جھک کر رسوئی کا جائزہ لینا چاہا تو سامنے سے آتے مہاراج نے اُسے دیکھتے ہی چلانا شروع کر دیا۔

''رام رام رام رام۔ یہ کیا کیا تم نے؟ ساری رسوئی اشودھ کر دی۔ اب تو یہاں کھانا نہیں بن سکتا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ رسوئی سے نکل کر اندر کی طرف بھاگ گے۔

مادھو کے کھڑے کھڑے پسینے چھوٹنے لگے۔ اُسی لمحے وہ جلدی سے پلٹا اور کرپا کی طرف بھاگا۔ اس سے پہلے کہ کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جائے وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ابھی وہ کرپا کے پاس پہنچا ہی تھا کہ پیچھے سے پردھان کے کارندے نے گردن سے آدبوچا اور اُسے گھسیٹتا ہوا پردھان کے پاس لے گیا جو شامیانے میں چار لوگوں کے ساتھ کرسی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ کرپا بھی ان لوگوں کے پیچھے بھاگا۔ مادھو پر نظر پڑتے ہی مہاراج چلّایا:

''یہ ہی ہے وہ کم ذات''

''کیوں بھائی مادھو تیری اتنی ہمت کہ تو منہ اُٹھائے ہماری رسوئی میں گُھس آئے؟ اپنی اوقات بھول گیا کیا؟''

''مالک شما کریں میں نے تو رسوئی کے باہر سے ہی مہاراج کو پکارا تھا۔ میں اندر کیسے جا سکتا ہوں مجھے میری اوقات معلوم ہے سرکار'' مادھو دونوں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ ساتھ میں کرپا باپ کے کُرتے کا کونا پکڑے اس سے چپکا ہوا تھا۔

''جھوٹ بولتا ہے کم ذات میں نے اپنی آنکھوں سے تیرا ایک پاؤں اندر دیکھا تھا۔ آگے کو جھک کر نہیں دیکھ رہا تھا؟'' آنکھیں دکھاتے مہاراج نے پوچھا۔

ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کچھ کہنے کو لب ہلے مگر آواز حلق میں اٹک گئی۔

''ایسی کون سے آفت آن پڑی تھی کہ تو انہیں آوازیں لگا تا رہا تیرے سے انتظار بھی نہ ہوا جواب کا؟'' پردھان نے کڑکتی آواز میں پوچھا۔

''مالک میرا بیٹا بیمار ہے دوائی دینی تھی۔ کچھ کھانے کے ضد کر رہا تھا۔''

''بیٹے کی ضد پوری کرنے کے لیے تو ہماری رسوئی میں منہ اُٹھائے چلا آئے گا؟''

''حضور میں تو ایسی اشودھ رسوئی میں کھانا نہیں بنا سکتا مجھے تو آپ معاف ہی کریں'' مہاراج غصے سے پلٹ کر جانے لگا تو پردھان نے اُنہیں روکتے ہوئے کہا:

''مہاراج آپ شانت ہو جائیں ابھی رسوئی کی شُدھی بھی کرا دیتے ہیں پہلے اسے سزا تو ملنی چاہیے تا کہ اس جیسے کمین کو بھی سبق مل سکے۔''

''غلطی ہو گئی معاف کر دیں مالک۔ آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا'' مادھو گڑگڑاتا پردھان کے قدموں پر گر گیا۔

پردھان نے ٹھوکر مار کر اُسے پیچھے دھکیلا اور غصے سے گرجا:

''تو نے ہماری برادری کا دھرم بھرشٹ کرنے کی کوشش کی ایسے کیسے چھوڑ دوں تجھے''۔ اتنا کہتے ہوئے اُس نے منہ بھر کر تھوک زمین پر اُس کے آگے پھینکا اور چلایا:

''چاٹ اِسے۔ بڑی بھوک لگی تھی نہ تیرے بیٹے کو، اُس کی ضد پوری کرنے کے لیے ہمارا دھرم بھرشٹ کر رہا تھا نہ؟ لے اب چاٹ۔ سُنا نہیں میں نے کیا کہا؟''

وہاں کھڑے جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ مادھو کا رنگ زرد پڑ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پردھان کو دیکھنے لگا۔ کرپا نے کس کر باپ کا کرتا پکڑ لیا۔

''دیکھ کیا رہا ہے، چاٹ!'' پردھان ایک بار پھر گرجا۔

''رحم مالک رحم'' اس نے سر کی پگڑی اُتار کر پردھان کے قدموں میں رکھنی چاہی تو پردھان نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے وہیں روک دیا۔

''ایک منٹ میں خود ہی چاٹ ورنہ تیرے سپولے سے چٹواؤں گا''

مادھو نے بڑی اُمید سے چاروں طرف دیکھا کہ شاید کوئی اُس کی مدد کے لیے آگے آ جائے مگر سب خاموش تماش بین گُنگے بہرے بنے کھڑے تھے۔ اُسے لگا وہ مردا بھیڑ میں تنہا کھڑا ہے۔ سب کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں۔

''گردھاری یہ ایسے نہیں مانے گا۔ پکڑ اس کے حرامی کو اور ادھر لا میرے پاس۔ باپ نہیں تو بیٹا یہ سزا بھگتے گا۔'' پردھان نے لٹھ باز کو حکم دیا۔

''رُکیے صاحب یہ بچہ ہے اسے کچھ مت کہیے'' یہ کہتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا تو کرپا نے زور سے باپ کا کُرتا کھینچ لیا۔ اُس کی طرف بنا دیکھے مادھو نے زور سے اپنا کُرتا اُس کی گرفت سے چھڑوایا اور دوزانوں بیٹھ گیا۔

جھکنے سے پہلے ایک بار پھر رحم کی اُمید میں پردھان کی طرف دیکھا۔ نفرت اور غصّے کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ زبردستی اپنے جسم کو آگے کی طرف جُھکانے کی کوشش کی۔ زمین پر تھوک کا گولا دیکھتے ہی اُبکائی آنے لگی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جسم سُوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ تھوڑا اور جھکا پھر اچانک کسی نے اُسے زور سے دھکا دیا اور وہ داہنی جانب لڑھک گیا۔ جب تک وہ سنبھلتا اور سمجھتا کہ کیا ہوا ہے کرپا پردھان کے منہ پر تھوک کر آندھی کی طرح وہاں سے بھاگ گیا تھا۔

''فورتھ انڈسٹریل انقلاب''

انسانی تاریخ میں پہلی بار برطانوی پارلیمنٹ میں بطور گواہ ربورٹ پیش ہوگا۔ کمیٹی کے ارکان ربوٹ سے آرٹیفیشل انٹیلجنس، فورتھ انڈسٹریل انقلاب اور ربوٹکس کے بارے میں سوالات کریں گے۔ برطانوی میڈیا کے مطابق ایوانِ زیریں کی ایجوکیشنل کمیٹی نے مڈل سیکس یونیورسٹی سے پیپر دی ربوٹ کو اگلے ہفتے پیش ہونے کی ہدایت کر دی۔ کمیٹی کے صدر رابرٹ ہیلیفون نے بتایا کہ فورتھ انڈسٹریل انقلاب ہماری نسلوں کے لیے آئندہ تیس برس میں ناقابلِ تسخیر چیلنج ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ کیونکہ ربوٹ کی یادداشت میں پہلے سے سوالات کے جوابات ڈالے جائیں گے یا پھر ربوٹ اپنی آرٹیفیشل انٹیلجنس کی بنیاد پر سوالات کے جوابات دے گا۔

خون کا رنگ

ارشد منیم (مالیر کوٹلہ)

کئی دنوں سے افسانے کا ایک اچھا موضوع میرے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ میں جلد سے جلد اسے تخلیق کی شکل دینا چاہتا تھا۔ ایک دو بار لکھنے بیٹھا بھی مگر کچھ صفحات لکھنے کے بعد میں اسے درمیان میں ہی چھوڑ دیتا تھا۔ کیونکہ میں حقیقت پسند واقع ہوں۔ میں جو بھی لکھتا ہوں پہلے ذاتی طور پر اس کی گہرائی تک جاتا ہوں۔ جیسے پچھلے دنوں میں نے ایک افسانہ جھگی جھونپڑی میں رہنے والوں کی زندگی پر لکھا۔ مگر افسانہ لکھنے سے پہلے میں کئی دن شہر سے باہر جھگی جھونپڑیوں کے چکر لگاتا رہا تھا اور وہاں کافی وقت گزارتا تھا۔ جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے بات چیت کرنے کے انداز، رہن سہن، کھانے پینے غرض یہ کہ ہر چیز کا باریکی سے جائزہ لیتا رہا تھا۔ تب جا کر ایک اچھا افسانہ تخلیق کر پایا۔ جس کو شائع ہونے کے بعد قارئین نے بے حد پسند کیا تھا۔ اب اس موضوع کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ یہ افسانہ جسم فروشی کا دھندہ کرنے والی عورتوں کی زندگی پر تھا اور ہم ٹھہرے بہت ہی شریف انسان۔ کوٹھے پر جانا تو دور میں تو کبھی اس علاقہ کی طرف سے گزرا بھی نہیں جہاں یہ عورتیں دھندہ کرتی ہیں۔ میں اس موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر پاؤں گا۔ حالانکہ میں نے منٹو کے افسانے بار بار پڑھے ہیں۔ لکھ بھی لیتا مگر میرے اندر چھپا ہوا افسانہ نگار مطمئن نہ ہو پاتا۔ اس لئے مجبور ہو کر میں نے یہ افسانہ لکھنے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ جانے کیوں یہ موضوع میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ سوتے جاگتے یہ میرے احساس پہ چھایا رہا۔

آخر میں نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ قدم بھی اُٹھانا قبول کر لیا جو میرے نزدیک ایک گناہ تھا۔ سوچا، چلو اللہ معاف کرنے والا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے کوٹھے پر جانے کے لئے خود کو اندر سے تیار کر لیا۔ اب مجبوری یہ تھی وہاں کیسے جایا جائے۔ اس کا حل بھی جلد ہی نکل آیا۔ میرا ایک دوست جیون اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ جب میں نے اس سے بات کی تو وہ مسکرا کر بولا:

''کیوں میاں بھابھی نے چارا ڈالنا بند کر دیا کیا۔؟ یا پھر بھابھی سے دل بھر گیا ہے۔ جو وہاں جا کر منہ مارنے کی سوچ رہے ہو۔؟''

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو اس ماحول کے پس منظر میں ایک افسانہ لکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے وہاں کے حالات اور وہاں رہنے والی عورتوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر جیون نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا اچھا۔۔۔مزہ خود لینا چاہتا ہے اور بہانہ افسانے کا بنا رہا ہے۔''

میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

''تو مجھے وہاں لے کر چلے گا یا نہیں۔؟''

اس نے شرارتی لہجے میں کہا۔

''لگتا ہے بڑے بے چین ہو، وہاں جانے کے لئے۔ اسی لئے ناراض ہو رہے ہو۔''

میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''مجھے بے چین میرے شوق نے کر رکھا ہے یار۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھے۔۔۔بس تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے وہاں لے کر چلو گے یا نہیں۔''

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے تمھاری یہ تمنا بھی پوری کر دیتے ہیں۔ وہاں کل چلتے ہیں۔ رات کو آٹھ بجے تم میرے پاس آ جانا۔''

اگلے روز میں گاڑی نکال کر ٹھیک وقت پر اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میاں شیو تو بنا کر آتے تاکہ تھوڑا ہینڈسم تو لگتے۔!''

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کیوں۔۔۔؟ ہم کیا کسی کی بارات میں جا رہے ہیں۔؟''

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''بالکل۔۔۔! اور اس بارات کے دلہا تم ہو۔ تو دیکھنا وہاں تیرا کیسا سواگت ہوگا۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلو اب باتیں مت بناؤ۔ جلدی چلو پھر واپس بھی آنا ہے۔''

اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہاں جا کر کس کمبخت کا دل کرتا ہے واپس آنے کو۔''

میں نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی کار کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

''اب یہاں کھڑا ہی مزے لیتا رہے گا یا چلے گا بھی۔؟''

وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

''بڑی بے چینی لگی ہے وہاں جانے کی، چل بھیا آج تمھارے بھی ارمان پورے کئے دیتے ہیں۔''

ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ پورے راستے وہ مجھے وہاں کے بارے میں بتاتا رہا۔ جسے میں غور سے سنتا رہا۔ وہاں رہنے والی عورتوں کے نخرے، بات کرتے ہوئے الگ الگ ادائیں دکھانا، وہ سب مجھے سناتا رہا۔ اور میں ان سب باتوں کو اپنے ذہن میں قید کرتا رہا۔ وہاں پہنچ کر ہم نے گاڑی ایک طرف پارک کی۔ میں گاڑی سے نیچے اُتر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہاں کافی رونق تھی۔ الگ الگ طرح کے پرفیوم کی خوشبو سے پورا ماحول معطر تھا۔ نئے پرانے فلمی گانوں کی آوازیں کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ پان والوں کی کئی دکانیں تھیں۔ جن پر کھڑے نوجوان لڑکے پان اور سگریٹ کا مزہ لے رہے تھے۔ کچھ اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ سب کی نظریں اوپر کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ جہاں کھڑی لڑکیاں اپنی

شوخ ادائیں بکھیرتی ہوئیں ہاتھ کے اشارے سے اُنھیں اپنے پاس بلا رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ لڑکیاں تو بہت ہی خوب صورت تھیں کچھ درمیانی تھیں۔لڑکے بھی اُنھیں طرح طرح کے اشارے کررہے تھے۔

جیون سگریٹ سلگاتے ہوئے میرے قریب آ کر بولا۔

''یہاں کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہا ہے۔اندر چل کر دیکھ سورگ کے نظارے دیکھنے کوملیں گے۔''

میں نے اس سے پوچھا۔

''مگر چلنا کس طرف ہے یہ تو بتاؤ''

جیون نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر ایک سیڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس کوٹھے پر۔''

یہ سنتے ہی میں اس کے ساتھ چل دیا۔تبھی ایک پان والے کی آواز آئی۔

''کیوں میاں جیون کیسے ہو۔؟ بڑے دنوں بعد نظر آئے ہو۔؟ پان تو کھاتے جاؤ۔''

جیون اس کی دکان کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

''بس بھائی کام میں کچھ زیادہ ہی مصروف تھا۔لاؤ پان کھلاؤ۔کئی دن گزر گئے تمھارے ہاتھ کا پان کھائے ہوئے۔''

اس نے پان جیون کو پکڑا کر میری طرف دیکھتے ہوئے جیون سے پوچھا۔

''یہ صاحب کون ہیں۔'' نئے لگتے ہیں۔؟''

جیون نے پان منہ میں دباتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں نئے ہیں۔میرے دوست ہیں اور پہلی بار یہاں آئے ہیں۔''

پان والے نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''ویلکم سر۔اس حُسن کی نگری میں آپ کا استقبال ہے۔اب تو آپ ہر روز آؤ گے۔یہ جگہ ہی ایسی ہے۔جو ایک بار یہاں آ گیا پھر بار بار آتا ہے۔پان کھا لیجیے۔''

اس کی بات سن کر میں خاموش رہا۔اگر تخلیق کا جنون سر پر سوار نہ ہوتا تو بھلا اس گندگی میں آتا ہی کون۔؟ میں نے جیون کے ساتھ چلتے ہوئے بس اتنا ہی کہا۔

''نہیں بھائی میں پان نہیں کھاتا۔''

میں جیون کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔سیڑھیوں پر بھی لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ لئے۔آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں دنیا سے بے خبر ایک دوسرے میں کھوئے بیٹھے تھے۔یہاں تک کہ اُنھیں ہمارے پاس سے گزرنے کا احساس نہیں تھا۔سیڑھیاں ختم ہونے کے بعد ہم ایک کھلے صحن میں پہنچ گئے۔میں نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھا۔ایک طرف کئی کیبن بنے ہوئے تھے۔صحن میں بہت سی عورتیں اور لڑکیاں کھڑی تھیں۔ان میں سے کچھ آپس میں باتیں کر رہی تھیں تو کچھ ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ان میں سے ایک خوب صورت لڑکی ہمارے پاس آئی۔وہ گہرا میک اپ کئے ہوئے تھی۔

اس کے پاس آتے ہی پرفیوم کی تیز خوشبو میرے نتھنوں میں گھستی چلی گئی۔وہ جیون کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

''کیوں بے چکنے بڑے دنوں بعد آیا سالے۔میں تو تمھارا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی''

جیون نے اسے اپنے پاس کھینچتے ہوئے کہا۔

''چل سالی،جھوٹ بولتی ہے۔''

اس نے جیون کے گال پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

''تمھاری قسم۔۔۔چلو آ گئے ہو تو یہ بتاؤ،تم تو میرے ساتھ ہی بیٹھو گے نا۔؟''

جیون نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

''ہاں ہاں تیرے ساتھ ہی بیٹھوں گا۔سالی تو تو میری گھر والی ہے نا''

وہ ایک طرف چلتے ہوئے بولی۔

''تو پھر چلو،دیر کیوں۔؟''

جیون اس کے ساتھ چل دیا۔میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔ہم ایک کیبن میں داخل ہو گئے۔جس میں ایک چھوٹا سا بیڈ لگا ہوا تھا۔جیون نے جب میری طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

''تم یہاں کہاں آ گئے،جاؤ باہر جاؤ اور اپنے لئے کوئی دیکھو۔''

میں شرمندہ سا ہو کر کیبن سے باہر آ گیا اور ایک طرف کھڑا ہو کر اِرد گرد کا جائزہ لینے لگا۔کئی لڑکیاں وہاں موجود تھیں۔جو نیچے سے گزرنے والوں کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارہ سے اپنے پاس بلا رہی تھیں۔ان میں سے ایک لڑکی کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ میری طرف چلی آئی۔میرے پاس آ کر وہ تھوڑا شرارتی انداز میں بولی۔

''کیوں بے چکنے میرے ساتھ بیٹھے گا کیا۔؟''

''سوری۔۔۔میں نہیں بیٹھوں گا۔۔۔کسی کے ساتھ بھی نہیں بیٹھوں گا''

میرے اتنا کہتے ہی وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

''کیا بابو۔؟ یہاں کیا پوجا کرنے آئے ہو۔؟''

میں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی سمجھو۔۔۔''

وہ تڑاک سے بولی۔

''کیسا آدمی ہے رے تو۔۔۔؟! سمندر میں رہ کر پیاس نہیں بجھانا چاہتا۔تو آدمی ہے بھی کہ نہیں۔؟!!''

اس کی بات سن کر میں خاموشی سے اس کیبن کی طرف دیکھنے لگا جہاں جیون اس لڑکی کے ساتھ گیا تھا۔اس کا دروازہ ابھی تک بند تھا۔پتہ نہیں کب کھلے گا۔میں جلدی سے جلدی یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔مجھے یہاں گھبراہٹ محسوس ہونے لگی تھی اور یہاں موجود لڑکیوں سے نفرت جو بات چیت کتنے گندے طریقے سے کر

رہی تھیں۔نوجوان لڑکیاں اپنے باپ کی عمر کے لوگوں کوغلط اشارے کررہی تھیں۔
اُف۔۔۔یا خدا مجھے معاف کر دینا میں یہاں کہاں آ کر پھنس گیا۔
لعنت ہے مجھ پر۔

مجھے خاموش کھڑا دیکھ کر میرے پاس کھڑی لڑکی واپس دوسری لڑکیوں میں جا کر شامل ہوگئی۔اس نے ان سبھی سے کچھ کہا۔جسے سن کر سب کی سب میری طرف دیکھتے ہوئے کھِلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

میں سوچنے لگا،کیسی مجبوری ہے ان کی اپنا جسم بیچنے کی ان میں سے کچھ اچھے گھر کی بھی ہونگی۔!کوئی خوف یا کوئی بھی پریشانی ان کے قریب تک نہ تھی۔

اتنے میں دوتین لڑکیاں پھر میرے پاس آئیں۔ان میں سے ایک نے کہا۔

''آپ کے دوست کوتو ابھی ٹائیم لگے گا۔اتنی دیر آپ اس کمرے میں بیٹھ جائیں۔''

میں ان کے ساتھ چل دیا۔وہ سبھی مجھے ایک کمرے میں لے گئیں۔

کمرہ بہت ہی خوب صورت اور بڑا تھا۔شاندار صوفے،نیچے بچھا قالین بہت قیمتی تھا۔سامنے ہی ایک بیڈ لگا ہوا تھا۔جس پر بیٹھی ادھیڑ عمر کی عورت پان بنا رہی تھی۔اس کے ساتھ ہی بیڈ پر ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی بیٹھی تھی۔دوتین لڑکیاں صوفے پر بیٹھی تھیں۔میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ادھیڑ عمر کی عورت میری طرف عجیب انداز سے دیکھنے لگی۔ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر اس کے کان میں کچھ کہا۔جسے سن کر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آیئے۔۔۔آیئے۔۔۔بیٹھئے۔۔۔''

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔وہ لڑکیاں پھر باہر چلی گئیں۔ادھیڑ عمر کی عورت نے مجھ سے پوچھا

''پان کھایئے گا۔؟''

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں۔۔۔شکریہ۔''

اس نے اپنے منہ میں پڑے پان کو اگالدان میں تھوک کر نیا پان منہ میں دبالیا اور پھر مجھ سے پوچھا۔

''کچھ چائے ٹھنڈا منگواؤں۔۔۔؟''

''جی نہیں۔۔۔شکریہ۔مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

یہ سن کر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ کی مرضی۔۔۔آپ یہاں آرام سے بیٹھو۔کوئی دقت نہیں۔آپ کا دوست یہیں آجائے گا۔''

''جی۔۔۔!''

کچھ دیر بعد ایک خوب صورت لڑکی اندر آئی۔اس کے چہرے اور گردن پر گہرے رنگ کے کئی نشان بنے ہوئے تھے۔بال بے ترتیب ہو چکے تھے۔وہ بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔باہر گیٹ پر ایک پہلوان قسم کا آدمی کھڑا مسکرا رہا تھا۔اس لڑکی نے روپے نکال کر ادھیڑ عمر کی عورت کو پکڑا دیئے۔اس نے روپے گننے کے بعد کچھ روپے واپس اس لڑکی کو پکڑا دیئے اور باقی کے روپے اپنے پاس بیٹھی لڑکی کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''جاؤ بیٹی رکھ آؤ۔۔۔''

وہ لڑکی اُٹھی اور میرے سامنے والی دیوار کے ساتھ لٹک رہے پردے کو ذرا سا ہٹا کر اس کے پیچھے چلی گئی۔ادھیڑ عمر کی عورت اُس آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آج تو کچھ زیادہ ہی برا حال کر دیا بچی کا۔؟''

وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

''دھندے میں نئی ہے ابھی۔یہاں کے داؤ پیچ جلد ہی سیکھ جائے گی۔اور پھر ہم تو روکڑا دے کر پورا وصول لینا جانتے ہیں۔اس معاملے میں لحاظ کیسی۔؟

یہ سن کر وہ عورت تھوڑا غصہ ہو کر بولی۔

''روپے وصولنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم اس بیچاری کو مار ہی ڈالو۔!''

وہ آدمی ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔لڑکی پردے کے پیچھے سے نکل کر پھر اس عورت کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔میں نے ایک نظر کمرے کی دیواروں پر ڈالی۔ایک دیوار پر الگ الگ دیوی دیوتاؤں جن میں لکشمی دیوی،کرشن جی،گورو نانک دیو،مکہ معظمہ،مدینہ منوّرہ کی تصویریں لٹک رہی تھیں۔

اتنے میں ایک عورت اور اندر آئی۔اس نے بھی روپے نکال کر بیڈ پر بیٹھی عورت کو پکڑا دیئے۔عورت کے پاس بیڈ پر بیٹھی لڑکی اُٹھی اور روپے رکھنے کیلئے پھر پردے کے پیچھے چلی گئی۔میرے اندر ایک چاہت سی پیدا ہوئی کہ آخر اس پردے کے پیچھے ہے کیا۔؟ پورا کمرہ کھلا ہے صرف یہاں پردہ کیوں ہے؟ میں نے تھوڑا دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

تبھی کمرے میں بہت ہی خوب صورت لڑکی داخل ہوئی۔اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور اپنی ایک آنکھ دبا دی۔میں جھینپ کر رہ گیا۔وہ میرے قریب آ کر ایک ادا کے ساتھ بولی۔

''کیوں ہنڈسم کیا ارادہ ہے۔؟''

میں اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

وہ جلدی سے میری گود میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میں اتنی بری بھی نہیں ہوں۔جو تم منہ دوسری طرف پھیر رہے ہو۔!''

''میں۔۔۔میں۔۔۔!!''

میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔میں نے بے بسی سے بیڈ پر بیٹھی عورت کی طرف دیکھا۔وہ مسکرا رہی تھی۔میری گود میں بیٹھی لڑکی میرے ہونٹوں کے قریب اپنے ہونٹ لا کر دھیرے سے بولی۔

''اُدھر کیا دیکھ رہے ہو۔؟اِدھر دیکھو جلوہ تو اِدھر ہے۔!''

اس کی گرم سانسیں میرے اندر ایک بے چینی سی پیدا کر رہی تھیں۔ میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئیں تھیں۔ میں نے بیڈ پر بیٹھی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے التجا بھرے انداز میں کہا۔

''پلیز۔۔۔!''

بیڈ پر بیٹھی عورت اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔

''مہما کیوں پریشان کر رہی ہو بابو کو۔؟ ہٹو اِدھر۔۔۔جب یہ نہیں چاہتے تو تم کیوں ان کو مجبور کر رہی ہو۔ جاؤ باہر کسی اور کو دیکھو۔ یہ تو بے چارہ شریف آدمی ہے نہ جانے اِدھر کیسے آپھنسا۔؟''

اتنا سنتے ہی وہ لڑکی بل کھاتے ہوئے میری گود سے اُٹھی اور باہر کی طرف جاتے ہوئے اُس نے میری طرف دیکھا اور نفرت سے بولی۔

''سالہ چھکّا۔''

میں غصّہ سے تڑپ کر رہ گیا۔ میں چپ چاپ اپنے آپ کو اندر سے درست کرنے لگا اور رومال سے پسینے کو صاف کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ کیسی بے غیرت عورتیں ہیں۔ جو روپے کی خاطر اپنی۔۔۔ چھی۔ لعنت ہے ان پر۔ کتنی گندی جگہ ہے۔

ایک لڑکی اور اندر آئی۔ اس نے بھی روپے نکال کر اس عورت کو پکڑا دیئے۔ ادھیڑ عمر کی عورت کے پاس بیٹھی لڑکی جب روپے رکھنے کے لئے اُٹھی تو بیڈ پر بیٹھی عورت نے اس سے کہا۔

''بیٹی ذرا کولر چلا دینا۔ بابو کا تو کچھ زیادہ ہی برا حال ہوا جا رہا ہے پسینے سے۔ کولر کی ہوا سے ان کو راحت ملے گی۔''

پھر وہ عورت میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''بابو، ایک بات ہے آپ ایمان کے بڑے پکے ہو۔''

میں چپ رہا۔ لڑکی کولر چلا کر پردے کی طرف چل دی۔ میرے اندر پھر پردے کے پیچھے دیکھنے کی چاہت بڑھ گئی۔ کولر کی ہوا نے مجھے کچھ راحت دی تھی۔ جو بالکل میرے پیچھے کمرے سے باہر لگایا ہوا تھا۔ میری نظر پردے پر تھی جو میرے سامنے تھا۔ اس لڑکی نے جب پردہ اُٹھایا تو کولر کی تیز ہوا کی وجہ سے پردہ کچھ زیادہ ہی اُٹھ گیا۔ میری نگاہ ایک دم سے اندر گئی۔ اندر کئی ننھے منّے بچے فرش پر پڑے سو رہے تھے۔ میں ایک دم سے چونک گیا۔ میں نے بیڈ پر بیٹھی عورت کی طرف دیکھا۔ میرے اندر پیدا ہوئے سوالات کو وہ بھانپتے ہوئے بولی۔

''ہاں بابو یہ ان ہی عورتوں کے بچے ہیں۔ جنہیں آپ یہاں مسکراتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔''

یہ سن کر میں سوچنے لگا کہ پورے ملک میں آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں۔

لوگ دھرم کے نام پر لڑ لڑ کر ہر روز مرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی نے قومی یکجہتی دیکھنی ہو تو یہاں آکر دیکھے۔ ان بے خود ہو کر سو رہے بچوں کو دیکھ کر کوئی نہیں بتا سکتا کہ ان میں سے رحیم کا خون کون ہے۔ اور رام کا کون۔۔۔!!

پوور کنٹری۔۔۔!!!

"سنو! تم کل سے نظر نہیں آ رہے، کہاں تھے؟
"actually" میں ممّا کے ساتھ الحمراء گیا ہوا تھا۔
وہاں فیسٹیول تھا، وہ ہے نا وہ اردو پوئٹ، کیا نام ہے اُس کا،
او گاڈ آئی فور گوٹ!
وہ جس کے نام میں ایک ہی ورڈ دو بار آتا ہے"
"فیض احمد فیض"
"exactly" فیض احمد فیض، ممّا کہتی ہیں.
He was a revolutionary poet
پتہ ہے، بہت ہارڈ ہے، اُس کی لینگویج، او مائی گاڈ!
اوپر سے گزر جاتی ہے، فرینکلی اسپیکنگ
ممّا کے بھی پلّے نہیں پڑتا مگر وہ اُس کو لائیک کرتی ہیں۔
کہتی ہیں سمجھ میں آتا تو اور مزا دیتا،
ممّا ہر سال اس کے فیسٹیول کو آرگنائز کرنے میں سب سے آگے ہوتی ہیں
ممّا کو ایک ہی شعر اُس کا سمجھ میں آیا ہے، وہ کیا ہے کہ
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
یو نو دکھ؟ Distress, sorrow, sadness
تو وہ پوئٹ کہتا ہے
اور بھی دکھ ہیں ان دی ورلڈ محبت means لو کے سوا،
اینڈ راحتیں comfort, joy, pleasure,means
اور بھی ہیں, وہ کیا ورڈ تھا, ہاں یاد آیا'' وصل''
ممّا سے اس کا مطلب پوچھا . ان کو خود کو پتہ نہیں تھا.
شی سیڈ، وصل ''perhaps'' ڈیٹ مارنے کو کہتے ہیں.
گاڈ نوز، یہ جتنا بھی اردو پوئٹس ہیں نا
یہ ڈیٹ مارنے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔
بٹ ان کا beloved ان کو لفٹ نہیں کراتا، ہاہاہا، پُور گائیز!!
پتہ ہے وہ فیسٹیول میں جو بھی گائی اسٹیج پر آتا
مائک پر ایسی موٹی موٹی باتیں کرتا، نا میری سمجھ میں آتیں نا ممّا کی
میں تو اپنے موبائل پر گیم کھیلتا رہا اور ممّا ٹوئیٹس کرتی رہیں
واٹ اے بورنگ فیسٹیول.
ممّا کہتی ہیں فیض جو ہے نا وہ بہت revolutionary poet تھا
اگر سمجھ میں آجاتا تو پاکستان میں revolution آجاتا۔
یہاں کی misery ہے جو سمجھ میں آتا ہے وہ revolutionary نہیں ہوتا
اور جو revolutionary ہوتا ہے وہ سمجھ میں نہیں آتا.
پوور کنٹری....!!!!"

بریانی

سلمان عبدالصمد

(دہلی)

دعوتِ بریانی کا مدعا جانے بغیر عظیم صاحب کے بنگلہ نما گھر میں بہت سے افراد جمع تھے۔آنے والوں میں بریانی کی اشتہا اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ گارڈ روم کے اردگرد بکھرے گملوں میں لگے پھول مرجھائے ہیں یا کھلے، کسی نے ان پر توجہ ہی نہیں دی اور سب کے سب گملوں کی درمیانی راہ سے گزر کر پنڈال میں پہنچ گئے۔جب تک بریانی کی پلیٹیں ان کے ہاتھوں میں نہیں آئیں، اس وقت تک چند مہمانوں نے میزبان کو تلاش کیا۔تاہم تلاشی مہم میں کسی کو کامیابی نہیں ملی اور کھانے کے دوران وہ سب کے سب عظیم صاحب کو اس طرح بھولے، جیسے ان سے عظیم تر بریانی ہی ہو۔چوں کہ عظیم صاحب کا بنگلہ نما گھر شہر کے بیچوں بیچ تھا، اس لیے انھوں نے خاص بریانی کے بنوانے کا انتظام شہر کے نواحی علاقہ کے اپنے ایک چھوٹے سے گھر کے دالان میں کیا تھا، لیکن مہمانوں کو کھلانے کا نظم شہری بنگلہ میں ہی تھا۔

بریانی کے رازدارانہ سفر میں باورچیوں کی کسی چُوک سے کہیں راز فاش نہ ہوجائے، اس لیے عظیم صاحب باورچیوں کے پاس ہی بیٹھے تھے۔چنانچہ شہری بنگلہ میں بریانی کھانے کے دوران ان کی تلاشی مہم میں مہمانوں کو کامیابی نہیں مل سکی تھی۔

بریانی بنتے وقت عظیم صاحب گہری سوچ کی چادر میں لپٹے لپٹائے باورچیوں سے کچھ دور بیٹھے تھے۔اینٹوں سے بنے چولہے میں لکڑی کے چیلے ٹھونسے جارہے تھے اور وقفہ وقفہ سے چنگاریاں اڑ اڑ کر پٹ پٹ چٹ چٹ کی آواز کے بعد خاموش ہو جاتی تھیں، مگر عظیم صاحب کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ چنگاریاں ان کے اندرون کو خاکستر کیئے دے رہی ہیں، جس سے وہ بعض اوقات تلملائے تلملائے نظر آتے تھے۔ان کی اس تلملاہٹ کا احساس یہاں موجود سات باورچیوں اور ان کے معاونین کو نہیں ہو رہا تھا۔البتہ وہ تین باورچی عظیم صاحب کی اس کیفیت کو اچھی طرح محسوس کر سکتے تھے، جو رازدارانہ بریانی کے سفر میں ان کے ہم رکاب تھے۔

بریانی کی کچھ دیگ ابھی چولہے پر پک رہی تھیں اور دو بنگلہ نما گھر پہنچا دی گئی تھیں، جہاں بیشتر مہمان نئی طرز کی بوٹیوں سے گوشت نوچنے میں مصروف تھے اور چند ایک اس پر تبصرہ بھی کرتے جاتے تھے۔

''شاندار، ذائقہ دار، زبردست بریانی بنی ہے''۔ایک نے کہا۔

''میں تو برادرانِ وطن کا حددرجہ قدردان، اس لیے ہر 'بڑے' کا خاص خیال رکھتا ہوں۔چنانچہ میں نے پہلے غور سے بریانی دیکھی۔گول مٹول اور ریشہ دار بوٹیوں کو دیکھا۔جب یقین ہوگیا کہ بڑے کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔۔۔تب میں نے پلیٹ سنبھالی۔۔۔دوسرے نے کہا۔

''چکنی بوٹیاں تو ہیں نہیں، سوکھی بوٹیوں کی بریانی۔۔۔اس لیے کچھ مزہ نہیں ہے اس میں'' تیسرے نے کہا۔

''عظیم صاحب نے برازیل سے بیف منگوائی ہو..اس لیے گوشت کی رنگت ذرا بدلی بدلی سی ہے''۔چوتھے نے کہا۔
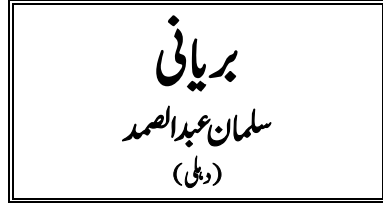
''ہاں، ان کا کاروبار پھیلا ہوا ہے، برازیل سے ہی۔۔۔''چوتھے فرد کا کسی نے جواب دیا۔

''دنیا بھر میں بیف کی سپلائی سب سے زیادہ برازیل سے ہوتی ہے۔۔۔شاید وہاں مختلف قسم کے جانور پائے جاتے ہوں۔۔۔''اس فرد کی ہاں میں کسی اور نے ہاں ملائی۔

بریانی کھانے کے دوران مہمان یہ سب باتیں کررہے تھے۔مختلف زبانوں پر مختلف موضوعات تھے اور سب کے حلق سے بریانی بآسانی اترتی چلی جارہی تھی، لیکن بوٹیوں کی ساخت کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

اسی دوران بقیہ دیگر دیگ کے ساتھ عظیم صاحب پنڈال میں نظر آئے۔کئی ایک نے کھاتے وقت ان سے ملاقات کو فضول ہی سمجھا۔تاہم جو بھی ان کی نظروں کے شکنجے میں آجاتا، وہ پہلے رسمی حال واحوال میں الجھتا۔پھر ان کے سامنے بلا تاخیر بریانی کی تعریف کرتا۔

''باہر کے کاریگروں نے تو بریانی نہیں بنائی ہے۔اس قدر لذیذ۔۔۔''

''نہیں۔۔۔یہ ہمارے اپنے قریبی باورچی ہیں۔ہماری عزت کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں''۔باورچیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عظیم صاحب بولے۔

اسی درمیان ایک اور جملہ پیچھے سے پھُدکتا ہوا کئی کانوں تک پہنچ گیا کہ۔۔۔

''شاید آپ کی نئی شریک حیات نے بریانی بنانے میں مدد کی ہے۔اس لیے تو اتنی اچھی بنی ہے۔''

اس جملے پر ایک صاحب بول اٹھے:

''شریک حیات نے نہیں، عظیم صاحب بریانی بنانے میں خود شریک تھے شاید۔بنگلہ آتے ہوئے میں نے شہر سے باہر والے گھر پر اُچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی، عظیم صاحب وہیں تھے۔۔۔

ان مکالموں کے درمیان دیگ کی بریانی حلق کے راستے اتر کر اپنی جگہ پہنچ گئی تھی۔عظیم صاحب پھیکی مسکان کے ساتھ مہمانوں کو اب الوداع کہہ رہے تھے۔خنک بھری روشنی میں ان کا چہرہ اترا ہوا تھا لیکن انھیں اپنی بے سمت عظمت پر اتراہٹ ہو رہی تھی۔ایک کال پر بے چوں چراں لوگوں نے دعوت قبول کر لی تھی۔بیس بائیس گھنٹے پہلے ہی تو انھوں نے لوگوں کو دعوت پر بلانے کا ارادہ بنایا

تھا۔ان کو جلدی جلدی کال کی گئی اور سب کے سب آ دھمکے۔ وہ خود محسوس کرنے لگے کہ شاید میرے پاس لوگوں کو جمع کرنے کا خاص ہنر ہے۔اس کے علاوہ لذیذ بریانی اور بیرون ممالک سے ان کے تعلقات پر ایسی قصیدہ خوانی... پھر انانیت کو تسکین پہنچانے والی بے مدعا بریانی کی دعوت۔۔۔شاید اس دعوت میں نیک نیتی کم اور انانیت کی تسکین کا بڑا معاملہ چھپا تھا۔

بریانی کی تعریف اور انا کی تسکین کی فضا میں عظیم صاحب بھول ہی گئے کہ دوسری نئی بیوی کو لوگوں سے ملوانا بھی ہے۔حالانکہ لوگوں سے ملاقات میں بیگم کے لیے دوطرفہ تسکین کا معاملہ چھپا تھا۔۔۔انا کی تسکین کے ساتھ ساتھ عظیم صاحب کی زوجیت میں آنے کی نمائش بھی!

لوگوں کے جانے کے بعد عظیم صاحب نے کچھ دیر بہ نفسِ نفیس پنڈال کی صفائی کروائی۔اس کے بعد راز دارانہ انداز میں نوکروں سے کچھ کہتے ہی بنگلہ کے اندر چلے گئے۔

رات کے سناٹوں کو عریاں کرنے کی ذمہ داری شاید شہر کے کتوں نے لے لی تھی۔اس لیے سناٹا بے لباس تھا اور کتوں کی آوازیں، سناٹوں پر قابض تھیں۔ کتے شاید اس گمان میں تھے کہ ہڈی دار گوشت ہماری قسمت میں ہوگا۔نزاکت کے ساتھ کھانے والوں نے ہڈیوں پر سے گوشت کا پورا پورا ریشہ نہیں نوچا ہوگا، اس لیے آج ہمارے وارے نیارے۔۔۔

کتوں کے بھونکنے کی آواز مسلسل سناٹوں میں پیوست ہوتی چلی جارہی تھی۔یہ بتانا مشکل تھا کہ بھونک بھونک کر وہ اپنی قسمت پر نازاں ہونے کا جشن منا رہے تھے یا پھر کتوں کی آواز ناقابل فہم تھی۔۔۔مبہم تھی۔۔۔کچھ اور خلاصہ کرنے والی آواز تھی اور لوگ سمجھنے سے قاصر۔۔۔راز دارانہ سفر کی کہانی وہ سنا رہے تھے،مگر ان کی آواز لوگ نہیں سمجھ پا رہے تھے۔

اِدھر صفائی مہم کے بعد کتوں کو مایوسی ہاتھ آئی کہ عظیم صاحب کے حکم کے مطابق نوکروں نے مخصوص ڈسٹ بین میں تمام پلیٹیں اور بقیہ ماندہ کھانا جمع کر دیا تھا۔اُدھر وہ بنگلہ کے درمیانی روم پہنچے تو بیگم کو نئے جوڑے میں ملبوس ومنتظر پایا۔ لوگوں سے مصافحہ اور معانقہ کی حسرت بیگم کے دل میں ہی چُرمُرا کر رہ گئی اور صرف وہ گہری نظروں سے عظیم صاحب کو اپنی طرف آتے دیکھنے لگی۔دیکھنے کے عمل میں بیگم کو ایسا لگا کہ شوہر کے ایک چہرہ میں کئی چہرے اُگ آئے ہیں اور ان کا اصلی چہرہ کہیں روپوش ہوگیا ہے۔بیگم کی آنکھوں میں شوہر کا چہرہ گڈمڈ ہونے لگا تھا۔

عظیم صاحب بیگم سے قریب آئے۔ان کے متعدد چہرے اب روپوش تھے۔آتے ہی انھوں نے بیگم کو بانہوں میں بھرلیا اور لوگوں سے نہ ملا پانے کی وجہ سے معافی تلافی کرنے ہی والے تھے کہ خنک موسم میں ان کے پورے چہرے پر ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگیں، جیسے برف جمی کسی کٹورے کو فریج سے چند منٹ قبل نکالا گیا ہو۔وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا ہوگیا ہے۔عظیم صاحب کی حالت یکا یک ایسی کیوں ہوگئی ہے۔

چند لمحات بعد چہرے پر بوندیں اور بھی زیادہ ہوگئیں اور ان کی بدنمائی واضح ہونے لگی۔ایسا لگتا کہ یہ پسینے کی بوندیں نہیں، بلکہ بدہیئت چہرہ کو گومڑوں نے ڈھک لیا ہے۔آناً فاناً عظیم صاحب کو ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔وہاں ان کی کیفیت دوسری ہوگئی۔کپکپی طاری تھی۔دُلدُلی سی آگئی۔انگلیاں خاص انداز میں اینٹھن کے ساتھ ہل رہی تھیں۔کبھی کبھی چند لحظہ کے لیے دلدلی کم ہوتی اور عظیم صاحب دیکھتے دیکھتے فوراً اپنے چہرہ کو ایکا ایکی دائیں بائیں کی طرف تیزی سے پھیرنے لگتے، جیسے کوئی غیر مرئی تھپڑ باری باری گالوں پر یلغار کر رہی ہو اور وہ اس سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

باورچیوں سے عظیم صاحب نے قربت کا اظہار کیا تھا، اس لیے شاید انھوں نے آخری دیگ سے ایک رقاب بھر کر بنگلہ میں پہنچا دیا تھا، تاکہ اہل خانہ فراغت کے بعد ڈنر کر لیں، مگر ان کی حالت نے سب کو بے چین کر دیا تھا۔

نئی بیگم کے ساتھ چند نوکر اسپتال میں تھے اور چند گھر میں۔عظیم صاحب کی نگاہ میں عظیم نظر آنے والا قابل اعتماد نوکر گھر میں ہی تھا۔وہ بھی پریشان تھا۔پریشانی کے عالم میں نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ گھر میں رکھی بریانی کی ایک پلیٹ نازیہ کے بند کمرے میں رکھ آیا۔بھوک اسے بھی لگی تھی، تاہم اپنے آپ کو اس نے نظرانداز کر دیا۔

کوئی بیس گھنٹے قبل ہی نازیہ کو روم میں قید کرنے کے بعد عظیم صاحب نے بریانی کی دعوت کا ارادہ بنایا تھا۔کیوں کہ اپنی نئی نویلی بیوی سے فون کروا کے انھوں نے اپنے گھر اس لڑکے کو بلوایا تھا، جس سے نازیہ کی قربت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔اس قربت سے والد عظیم صاحب کو سخت نفرت تھی۔اس لیے جب وہ لڑکا نازیہ کی سوتیلی ماں کی آواز کو نازیہ کی آواز سمجھ کر اس کے گھر پر اس سے ملنے آیا تو عظیم کے ہتھیار والے ہاتھ نے۔۔۔

روم میں قید نازیہ اب گہری نیند میں تھی۔اس کے نتھنوں سے آوازیں ابھر ابھر کر کمرہ میں تحلیل ہو رہی تھیں۔بریانی بھری پلیٹ شاندار پلنگ کے قریب رکھی تھی۔گھنٹوں بعد اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ دروازہ کی طرف دوڑی کہ شاید گیٹ کھل گیا ہو۔بریانی نے وقت کی برف پگھلا کر میرے لیے باہر نکلنے کا راستہ بنا دیا ہو۔غنودہ آنکھیں، بکھرے بال، مضمحل خیالات اور ڈگمگاتے قدموں سے وہ بیڈ پر لوٹ آئی اور بریانی کی طرف لرزتی انگلیاں بڑھا دیں۔۔۔

وہ پریشانی سے چلانا چاہتی تھی۔دیواروں کے سمندر میں خیالات کی کشتی پر بہے چلی جارہی تھی۔مقفل دروازہ کی وجہ معلوم کرنا چاہتی تھی۔وہ اٹھی اور جا کر گیٹ پر دونوں ہتھیلیاں پیٹنے لگی، جیسے وہ اسے جھنجھوڑ کر جگانا چاہتی ہو اور بند رہنے کی وجہ معلوم کرنا چاہتی ہو۔کئی بار گیٹ پر آئی اور بیڈ پر لوٹ گئی۔۔۔پھر بریانی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کھینچ لیا۔

خیالات کو جھنجھوڑتے اور تنہائیوں کو کاٹتے وہ غنودگی کے عالم میں پہنچ گئی۔ تکیے پر اس کے بال بکھرے تھے۔مکمل طور پر وہ کروٹ نہیں لیٹی تھی۔

ایک طرف نازیہ کی حالت غیر تھی اور دوسری طرف اس کے والد کی۔ دونوں کی ایسی حالت کی صحیح وجہ سے بہت سے لوگ ناواقف تھے۔ اگر والد جانتے ہوں تو جانتے ہوں، تاہم نازیہ تو بالکل لاعلم تھی۔ نازیہ خود کو کمرے میں بند ھک بنائے جانے کی وجہ سے بھی واقف نہیں تھی۔

پلنگ کی برابر والی میز پر بریانی ٹھنڈی ہو چکی تھی، جیسے لاش ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ کمرے سے کبھی کبھی کُڑھنے کی آواز آتی تھی۔ اسی کراہن سے نازیہ کو ایسا لگتا تھا کہ میری آواز چھینی جا رہی ہے۔ وہ اپنی آواز کی حفاظت کرنا چاہتی ہے، لیکن بے بس ہے۔ آواز چھیننے والی پر اس نے نظر ٹکا دی ہے۔ ٹک ٹکی باندھ کر اسے دیکھے جا رہی ہے۔ یکا یک اس کی نظروں میں جو چہرہ ابھرا، وہ جانا پہچانا ہے۔۔۔نئی نویلی سوتیلی ماں۔۔۔ گویا عظیم صاحب کی نئی بیوی، جو اس کی سوتیلی ماں تھی، کو نازیہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ میری آواز چھین رہی ہے اور ہم دونوں آواز میں ایسی مماثلت کہ سننے والے شاید ہی فرق محسوس کرے۔

آواز کے تحفظ میں جب نازیہ کو ناکامی ہاتھ آئی تو یکا یک وہ خوش ہونا چاہتی ہے کہ کم از کم اس کی ہم آواز، کوئی جنم تو لے رہی ہے۔ پھر اچانک خیال آتا کہ ایک آواز کا دوسری آواز میں مدغم ہونا التباس کو جنم دیتا ہے اور التباس سے نت نئے فتنے جنم لیتے ہیں۔

خواب آور فضا میں نازیہ کی سانس کے رکنے اور تیز ہونے کا سلسلہ دراز ہو گیا تھا۔ وہ اُونہہ اُونہہ کر رہی تھی۔ اسی درمیان ایک بار یہ کڑھن اور اونہہ اونہہ کی مبہم آواز بلند ہوئی اور پھر کمرہ میں پھیلی خاموشی کا حصہ بن گئی۔

اسی غنودگی کے عالم میں نازیہ کو لگا کہ میری آواز چھین لینے والی سوتیلی ماں کی آواز فون پر ابھر رہی ہے۔ اس کے کرشماتی سُروں میں اسی طرح کشش پیدا ہو گئی، جیسے میری زبان میں ہے۔

ماں کی مماثل آواز پر خود نازیہ کا کوئی شناسا سا چہرہ اس کی طرف چلا آ رہا ہے۔ نازیہ خوش ہے کہ یہ سب ہوا چاہتا ہے۔ خود اس کی انگلیوں میں وہ بس جائے گی۔ اس کی سانسوں میں اتر جائے گی۔ میرا چہرہ اس کے چہرے میں سما جائے گا۔ میں اس میں مدغم ہو جاؤں گی۔ برسوں پلنے والی ہم دونوں کی تمناؤں کا ملن ہوگا۔ مماثل آواز کا فائدہ مجھے ہی ہونے والا ہے کہ میرا شناسا سا میری طرف دوڑا چلا آ رہا ہے۔

جب آنے والا اس کے بنگلہ نما گھر میں داخل ہوا تو ایک عظیم سایہ اس کی طرف بڑھ گیا ہے۔ جس کا چہرہ سرخیوں میں ڈوبا ہے۔ آنے والا جس طرح اس سے قریب ہو رہا ہے، گھر سے نکلنے والے کی کیفیت مزید بھیانک ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں نوکیلا اوزار ہے۔ چہرہ خوف ناک ہے۔ دانتوں کی رنگت تبدیل ہو گئی ہے۔ اس کے چہرہ پر حیوانی شرارے اٹھنے لگے ہیں۔ ہتھیار والے ہاتھ میں بلا کی تیزی آ گئی ہے اور آنے والا سایہ اب بالکل غائب ہے۔۔۔ چمکدار ہتھیار کی چمک اب ماند پڑ گئی ہے اور ٹپ ٹپ ہتھیار کی نوک سے خون ٹپک رہا ہے۔

بیٹی نازیہ کی طرف اس کا آنا شاید عظیم سایہ کو نہایت ہی ناپسند تھا۔ اس لیے انانیت کی تسکین کے لیے خونخواری کی فضا۔۔۔

ہاتھ میں آئی بلا کی تیزی اور سایہ کی چیخ سے فضا مرتعش ہو گئی تھی اور عظیم سایہ کی زبان سے خواب میں نازیہ بہ مشکل تمام سن سکی ''سالے کی بوٹیوں کا ہار، کتوں کے گلے میں ڈالوں گا۔۔۔''

نازیہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ پتھرائی آنکھوں سے دیواروں کو دیکھا۔ اپنے ذہن کو ٹٹولا۔ پھر پسینے سے شرابور اپنے پورے وجود کو چھونا شروع کیا۔ چکراتے ذہن کو گرفت میں لینے کی ناکام کوشش کی۔ اپنے قریب سرد پڑی بریانی کی پلیٹ کو کن انکھیوں سے دیکھا۔

وہ سوچنا چاہتی تھی کہ میں ابھی کیا سوچ رہی تھی۔ کیا دیکھ رہی تھی۔ اس طرح وہ مماثل آواز میں ابھرنے والی فضا کو جمع کرنا چاہ رہی تھی۔ دیواروں کے بیچ جنم لینے والے خواب آور جملوں کو جوڑنے کی کوشش کر رہی تھ۔۔۔ مگر ناکامی ہاتھ آئی اور پریشانی بڑھ گئی۔

دوسری طرف ڈاکٹروں نے صبح ہی صبح عظیم صاحب کو ڈس چارج کر دیا تھا۔ ہسپتال والے نوکروں نے گھر کے نوکروں کو مطلع کر دیا، تاکہ ان کے آنے سے پہلے وہ سب الرٹ ہو جائیں۔ اطلاع کے بعد قابل اعتبار نوکر سب سے پہلے دبے قدم نازیہ کے روم پہنچا کہ بریانی والی پلیٹ اٹھالائے۔ کہیں، صاحب کو علم نہ ہو جائے کہ نازیہ کو کھانے کے لیے کچھ دیا گیا ہے یا پھر صاحب کی نگاہ میں خود اس کا اعتبار ہی مشکوک ہو جائے۔ بریانی کی پلیٹ ویسے ہی بھری تھی، جیسی دیر رات رکھی گئی تھی۔

اسپتال سے لوٹنے کے بعد عظیم صاحب گاڑی سے اترے تو صبح کی روشنی پھیلی تھی اور نازیہ کے سرہانے سے اٹھائی گئی بریانی سے بھری پلیٹ گیٹ پر رکھی تھی۔ جسے دیکھ کر ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔ یکا یک آس پاس کے کتے پلیٹ پر ٹوٹ پڑے۔ جیسے ہی انھوں نے بریانی کو ٹٹولا تو ایک غیر معلوم اور نامانوس سی بو ان کے نتھوں میں سما گئی اور بریانی میں ملائی گئی انسانی گوشت کی مخصوص بوٹیوں کو حیرت و تجسس سے گھورا۔ پھر اپنی نگاہ آسمان پر مرکوز کر دی اور اتنی زور سے بھونکا کہ زمین کانپ اٹھی اور عظیم صاحب لرزنے لگے اور ان کی پتھرائی آنکھوں میں رات کے ہولناک سایہ کے ساتھ ہتھیار کی ماند پڑتی چمک ناچنے لگی اور کانوں میں بریانی کی پارٹی میں جنم لینے والے ''معظم انسانی جملے'' گونجنے لگے۔

لذیذ بریانی۔۔۔

پاکٹ والا گوشت۔۔۔

برازیل سے آنے والی بیف ہُ ہُ

اور اخیر میں انسانی حلق سے اترنے والی مخصوص بوٹیوں کی بریانی، کتوں کے حلق میں آ کر اٹک گئی تھی۔

پر کٹے پرندے

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

کئی دنوں سے سردی کی لہر اس شدت کی آئی ہوئی ہے کہ شام ہوتے ہی زندگی تھم سی جاتی ہے۔ جن علاقوں میں برف نہیں پڑتی وہاں بھی سرِ شام برف کی نمی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے اُوس کی مہین بوندوں کے ساتھ برف کے ننھے ننھے ذرات پلکوں اور گالوں پر براجمان ہو رہے ہیں۔ گرم کپڑوں، گرم کھانوں اور گرم کمروں کے باوجود اُس وقت تک جسم کو چین نہیں ملتا جب تک آپ گٹھڑی بن کر اپنا وجود لحاف کے سپرد نہیں کر دیتے۔ کئی کئی گھنٹوں آپ اور لحاف میں تُو تُو مَیں مَیں کے بعد جسم اور لحاف کی ہم آہنگی سے سردی سے بچاؤ میں کسی قدر کامیابی ملتی ہے تو نیند کی دیوی نامہربان ہو جاتی ہے۔

اُس رات، ہاں اُس رات بھی اس شدت کی سردی میں لحاف اور ہماری تُو تُو، مَیں مَیں جاری تھی۔ قریب گیارہ بارہ کے درمیان فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے ہمارے کرم فرما اور نامور قلم کار بالی صاحب بول رہے تھے۔

''برادرِ عزیز آپ سے ایک کام آن پڑا ہے۔۔۔ میری بیٹی کے سسر، بھائی اور اُن کا بیٹا آپ کے شہر کے بڑے ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔۔۔ کشمیر گئے تھے اپنوں سے ملنے وہاں زلزلے کا شکار ہو گئے۔۔۔''

بالی صاحب نے جوں ہی گفتگو کے لیے سانس لیا ہم نے بولنا شروع کر دیا۔

''اس سے آگے کچھ نہ کہیے گا۔۔۔ میں اپنی ذمہ داری سمجھ گیا ہوں۔۔۔ بس آپ اُن کے نام بتلا دیجیے۔۔۔''

بالی صاحب سے بات ختم ہوئی تو ہم نے فوری طور پر ہسپتال فون کر کے بالی صاحب کے عزیزوں کی خیریت دریافت کی اور صبح حاضری کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

دوسری صبح ہم گھر سے چائے، پانی، کھانا اور موسمی پھل لے کر ہسپتال گئے تو بالی صاحب کے اعزاء کا کمرہ ڈھونڈنے میں قطعاً پریشانی نہیں ہوئی۔ کمرے کا ماحول قدرے سوگوار تھا۔ بیڈ پر ایک بزرگ کراہتے ہوئے لیٹے تھے اور بیڈ کے ساتھ والی بینچ پر ایک زخمی نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ تعارف کرانے پر نوجوان نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے بھی جواب میں بیڈ پر لیٹے ہوئے بزرگ سے پُرجوش مصافحہ کر کے اپنا تعارف کرایا، تکلیف کے باوجود انہوں نے مسکرا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے ٹفن کھول کر ناشتہ کی دعوت دی مگر کوشش کے باوجود دونوں باپ بیٹوں نے چائے کے علاوہ کچھ کھانے سے صاف انکار کر دیا۔ ہم نے نقاہت اور بیماری پر توجہ دلائی تو وہ ہماری بات کو سنی اَن سنی کر کے گویا ہوئے۔۔۔!

ہم لوگ گڑھی آزاد کشمیر کے رہنے والے ہیں۔۔۔ ہمارا خاندان بڑا اور کاروباری ہونے کے سبب خوشحال تھا۔۔۔ تقسیمِ ہند ہمارے لیے ایک سانحہ سے کم نہ تھی۔۔۔ چند دن تک تو مسلمان بزرگوں نے حصار بن کر ہماری حفاظت کی مگر جُوں جُوں دوسری طرف سے لٹے پٹے زندہ اور مردہ لوگ آتے گئے وُوں وُوں ہمارے علاقے میں اشتعال بڑھتا گیا اور ایک وقت ایسا آ گیا کہ ہمیں گنّوں کے کھیت میں چھپا دیا گیا اور ہمارے گھر کا ملازم خاص نذیر عرف جیرا ہر روز رات کے اندھیرے میں ہمارے لیے کھانا لے کر آتا۔ قریب سات دن یہ سلسلہ چلتا رہا مگر ایک رات چند انتہا پسندوں نے نذیر کا پیچھا کرتے ہوئے اُس سے ہمارا کھرا تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اُس نے جان دے دی پر ہماری بابت کچھ نہیں بتلایا۔ اُس کے بعد گاؤں کے مسلمان بزرگ بہت زیادہ تشویش میں مبتلا ہو گئے اور دوسری رات چار مشعل بردار مسلح نوجوانوں کی معیت میں مسلمان بزرگوں نے بھیگی آنکھوں سے ہمیں خدا حافظ کہا۔

ہم دو بھائی ہیں کشن اٹھارہ کا اور میں گگن انیس برس کا بہن کوئی نہیں تھی۔ گڑھی سے ہجرت کے بعد ہم لوگوں نے جموں کو اپنا مسکن بنایا اور چند دن کے سیاپے کے بعد روٹی روزگار میں لگ گئے۔ آہستہ آہستہ رب نے وہ سب کچھ بلکہ اُس سے زیادہ دے دیا جو ہم یہاں چھوڑ کر گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کے گھر ساتھ ساتھ تھے، دونوں بیاہے گئے تھے، دونوں صاحبِ اولاد تھے مگر روز شام کی روٹی بلا ناغہ ہم ساتھ کھاتے اور روٹی کھانے کے بعد رب کا شکر ادا کرنے کے ساتھ دونوں بھائی ایک عہد بھی کرتے۔

''جب بھی راستے کھلیں گے، دونوں بھائی ایک ساتھ اپنے وطن گڑھی، آزاد کشمیر کا طواف کرنے ضرور جائیں گے''

اوپر والے کی مہربانی سے دونوں حکومتوں نے کشمیر بارڈر جیسے ہی کھولا ہم بھائیوں نے بھاگم بھاگ پاسپورٹ بنوائے اور سری نگر، مظفر آباد بس میں سیٹیں بک کرا لیں۔ ہماری تیاری دیکھ کر سبھاش (سامنے بیٹھے بیٹے کی طرف اشارہ کر کے) بھی ضد کرنے لگا کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ جاؤں گا۔ سو ہم تینوں بروز بدھ وار چار اکتوبر کی صبح بس میں سوار ہو کر شام کو مظفر آباد اور رات کو گڑھی پہنچ گئے۔ ہمارے اپنے عزیز رشتے دار جو تقسیم کے وقت باڈر کراس نہیں کر سکے تھے انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ دوار کا ناتھ اکرم تھا، جگدیش کمار جمیل، دین دیال اسلام تھا تو یشونت مقصود۔ اس کے باوجود ہمارے درمیان کسی قسم کی اجنبیت یا دوری قطعی نہ تھی۔ ہم ایک دوسرے سے گلے بھی ملے، ایک دوسرے کے آنسو بھی پونچھے، ایک دوسرے سے دکھ سکھ بھی کیا اور رات کا کھانا سب نے اُسی طرح ایک ساتھ کھایا جس طرح تقسیم سے قبل کھایا کرتے تھے۔ کھانے کے بعد رات گئے پرانی یادیں اور باتیں ہم لوگوں کو کبھی رُلاتی رہیں کبھی تڑپاتی رہیں۔

طے ہوا کہ جب تک ہمارا قیام گڑھی میں ہوگا تینوں وقت کا طعام سارے مرد ایک ساتھ کریں گے بھلے ہی کوئی کتنے فاصلے پر کیوں نہ رہتا ہو۔

رات دیر تک جاگنے کے باوجود ہم بھائیوں کو مارے خوشی کے نیند نہیں آئی۔ہم دونوں بھائی صبح ہی صبح گڑھی کی سیر کو نکل گئے۔گلیاں ، بوہے، باریاں، چوبارے خاموش صدائیں دے کر اپنی اُور بلا رہے تھے اور ہم پاگلوں کی طرح کبھی اِدھر کبھی اُدھر پَر کٹے پرندوں کی مانند ہوا میں اڑنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔کتنا وقت گزرا ہمیں احساس ہی نہ ہوا۔سامنے سے آتے ہوئے مقصود نے جب ہماری توجہ ناشتے کی طرف دلائی تو ہم نے پیٹ بھرا ہونے کا عذر پیش کر کے ناشتے کی نسبت گڑھی کی سیر کو ترجیح دینا چاہی مگر مقصود نے بھاجی (بڑے تایا زاد بھائی) کا ڈراوا دے کر ہمیں گھر کی طرف چلنے کو کہا۔

ناشتہ روایتی شب دیگ، کشمیری کلچے، سبز چائے، حریسہ، پائے، فرائی مچھلی، طرح طرح کی مٹھائی اور فروٹ پر مشتمل تھا جسے دیکھتے ہی طبیعت بوجھل ہو گئی مگر سب لوگوں کے اسرار اور بھاجی کے حکم پر ہر چیز تھوڑی تھوڑی چکھنا پڑی۔ناشتے کے بعد بھاجی نے جیب سے ایک لسٹ نکال کر سامنے رکھتے ہوئے سب لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اس میں آپ سب کے نام لکھے ہوئے ہیں اپنا اپنا دن اور وقت نوٹ کرادو تاکہ گگن اور کشن کی دعوت کا پروگرام طے پاسکے۔

لفظ دعوت پر ہم دونوں بھائیوں نے پُر زور احتجاج کرتے ہوئے بھاجی کو مخاطب کرکے کہا:

''ہم گھر والے ہیں اور اپنے گھر لوٹ کر آئے ہیں، ہمیں مہمان مت بنایئے، ہماری خواہش ہے کہ ہم سب گھروں میں، گھر والوں کی طرح بنا بتلائے جائیں اور گھر والوں کے ساتھ وہی دال ساگ کھائیں جو روز پکتا ہے، جو روز بٹتا ہے، جو روز اُگتا ہے۔اس طرح ہمارا برسوں کا وہ خواب پورا ہوگا جسے ہم ہر رات دیکھتے اور ہر صبح ایک دوسرے سے بیان کرتے آئے ہیں''

ہماری بات پر بھاجی متفکر انداز میں خشخشی داڑھی میں سوچتے ہوئے دو انگلیاں اس طرح پھیرنے لگے جیسے کسی خاص نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوں۔باقی لوگ ایک دوسرے سے پہلے میں پہلے میں کی بحث میں مصروف ہو گئے۔بھاجی نے ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں ہمارے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے یہ شرط عائد کی۔

''مجھے تمہاری بات سے کُلی اتفاق ہے۔میں خود تمہارے ساتھ ہر وقت رہوں گا۔بس ایک مہربانی یہ کرنی ہے کہ جس دن، جس وقت، جس گھر میں جانا ہے اُن کو اپنی پسند کی ایک ہانڈی ضرور بتلانی ہے اور جب دوسرے گھر میں جانا ہے تو اُس گھر کو دوسری ہانڈی بتلانی ہے۔''

ناشتے سے فراغت کے بعد سب لوگ خوش گپیوں میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گڑھی کی گلیوں اور بازاروں کی سیر کو نکلنے ہی والے تھے۔جوں ہی سہاش باہر نکلا۔۔۔میرا ایک پیر اندر اور ایک باہر تھا۔۔۔زور سے گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ سب کچھ ڈول گیا۔۔۔اُس کے بعد کیا ہوا مجھے ہسپتال میں آکر پتہ چلا۔۔۔پہلے پہل مقصود، اکرم اور اسلام، کشن کی بابت پتہ کرنے پر سب اچھا کی رپورٹ دیتے رہے۔۔۔میری اور سہاش کی تشویش پر کشن کے زخمی ہونے کی بات بڑھائی۔۔۔جب ہم لوگوں نے کھانے پینے اور دوائی لینے سے انکار کر دیا تو سر اور بازو پر پٹی بندھے بھاجی نے سب لوگوں کو کمرے سے باہر نکال کر ہم دونوں باپ بیٹوں کو افسردگی سے کشن اور جمیل کی گمشدگی کی اطلاع دی۔دوسرے ہی لمحے میرے موہنڈے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی کے انداز میں کہنے لگے:

''تم دل چھوٹا نہ کرو پورے پچاس بندے ملبہ ہٹانے اور اُن کو نکالنے پر لگے ہوئے ہیں۔رب نے چاہا تو وہ دونوں ہنستے کھیلتے برآمد ہو جائیں گے۔''

ہم نے گگن بھاجی اور سہاش کو گلے لگا کر دلاسہ دیتے ہوئے ایک ایک دو دو لقمے زہر مار کرنے کی کوشش کی جسے انہوں نے بے دلی سے قبول کر لیا۔چائے پینے کے بعد ہم نے گگن چاچا کے پیروں کو ہاتھ لگاتے ہوئے عرض کیا۔

''آپ میرے بزرگ ہیں، کیا میرا اتنا حق نہیں بنتا''

جواب میں گگن چاچا نے اُمڈتے آنسو ضبط کرتے ہوئے ہمیں گلے سے لگا کر کہا:

''کوئی غیر اس طرح کر سکتا ہے بھلا۔۔۔!''

پھر ہم نے سہاش کی طرف رُخ کر کے اُس کے موہنڈے پر ہاتھ رکھا اور اُن کی ضرورت کے بارے میں دریافت کیا۔پہلے تو کچھ دیر سہاش خاموش رہا پھر ہمارے توجہ دلانے پر آہستہ سے گویا ہوا:

''سب کچھ بندوبست تو ایمبیسی نے کر دیا ہے، یہ کپڑے جو میں نے پہنے ہوئے ہیں یہ بھی ایمبیسی کے ایک صاحب نے دیے ہیں۔ضرورت کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سیفٹی، برش، ٹوتھ پیسٹ کے لیے اُن سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے''

سہاش کی گفتگو ختم ہوتے ہی ہم نے کچھ دیر کی اجازت مانگی اور بازار سے انڈر گارمنٹس ،تولیہ، صابن، گرم کپڑے، جوتے ،چپل، برش ، پیسٹ، سیفٹی، قلم، کاغذ اور گھر سے کھانا لینے کے بعد پھر سے ہسپتال پہنچ گئے۔

صبح کی طرح اس بار بھی گگن چاچا نے کھانا کھانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب تک کشن نہیں مل جاتا میرے لیے کھانا پینا حرام ہے۔تب ہم نے اور سہاش نے اُن کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے منت کے انداز میں کہا:

''چاچا جی کھائیں گے نہیں تو جئیں گے کیسے، ڈاکٹر کہتے ہیں دوائی ہضم کرنے کے لیے کھانا پینا بہت ضروری ہے۔''

ہمارے اسرار پر چاچا جی نے چند لقمے بے دلی سے لے کر مزید کھانے سے انکار کر دیا۔اس کے بعد ہمارے بیٹے نے سہاش کو ضرورت کی چیزوں کا پیکٹ دیتے ہوئے مزید کسی چیز کا دریافت کیا تو آہستہ سے سہاش بولا:

''نہیں۔۔۔سب کچھ تو آ گیا ہے۔۔۔بس ایک چیز کی بڑی

پریشانی ہے۔۔۔گھر والوں سے بات نہیں ہو پارہی۔۔۔''

بیٹے نے فوری طور پر اپنے موبائل سے سم نکال کر سبھاش کے موبائل میں ڈال دی اور یہ کہہ کر سبھاش کا دل بڑا کر دیا کہ اس سم میں اتنے پیسے ہیں کہ آپ جی بھر کے گھر والوں سے بات کرلیں۔اس کے بعد ہر روز ہم ہسپتال جاتے اور بیٹا خاموشی سے سبھاش کے موبائل کا بیلنس دیکھ کر واپسی پر اس میں مزید بیلنس ڈلوا دیتا۔ یوں تو سبھاش بھائی جان، بھائی جان کہہ کر میرے ساتھ خاصا بے تکلف ہو گیا تھا مگر وقاص کے ساتھ عمر کا فاصلہ کم ہونے کے سبب سبھاش کی بے تکلفی زیادہ ہو گئی تھی وہ دونوں چائے، پانی اور دوائی کے لیے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پورے ہسپتال کے چکر لگایا کرتے۔

چوتھے دن جب ہم لوگ ہسپتال گئے اور ناشتے دان کھول کر کھانے پینے کی چیزیں نکالنے لگے تو سبھاش نے میرا ہاتھ پکڑ کے آہستگی سے باہر چلنے کا کہا۔ابھی ہم کمرے سے دس قدم آگے بھی نہ نکلے ہوں گے کہ سبھاش نے میرے کندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔ہسپتال کا عملہ اور آتے جاتے مریض جوان آدمی کو ہچکیوں سے روتا دیکھ کر دکھ کا اظہار کرنے لگے۔ بڑی مشکل سے سبھاش کو چُپ کرا کر رونے کا سبب پوچھا تو سبھاش کی ہچکیاں مزید تیز ہو گئیں۔

''بھائی جان۔۔۔ چاچا جی نہیں رہے۔۔۔ سارے مکان کھود مارے، سارا ملبہ ہٹا ڈالا۔۔۔کشن چاچا اور جمیل چاچا ملے نہ اُن کی ڈیڈ باڈی۔۔۔''

بڑی مشکل سے سبھاش کی یہ کہہ کر ڈھارس بندھائی اگر تم حوصلہ ہار دو گے تو چاچا جی کس طرح خود کو سنبھالیں گے۔مزید دو دن یہ خبر سبھاش کے رشتے دار، سبھاش اور میرے درمیان رہی مگر جب سبھاش کے پتا جی نے قطعی طور پر کھانا پینا چھوڑ دیا تو مجبوراً انہیں اُن کے چھوٹے بھائی کشن کی موت سے آگاہ کرنا پڑا۔ چوبیس گھنٹے رونے اور بین کرنے سے دونوں باپ بیٹوں کا، کافی حد تک کتھارسس ہو گیا۔ سبھاش نے بھی کچھ کھانا پینا شروع کر دیا اور گگن چاچا بھی زور دینے پر بُڑبڑاتے ہوئے:

''زندگی بھی کیا کُتّی شے ہے، ماں مرے، باپ مرے، بھائی مرے پیٹ کا بھانبڑ نہ مرے'' کہتے ہوئے چند لقمے زہر مار کر لیتے۔

پانچویں دن سبھاش میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لے آیا اور سورج کی روشنی میں بالکونی کی دیوار پر ٹیک لگا کر بولا

''بھائی جان کوئی ایسا طریقہ کیجیے کہ اگر چاچا جی کی ڈیڈ باڈی مل جائے تو اُن کا کریا کرم یہیں کر دیا جائے۔ پتا جی کے ساتھ چاچا کی ڈیڈ باڈی لے جانا میرے لیے بہت مشکل ہو جائے گا۔''

جواب میں سبھاش کا حوصلہ بندھاتے ہوئے ہم نے بتایا کہ ہمارے شہر میں ایک مندر ہے مگر کہاں ہے یہ پتہ نہیں۔ جب تک میں مندر کا پتہ چلا کر اُس کے پنڈت سے نہ مل لوں اُس وقت تک کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہے۔

واپسی پر اندازے کے مطابق وقاص کو گاڑی دے کر خود میں صدر بازار کے قریب اُتر گیا اور ہر آنے جانے والے کو السلام علیکم کہہ کر مندر کا پتہ پوچھتا پھر بھی سر سے پیر تک میرا جائزہ لینے کے بعد، کوئی لاعلمی کا اظہار کرتا، کوئی دائیں بائیں کا اشارہ کرکے آگے بڑھ جاتا۔ خاصی دیر بھٹکنے کے بعد مندر کا دروازہ نظر آیا تو اُس کے کنڈے میں بڑا سا تالہ مندر کے بند ہونے کی خبر دے رہا تھا۔ اب پنڈت جی کے گھر کا پتہ مسئلہ بن کر سامنے کھڑا تھا کہ ساتھ والے دکان دار نے ہماری پریشانی بھانپتے ہوئے دریافت کیا۔

''پنڈت جی سے ملنا ہے، پنڈت جی سے؟''

ہم نے منہ سے کوئی جواب دینے کے بجائے سر کی جنبش سے ہاں میں جواب دیا تو مذکورہ دکان دار نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''گوالوں کی منڈی دیکھی ہے'' اس بار ہمارے منہ سے لفظ ''جی'' آہستہ سے ادا ہوا۔ دکان دار پھر گویا ہوا ''بس وہاں کمہار محلّہ پتہ کرکے کسی بھی آدمی سے پوچھنا بتلا دے گا''

پریشانی کے عالم میں کسی قسم کی سواری لینا یاد نہ رہا۔ پیدل ہی ہم گوالوں کی منڈی کی جانب چل پڑے۔ یہ محلّہ برسوں سے ہمارا دیکھا بھالا تھا۔ لٰہذا کمہاروں کا محلّہ ڈھونڈنے میں دشواری نہ ہوئی۔ جب ہم نے ایک صاحب سے علیک سلیک کرکے پنڈت جی کا گھر پوچھنے کی کوشش کی تو فوراً اُس نے سوال داغ دیا۔

''خیریت! پنڈت جی سے کیا کام پڑ گیا؟''

ہم نے ''اوں، آں، ہے ایک کام'' کہہ کر جان چھڑائی اور اُس کے بتلائے ہوئے راستے پر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ اتفاق سے پنڈت جی کے گھر کی جو نشانی اُن صاحب نے بتلائی تھی وہ کافی نمایاں تھی لٰہذا ہم نے بلا جھجک دروازے پر لگی گھنٹی بجادی۔ دوسری بار ہم نے مزید طاقت کا استعمال کیا مگر جب تیسری بار پوری قوت سے گھنٹی دبانے کے بعد گھر کے اندر سے کوئی شخص برآمد ہوا نہ کوئی آواز آئی تو ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ وقت اس محلے میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ کا ہے۔ فوری طور پر ہم نے دروازے پر دھپ دھپ کی تین آوازیں ٹھوک دیں۔ ''کون ہے بھائی'' کی صدا میں پیلی دھوتی پیلی چادر اوڑھے پنڈت جی ہری اوم، ہری اوم کا جاپ کرتے برآمد ہوئے۔

''ہاں جی فرماؤ۔۔۔!''

کچھ دیر کے لیے ہمیں حالات، واقعات کا سلسلہ جوڑنے اور انہیں الفاظ کا جامہ پہنانے میں وقت لگا پھر ہم نے آہستہ آہستہ، ٹھہر ٹھہر کر پنڈت جی کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ کو تو پتہ ہے کہ پچھلے ہفتے کتنی زور کا زلزلہ آیا ہے۔''

پنڈت جی نے ''ہاں جی'' کے ساتھ سر ہلا کر ہماری بات کی تائید کی تو ہماری ڈھارس بندھ گئی اور ہم مزید اعتماد سے اپنا مدعا پنڈت جی سے بیان کرنے

لگے۔ساری گفتگو سننے کے بعد پنڈت جی نے رسان سے کہا:

''کر دیں گے ضرور کر دیں گے مگر اس کے لیے ہمیں ایمبیسی کی تحریری اجازت اور اُن کے ایک بندے کی موجودگی چاہیے ہوگی۔''

ایک دن، دو دن، تین دن انتظار کے باوجود کشن چاچا کی ڈیڈ باڈی نہیں ملی مگر ایک مسئلہ مزید ابھر کر سامنے آ گیا۔ بظاہر گگن چاچا کے زخم مندمل ہو چکے تھے مگر ریڑھ کی ہڈی کئی جگہ سے چٹخنے کے سبب ڈاکٹر سفر کی اجازت دینے میں لیت ولعل سے کام لے رہے تھے۔ایک دن ہم نے ڈاکٹر کے پاس جا کر اس لیت ولعل کی وجہ دریافت کی تو ڈاکٹر نے لفظ لیت ولعل پر احتجاج کیا۔ ہماری معذرت پر ڈاکٹر نے بتلایا کہ آپ کے مریض کے لیے ریڑھ کی ہڈی پر باندھنے کی بیلٹ کا آرڈر دیا ہوا ہے جیسے ہی وہ آ جائے گی مریض کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔

مزید دو روز بیلٹ نہ آئی اور گگن چاچا پر ہزیانی کیفیت طاری ہو گئی۔اُن کی گریہ زاری ہم سے برداشت نہ ہوئی تو ہم دوائیوں کے تھوک بازار میں ڈاکٹر کی بتلائی ہوئی بیلٹ ڈھونڈنے نکل گئے۔ جو کافی کوشش کے بعد اُس بازار میں ملنے کے بجائے ایک خاص دکان پر ملی جو اس طرح کے سامان کی خاص طور پر خرید و فروخت کے لیے مشہور تھی۔ اتفاق دیکھیے دوسرے دن جب ہم خوشی خوشی بیلٹ لے کر پہنچے تو گگن چاچا اور سہاش سامان باندھے جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ ہمارے ہاتھ میں بیلٹ دیکھ کر بولے:

''کل شام کو ہسپتال والوں نے بیلٹ باندھ دی ہے اور آج جانے کی اجازت بھی دے دی ہے۔ بس دلّی سے کاغذات بن کر آنے کی دیر ہے۔''

اگلے دن ہم گگن چاچا کی پسند کی سبزی فراش بین کی پھلی اور آلو کے ساتھ ارہر کی دال، پنیر کے پکوڑے اور چنے کی دال کا خشک حلوہ بنا کر تھرموس میں چائے لے کر ہسپتال کے لیے نکلے تو وقاص کی یاددہانی پر بازار کی جانب گاڑی موڑ کر موبائل میں بیلنس ڈلوایا اور گاڑی پھر سے ہسپتال کی جانب دوڑا دی۔

جیسے ہی ہم نے کمرے کا دروازہ کھولا تو مارے خوشی سے سہاش کی باچھیں کھِل گئیں۔باپ کے گھٹنے کو ہلاتے ہوئے خوشی سے بولا:

''پاپا، پاپا۔۔۔جاوید بھائی آ گئے''

گگن چاچا نے ہمیں دیکھتے ہی گلے ملنے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھا دیے۔ گگن چاچا کی چھاتی سے لگ کر ہمیں احساس ہوا کہ وہ رو رہے ہیں۔ایک دفعہ کو ہمارا دل دھک سے رہ گیا۔ہم نے رونے کی وجہ پوچھی تو چاچا جی بولے:

''پُتر۔۔۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔۔۔ ان میں وچھوڑے کا درد ہے۔۔۔ میں۔۔۔اور۔۔۔میرا سارا پریوار۔۔۔مل کر بھی تمہارا شکریہ ادا کریں ۔۔۔پھر بھی۔۔۔تمہارا قرض نہیں چُکا سکتے۔''

''چاچا جی۔۔۔ کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔۔۔ میں تو آپ کا۔۔۔ اپنا ہوں۔۔۔'' (پیروں کو ہاتھ لگاتے ہوئے)

اس کے بعد سہاش بھی میرے اور وقاص کے گلے لگ کر ہچکیوں سے روتا ہے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لے آتا ہے۔ایک بار پھر سے میرے کاندھے پر سر رکھ کے روتے ہوئے کہتا ہے:

''بھائی جان۔۔۔! ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا۔۔۔ کہ ہم۔۔۔ ملیں اور بچھڑ جائیں۔۔۔(زور سے بھینچتے ہوئے) بھائی جان۔۔۔! آپ نے ہم پر بہت مہربانی کی ہے۔۔۔ایک مہربانی اور کرنا۔۔۔کشن چاچا کو۔۔۔اکیلا نہ چھوڑنا۔۔۔دنیا میں بڑے بڑے چمتکار ہوئے ہیں۔۔۔شاید۔۔۔!

اس رات بھی دن بھر کی جان توڑ مشقت اور ہڈیوں میں جمنے والی سردی سے بچنے کے تمام حربے ناکام ہو رہے تھے۔۔۔ نہ گرم مشروب سے چین آتا تھا۔۔۔ نہ رضائی سے ہم آہنگی ہو رہی تھی۔۔۔ دل و دماغ میں یکسوئی پیدا کرنے کے لیے بک شلیف سے ارون دھتی رائے کا تازہ ناول'' The Ministry of Utmost Happiness''اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دی۔۔۔ چند صفحات جستہ جستہ پڑھنے اور سوچ کے دھارے پر بہنے کے ساتھ دماغ تھکنے لگا، پپوٹے بھاری ہونے لگے۔۔۔ ہم کب نیند کی آغوش میں چلے گئے، پتہ ہی نہ چلا۔

آنکھ اُس وقت کھُلی جب کسی غیر مرئی قوت نے جھٹکے سے ہمارا لحاف کھینچ کر پرے پھینک مارا۔

''کیسے عزیز ہو تم۔۔۔ گرم لحاف میں دُبک کر۔۔۔ چین کی نیند۔۔۔ سو رہے ہو۔۔۔ اور۔۔۔ میں۔۔۔ برسوں سے۔۔۔ تمہارے انتظار میں۔۔۔ گرم سرد تھپیڑے سہ کر۔۔۔ مٹی کا ڈھیر ہو گیا ہوں۔۔۔ جاگو میرے عزیز۔۔۔ جاگو۔۔۔ جن کے اپنے۔۔۔ گھر سے دُور۔۔۔ بہت دُور۔۔۔ زندگی اور موت سے برسرِ پیکار ہوں۔۔۔ اُن کے سنگے۔۔۔ چین کی نیند نہیں سویا کرتے۔۔۔!!!

یادرکھو

اگر تم مذہبی ہو تو یاد رکھو یہ (ایٹم) بم انسان کی طرف سے خدا کو چیلنج ہے، اس کو آسان لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے، ہمارے پاس ایسی طاقت ہے جو تمہاری پیدا کی ہوئی ہر شے کو تباہ کر سکتی ہے۔(اور) اگر آپ مذہبی نہیں ہو تو یوں دیکھو کہ ہماری دنیا کی عمر چار بلین اور چھ سو ملین سال ہے اور یہ ایک دوپہر کو ملیا میٹ ہو سکتی ہے۔

O

ارون دھتی رائے کے مضمون "تخیل کی موت" سے اقتباس

....

''اُردو میں بات''

شگفتہ نازلی

(لاہور)

پرچم کو تھامے ہاتھوں میں لہراتا آئے گا
اور ملّی نغمہ ہونٹوں پہ دہراتا جائے گا
کب تک زبانِ غیر میں کہتے رہیں گے آپ
اُردو میں بات کیجیے تو لطف آئے گا
احساس بھی تو ہو کسی پسماندہ رَہرو کا
یاں کون ہے جو گرتے ہوئے کو اٹھائے گا
ظلم و ستم کی ہو گی تو کوئی اَخیر بھی
دیوار جبر و قہر کی پھر کون ڈھائے گا
صورت کوئی تو ہو جو ہو راہِ نجات بھی
شاید جب اپنی فکروں سے فرار پائے گا
مسکاں کسی کے چہرے پہ لانا ثواب ہے
روتے ہوئے کو کون اَب آ کر ہنسائے گا
اس بے حسی کے دور سے کچھ بھی عجب نہیں
کس حال میں بیچارہ کوئی جگ سے جائے گا
گم کردہ راہ کب تلک یوں چلتا جائے گا
سود و زیاں کا فرق کون اُس کو بتائے گا
کوئی راہبر تو ہو، کہیں کوئی رَہنما تو ہو
کوئی تو ہو، اُسے جو سیدھی رہ رکھائے گا!

○

سیفی سرونجی

(بھارت)

مانا کہ وہ مجھے کبھی اپنا نہیں لگا
لیکن ہے یہ بھی سچ کہ پرایا نہیں لگا
میں نے کیا جو فیصلہ کر کے رہوں گا پار
دریا بھی پھر کبھی مجھے دریا نہیں لگا
آواز کس گلی میں تجھے اب لگاؤں میں
کھڑکی میں تیری کوئی بھی پردہ نہیں لگا
دیتا تھا اس پہ جان تو شکوہ گلہ فضول
دھوکا بھی اس کا پھر مجھے دھوکا نہیں لگا
ہر بات پر ہے ضد اسے، ہر بات پر جلن
دل کا اسی لیے مجھے اچھا نہیں لگا
دنیا تمام گھوم کے دیکھی تو ہے بہت
لیکن مجھے سرونج سے اچھا نہیں لگا

○

نوید سروش

(میرپورخاص)

یہ کون مست قلندر مری تلاش میں ہے
کہ رنگ و نور کا منظر مری تلاش میں ہے
مرے قدم کے نشانات ایسے پختہ تھے
جو قافلے کا تھا رہبر مری تلاش میں ہے
تلاشِ منزلِ مقصود میں نہیں کرتا
ہر ایک مرکز و محور مری تلاش میں ہے
کوئی بتائے مجھے اس کو کیا کہوں آخر
وہ مجھ میں رہ کر بھی اکثر مری تلاش میں ہے
مرے اشک کی قیمت کھلی ہے جس پر بھی
وہ آب جو، وہ سمندر مری تلاش میں ہے
تلاشِ رزق میں گھر سے نکل تو جاتا ہوں
مگر نصیب و مقدر مری تلاش میں ہے

○

وشال کھلر

(لدھیانہ)

جو جل رہی ہے جہاں میں کسی وبال کی لو
نہ یہ جواب کی لو ہے نہ یہ سوال کی لو

بدی بدی نہ کرو نیک نیک بندے ہیں!
بجھی نہیں جو جلی دل میں اک ملال کی لو

یہ چاند، دھوپ، ہوا، روشنی ملائم سی
یہ کس نے آنکھ میں بھر دی ترے جمال کی لو

تجھی سے واسطہ میرا تجھی سے دوری بھی
ترے جمال کی لو ہے مرے خیال کی لو

اُڑی اُڑی سی یہ رنگت رُکی رُکی سی لہر
بجھی بجھی سی نہ رکھنا کبھی اُبال کی لو

غزل غزل تو کہیں نظم نظم شیرینی
یہ کس نے رکھ دی مرے ہاتھ میں کمال کی لو

○

ابراہیم عدیل

(جھنگ)

پھر نظر آیا ستارا عشق کا
کھل گیا ہے استعارا عشق کا

کر رہا تھا میری پلکوں پر سفر
آبلہ پا تھا شرارا عشق کا

بن گیا سینہ میرا صحنِ حرم
جب صحیفہ یہ اتارا عشق کا

جمع آنسو کر رہا ہوں اس لیے
مجھ کو لکھنا ہے شمارا عشق کا

کیسے سمجھائیں بھلا دنیا تمہیں
کیا تعلق ہے ہمارا عشق کا

وصل کو توفیق ہی ہوتی نہیں
رنگ فرقت نے سنوارا عشق کا

جب بھی آتا ہے کبھی تیرا خیال
جلنے لگتا ہے کنارا عشق کا

حسن کی رعنائیوں کی خیر ہو
گھر ہوا برباد سارا عشق کا

پوچھتے کیا ہو فرشتوں سے عدیلؔ
ابنِ آدم ہے منارا عشق کا

○

احمد سراج فاروقی

(راجستھان)

گلاب چہرے بھی پتھر میں ڈھلتے جاتے ہیں
وہ دیکھو دھوپ کے ارمان نکلتے جاتے ہیں

پلٹ کے دیکھا جو ہم نے تو یہ کھلا ہم پر
سفر وہی ہے مسافر بدلتے جاتے ہیں

اسی لیے تو یہ نیندیں ہوئی ہیں میرے خلاف
کہ میری آنکھوں میں کیوں خواب پلتے جاتے ہیں

چڑھائے جاتا ہے جذبہ پہاڑ پر لیکن
قدم زمین کی جانب پھسلتے جاتے ہیں

کہیں تو ہوگی ملاقات بچھڑے لوگوں سے
اسی خیال اسی دھن میں چلتے جاتے ہیں

مزاج ٹھیک نہیں آندھیوں کے پھر بھی سراجؔ
چراغ ہیں کہ سرِ شام جلتے جاتے ہیں

○

رئیس صدیقی
(بھوپال)

مشکلوں کے بیچ ساری زندگی! کب ملی ہے اختیاری زندگی؟
چھوڑ کر دامن تمہارا کیا ملا؟ پھر رہی ہے ، ماری ماری زندگی!
پاس رشتوں کا نہ کچھ کردار کا ہو گئی ہے کاروباری زندگی
شاخِ گل پر، قطرۂ تیزاب سی دوستو، ہم نے گزاری زندگی
خواب آنکھوں میں سکونِ جاں کا تھا آج تک ہے بے قراری زندگی
اس سے بڑھ کر وقت کیا ہو گا بُرا؟ عیب ہے اب وضع داری زندگی!
رُخ پہ ہیں اخلاص کی آرائشیں ہو چکی ہے اشتہاری زندگی
کاٹ دی ہم نے کچھ ایسے رئیسؔ جیسے ہو کوئی اُدھاری زندگی

○

زیبا سعید
(کراچی)

یاد کے خار جو آنکھوں میں چھپا کرتے ہیں درد پیہم مرے سینے میں رہا کرتے ہیں
اب نہ ابھرے گا کوئی پیار کا جذبہ دل میں کتنے طوفاں ہیں جو سینے میں اٹھا کرتے ہیں
ہم نے اکثر تمہیں تنہائی میں سوچا ہے بہت جانے کیوں کہتے ہوئے تم سے ڈرا کرتے ہیں
جانے کب ہجر کی وادی میں اتر جائیں ہم یوں مسلسل اسی پیکر کو تکا کرتے ہیں
میرے آنگن میں بھی اترے گی دھنک رنگ فضا کچھ مناظر مری آنکھوں میں رہا کرتے ہیں
کچھ سروکار نہیں ہم کو جہاں والوں سے ہم فقط آپ کی ہی دُھن میں رہا کرتے ہیں
کتنی انجان ہے تُو اہلِ جہاں سے زیباؔ کیسے اپنوں میں ستم گار ملا کرتے ہیں

○

سبھاش گپتا شفیق
(ہوشیار پور)

پہلے ہمارے شہر کو امن و امان دے پھر اسکے بعد اور مسائل پہ دھیان دے
ایسا نہ ہو یہ اپنے نشیمن ہی چھوڑ دیں ان پنچھیوں کو اتنی نہ اونچی اڑان دے
جو لوگ چاہتے ہیں بھلائی عوام کی یارب اب انکے ہاتھوں میں ہندوستان دے
ہندوستاں کی صبح کی زینت اسی میں ہے مندر میں پوجا پاٹھ ہو ملاّ اذان دے
خاموش تماشائی اسے دیکھتا نہ رہ منظر جو دل فگار ہے اسکو زبان دے
سر چڑھ کے بولتا ہے کوئی علم اے شفیقؔ دل اپنے قاتلوں کے جوحق میں بیان دے

○

شریف شیوہ

(لاہور)

دیکھی عجیب بات تجھے دیکھنے کے بعد
موت ہو گئی حیات تجھے دیکھنے کے بعد

محشر کی آب وتاب کے قائل ہوئے ہیں لوگ
میری نظر کے ساتھ تجھے دیکھنے کے بعد

سورج تیرے جمال کا بینائی لے گیا
آنکھیں ہیں خالی ہاتھ تجھے دیکھنے کے بعد

تشنہ لبی، ہجوم الم، کربلا، یزید
یاد آئے سب فرات تجھے دیکھنے کے بعد

اللہ نے جہان کو دلہن بنا دیا
گہری نظر کے ساتھ تجھے دیکھنے کے بعد

دیکھا تجھے تو میری ادا ہو گئی نماز
دن میں ڈھلی ہے رات تجھے دیکھنے کے بعد

مت پوچھ دل پہ کیسی قیامت گزر گئی
کل مدّعی کے ساتھ تجھے دیکھنے کے بعد

بُت خانہ تیری دید سے دل کا حرم بنا
ٹوٹے ہیں سومنات تجھے دیکھنے کے بعد

نازاں تھا چاند حُسن پہ، سورج کو تھا غرور
دونوں نے کھائی مات تجھے دیکھنے کے بعد

جن کو تھا شیوہ شعلہ بیانی پہ اپنی ناز
نکلی نہ منہ سے بات تجھے دیکھنے کے بعد

○

ثاقب تبسم ثاقب

(گوجرانوالہ)

مری پلکوں پہ اک بارش دھری رہنے لگی ہے
تو شاخِ شوق میری اب ہری رہنے لگی ہے

الٰہی اب رواں کر میری آنکھوں سے غمِ دل
مچلتی آگ سی دل میں بھری رہنے لگی ہے

کہاں خوابِ تمنا ڈھونڈنے نکلیں زمیں پر
سڑک پر تو یہاں غارت گری رہنے لگی ہے

لگن جب سے لگی محبوب کی مجھ دل جلے کو
نگاہِ شوق میں ہر پل تری رہنے لگی ہے

مری بھی زندگی اب جانبِ منزل رواں ہے
کہ شاخِ زخم اب ثاقب ہری رہنے لگی ہے

○

اصغر شمیم

(کولکتہ)

پھول کے بدلے خار ملا ہے
کیسا یہ سنسار ملا ہے

کھل کر ان سے باتیں کی ہیں
لب کو جب اظہار ملا ہے

وہ تھے میرے ساتھ سفر میں
صحرا بھی گلزار ملا ہے

دہشت پر ساری خبریں ہیں
آج کا جب اخبار ملا ہے

جس کو نظریں ڈھونڈ رہی تھیں
کل وہ بچھڑا یار ملا ہے

نفرت کے بازار میں اصغرؔ
مجھکو سچا پیار ملا ہے

○

رحمٰن فارس

(لاہور)

صدائیں دیتے ہوئے اور خاک اڑاتے ہوئے
میں اپنے آپ سے گزرا ہوں تجھ تک آتے ہوئے

پھر اس کے بعد زمانے نے مجھ کو روند دیا
میں گر پڑا تھا کسی اور کو اٹھاتے ہوئے

کہانی ختم ہوئی اور ایسی ختم ہوئی
کہ لوگ رونے لگے تالیاں بجاتے ہوئے

پھر اس کے بعد عطا ہو گئی مجھے تاثیر
میں رو پڑا تھا کسی کو غزل سناتے ہوئے

خریدنا ہے تو دل کو خرید لے فوراً
کھلونے ٹوٹ بھی جاتے ہیں آزماتے ہوئے

تمہارا غم بھی کسی طفلِ شیر خوار سا ہے
کہ اونگھ جاتا ہوں میں خود اسے سلاتے ہوئے

اگر ملے بھی تو ملتا ہے راہ میں فارسؔ
کہیں سے آتے ہوئے یا کہیں کو جاتے ہوئے

○

خالد راہی

(کراچی)

روٹھی ہوئی اس سے زندگانی دیکھی نہیں جاتی
آنکھوں میں ٹھہری ہجر کی کہانی دیکھی نہیں جاتی

سہمی سی رہتی ہے آب و ہوا اب بھی شہروں کی
دشتِ کرب و بلا کی جیسی ویرانی دیکھی نہیں جاتی

پیوند لگے لباس میں کیوں ہنستے مسکراتے لوگ
زرق برق چہروں کی پشیمانی دیکھی نہیں جاتی

ہر ایک سے ملتا ہوں مسکراتے ہوئے
آنکھوں میں کسی کی طغیانی دیکھی نہیں جاتی

بس یونہی چل پڑتا ہوں ساتھ اسکے خالد
مجھ سے تنہائی کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی

○

دُرِانجم عارف

(لاہور)

حصارِ غم سے نکل کر چلے خوشی کے لیے
یہ ایک کوششِ پیہم تھی زندگی کے لیے

نہ جانے زندگی کیوں بھر گئی اندھیروں سے
چلے جو راہِ محبت پہ روشنی کے لیے

میں بار بار سہوں کس لیے عذابِ جنوں
بس ایک تجربہ کافی ہے زندگی کے لیے

متاعِ زیست لُٹاؤ تو اتنا سوچ رکھو
اصولِ خاص ہے یہ زیست کا سبھی کے لیے

نہ کوئی سوچ نہ پہچان اپنے ساتھ رہی
خودی کو وار دیا رمزِ بے خودی کے لیے

ہر ایک راہ سوئے دار لے چلی ہمکو
یہ زندگی بڑی مشکل ہے آدمی کے لیے

ہے شکوۂ غم حالات بے محل کتنا
کہ دردِ دل بھی ضروری ہے شاعری کے لیے

○

زہریلاانسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یو ایس اے)

قسط......۱۹

رسیور میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔اس کے پہلے کہ میں
کال کرنے والے سے کچھ کہتا یا کچھ پوچھتا دوسری جانب سے ایک طویل اور
وحشیانہ قہقہے کی آواز آئی اور فون بند ہوگیا۔سوچا کہ میں نے یہاں کا نمبر صرف
رانی پارو کو دیا تھا۔اگر یہ کال رمیشن لاج سے آتی تو فون کرنے والا بات کرنے
سے پہلے اپنا مکمل تعارف کراتا اور روپا کو راجکماری روپا کہتا،تمہاری روپا نہ کہتا۔تو
پھر یہ فون کس نے کیا ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا۔کہیں روپا کی ماتا نے یہ نمبر
دربار سنگھ کو یا بقول روپا کے اس کی بلیوں کو تو نہیں دیا؟ ہاں یہی ہوسکتا ہے۔دونوں
لڑکیوں نے روپا کے ردِعمل سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ روپا ہی اب تک مجھے ان
دونوں کی پہنچ سے دور رکھنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔انہوں نے روپا کی ماتا سے
فون نمبر لے کر مجھے اور روپا کو چڑانے کے لیے یہ شرارت کی ہوگی۔میری دلیل
معقول تھی جس کی وجہ سے میں مطمئن ہوگیا تھا۔اکرام جو اب تک میرے چہرے
کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا،نے پوچھا کس کا فون تھا؟ میں نے جواب دیا جس کسی کا
بھی تھا اس نے اپنا نام بتائے بنا فون بند کردیا ہے۔

اگلے دو دن میں نے اکرام سے پشتو کے چند الفاظ سیکھے اور پشتو
زبان کے چند فقرے رٹے اور ان چند لفظوں کے زور پر بنوں بی بی سے حسب
توفیق تبادلہ خیال کرنے کی کوشش میں گزارے۔میرے آدھی پشتو اور آدھی اردو
پر مشتمل فقروں پر نیلم اور اکرام ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتے۔بنوں بی بی نے
بھی میری کاوش کو سراہنا شروع کیا۔پہلے وہ بھی اردو میں بات کرنے سے کتراتی
تھیں۔میرے اردو اور پشتو کے مرکب کی وجہ سے انہوں نے پشتو اور اردو کا مربا بنا
کر بولنا شروع کردیا۔لیکن ہم دونوں کی گفتگو خیر خیریت سے آگے نہیں بڑھی۔
جانے سے پہلے بنوں بی بی نے میرے گلے میں ایک لاکٹ ڈال کر اکرام سے
کچھ کہا۔اکرام نے مجھے بتایا کہ یہ لاکٹ میری امی کو ایک بزرگ نے دیا تھا۔اس
لاکٹ میں ردِّبلا کے لیے ایک تعویذ ہے۔امی کہتی ہیں کہ اس کو ہر وقت پہنے رکھنا۔
اللہ نے چاہا تو تم پر آنے والی بلائیں دور دفع ہوں گی۔اس کے بعد انہوں نے
سوئی کی مدد سے مجھے لاکٹ کھول کر اس میں رکھا ہوا تعویذ بھی دکھایا۔ان کا شکریہ
ادا کرنے کے بعد میں نے تعویذ گلے میں ڈال دیا۔

شینا کو اپنا پتہ دے کر خط لکھنے کو کہا۔پھر میں نے اسے بتایا کہ اگر وہ
ہندوستان میں میرے پاس آئے تو میں اسے اپنے پالتو زندہ سانپ دکھاؤں گا۔
اس نے خط لکھنے کا وعدہ کیا اور اپنے والدین کو میرے پاس ہندوستان لانے کا بھی
وعدہ کیا۔اسی گپ شپ میں دو دن گزرنے میں دیر نہیں لگی۔تیسرے دن اکرام
اور میں ہوائی جہاز میں بیٹھے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے۔سفر کے دوران ہم ایک
دوسرے کے خاصے قریب آگئے۔ایک دوسرے سے شناسائی ہوجائے تو باتوں
سے باتیں نکلتی ہیں اور پھر باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہتا ہے۔اکیلی
جان لے کر افریقہ آنے کا سفر جتنا تکلیف دہ تھا اکرام کے ساتھ واپسی کا وہی سفر
اتنی آسانی سے گزر گیا۔

کلکتہ ائیر پورٹ پر ہم سہ پہر تین بجے اترے۔کسٹم اور امیگریشن سے
گزرنے میں ایک گھنٹہ لگا۔ائیر پورٹ پر لال کے ساتھ نیتو ہمیں لینے آئی تھی۔اس
نے پیلے پھولوں والا کرتا پاجامہ پہنا تھا اور اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔آج پہلی بار میں
نے اس کے دمکتے ہوئے چہرے پر نئے انداز سے نظر ڈالی تو مجھے اس پر اور زیادہ
پیار آنے لگا۔ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا اور کچھ
کہے بنا میں نے رمپا والی انگوٹھی اس کی ایک انگلی میں ڈال دی۔اس نے انگوٹھی کو
دیکھا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اسے اپنی انگلی میں گھمانے لگی۔جذبات کی وجہ سے
اس کے منہ سے شکریہ کے علاوہ کچھ اور نہیں نکل سکا۔میں نے نیتو کا تعارف اکرام
سے کراتے ہوئے کہا یہ میری نیتو ہے۔وہی نیتو جس کے بارے میں میں نے آپ
کو بتایا تھا۔میری نیتو،کے تعارف پر اس کے پیلے پھولوں والے لباس کے عکس کی
وجہ سے اس کے چہرے پر حیا کی دمکتی سرخی نے اسے اور خوبصورت کردیا تھا۔خلافِ
معمول نیتو نے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔پھر
میں نے اکرام کا تعارف نیتو سے کرایا۔دونوں نے سر ہلا کر ایک دوسرے کو ہیلو کہا۔
لال نے ہمارا سامان گاڑی میں رکھا اور ہم گھر کی جانب چل پڑے۔

باپو،لانی اور وکرم نے صدر دروازے پر ہمارا خیر مقدم کیا۔میں نے
لانی اور وکرم کے آگے کورنش بجالاتے ہوئے ایک بار پھر ان کا مجھے نیتو کا تحفہ دینے کا
شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نیتو کو اپنی جان سے
زیادہ عزیز رکھوں گا۔وکرم نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا مجھے یقین ہے کہ تم ایسا ہی
کروگے۔نیتو نے میری دی ہوئی انگوٹھی لانی کو تعریفی انداز میں دکھائی جسے لانی نے
اپنی پسند کی سند بھی دی۔اس کے بعد میں نے باپو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا جو کام
مجھ سے نہیں ہوسکا وہ آپ نے کر دکھایا۔انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھرتے
ہوئے کہا بزرگ اپنے بچوں کی آنکھوں کی زبان سمجھتے ہیں رے۔گھر والوں سے
اکرام کا تعارف کرانے کے بعد لال کو اکرام کا سامان ایک کمرے میں لے جانے کا
کہہ کر میں نے اکرام سے کہا،آپ نہا کر کچھ دیر تک کے لیے تازہ دم ہوجائیں۔
سفر کی تھکاوٹ دور ہوگی تو باقی باتیں کریں گے۔اکرام لال کے ساتھ چلا گیا تو لانی
نے کہا تم خود بھی نہا دھو کر تازہ دم ہوجاؤ۔لمبے سفر نے واقعی تھکا دیا تھا اس لیے میں
باپو کے ساتھ کمرے میں چلا آیا۔نہا کر باہر نکلا تو باپو صوفے پر بیٹھے ہلکے سے گنگنا
رہے تھے۔میں ان کے پاس جا کر بیٹھا اور انہیں اپنے افریقہ میں پیش آنے والے
واقعات بتانے لگا۔میں نے رمپا کا ذکر قصداً چھوڑ دیا۔انہوں نے حسب عادت

میری کسی بات پر حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔ پھر میں نے انہیں بتایا کہ اکرام اپنے گمشدہ بھائی کی تلاش کے سلسلے میں یہاں آیا ہے۔ باپو سے کالی اور گورے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا چونکہ میں اب باقاعدہ طور پر یہاں رہتا ہوں اس لیے ان دونوں کو میں اپنے ساتھ لایا ہوں اور سامنے والی الماری کے ایک بیگ میں دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کافی گھل مل گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کھانے کے بعد اپنے دونوں سانپوں سے باتیں کروں گا۔

لال نے آ کر کھانے کی اطلاع دی تو میں نے اس سے پوچھا کہ اکرام بابو کس کمرے میں ہے؟ اکرام بابو آپ کے ساتھ والے کمرے میں ہیں سرکار۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کے اشارے سے مجھے بتایا۔ جس کا مطلب شائد یہ تھا کہ اکرام ہمارے دائیں ہاتھ والے کمرے میں ہیں۔ میں اٹھ کر اکرام کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اس لیے کھٹکھٹایا تو انہوں نے دروازہ کھولا۔ میں نے پوچھا کچھ تھکاوٹ دور ہوئی یا نہیں؟ کہنے لگے نہانے کے بعد بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے کہا میرا کمرہ آپ کے ساتھ والا ہی ہے۔ اگر چاہیں تو وہاں آ جائیں۔ انہوں نے کہا چلو۔ وہ میرے کمرے میں آئے باپو کے پاس بیٹھ کر بولے آپ کا لڑکا ہمارے لیے تو رحمت کا فرشتہ تھا۔ باپو کہنے لگے اکرام میاں فرشتہ ہونا تو کجا انسان ہونا بھی بڑی بات ہے۔ اس سے پہلے کہ باتوں میں کھانے پینے کا خیال نہ رہتا میں نے انہیں کہا کھانا تیار ہے۔ آپ پہلے ہمارے ساتھ چل کر کھانا کھا لیں بعد میں باتیں کریں گے۔ ہم کھانے کی میز پر پہنچے تو وکرم، لانی اور نیتو وہاں پہلے بیٹھے تھے۔ ہم اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سب نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ وکرم اور لانی نے کہیں جانا تھا اس لیے وہ ہمیں کھاتا چھوڑ کر چلے گئے۔ کھانے کے بعد میں نے اکرام سے پوچھا کیا آپ کھانے کے بعد چائے پینا پسند کریں گے؟ وہ بولا کیوں نہیں۔ لال کو چائے لانے کا کہہ کر اکرام سے کہا ہمارے ہاں کی چائے آپ کی پشاوری چائے کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی ہاں آپ اس کو کاڑھا سمجھ کر پی لیں۔ اکرام ہنسنے لگے۔ باپو بولے میں اکرام میاں کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں تم چائے ہمارے کمرے میں بھجوا دینا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے آپ جائیں میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔ میں باپو کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ باپو مجھے نیتو کے ساتھ کچھ وقت دینا چاہتے تھے۔ میں جب سے کلکتہ واپس آیا تھا نیتو سے اکیلے میں بات کرنے کا ایک لمحہ بھی نہیں ملا تھا۔

باپو اور اکرام چلے گئے تو میں نے نیتو سے کہا چلو باہر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ کرسیوں پر بیٹھ کر میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا جو کام میں نہیں کر سکا باپو نے کر دکھایا ہے۔ نیتو بولی، دراصل مصر سے واپسی پر میں یہاں اکیلی بیٹھی تمہارے بارے میں سوچ ہی تھی کہ ایسے میں باپو میرے پاس آ کر بیٹھے اور کہنے لگے ''تم اداسی کی حالت میں تنہا بیٹھی کیا سوچ رہی ہو بیٹی؟'' میں نے انہیں صاف بتا دیا کہ رامو کے لیے اداس ہوں اور اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ باپو نے پوچھا، کیا تو اسے چاہتی ہے؟ میں نے کہا چاہتی کیا میں تو اسے پوجتی ہوں۔ پر نہ جانے وہ میرے بارے کیا سوچتا ہے؟ باپو بولے وہ بھی تجھے ویسے ہی چاہتا ہے جیسے تم اسے۔ میں نے اُن سے کہا پر رامو نے مجھے کبھی اپنے من میں جھانکنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ باپو بولے مجھے اس کے من کا حال معلوم ہے۔ وہ اپنے من کی بات، بہت کم زبان پر لاتا ہے۔ اس کا من اتنا گہرا ہے کہ ہمالیہ بھی اس میں ڈوب جائے۔ پھر باپو کہنے لگے اگر تُو کہے تو میں تمہارے ماتا پتا سے رامو کے لیے تمہیں مانگوں؟ میں نے جواب دیا، رامو کے سنگ جینے کے علاوہ مجھے اس سنسار میں اور کچھ نہیں چاہیے۔ پر مجھے ڈر ہے کہ اگر رامو نہ مانا تو؟ باپو بولے تو اس کی فکر مت کر مجھے اپنی بتا۔ میں نے انہیں کہا رامو تو میرے جیون کی سب سے بڑی مراد ہے۔ انہوں نے کہا، اچھا تو اب بے فکر ہو جا۔ میں کل تمہارے ماتا پتا سے بات کروں گا۔ دوسری صبح انہوں نے ممی اور پاپا سے بات کی۔ ممی کو میرے من کا حال معلوم تھا اس کے باوجود انہوں نے مجھ سے پوچھا اور میں نے ہاں کر دی۔ لیکن میں من میں ڈر رہی تھی کہ اگر تم نے انکار کر دیا تو؟ اس نے جان کر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر میری جانب دیکھا اور کہا پھر جب فون پر تمہارا جواب سنا تو خوشی کے مارے مجھ سے بات تک نہیں ہو رہی تھی۔ بھگوان نے مجھے تمہاری صورت میں وہ کچھ دیا ہے کہ جس کا میں نے کبھی تصور تک نہ کیا تھا۔ تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ میں تمہیں اپنانے سے انکار کر دوں گا؟ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے شکایتی لہجے میں جواب دیا۔ اس لیے کہ تم نے مجھے آج تک ایک بار بھی نہیں بتایا کہ میں تمہیں اچھی لگتی ہوں اور تم مجھے چاہتے ہو۔ اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے میں نے کہا میں ہر روز تمہیں اپنی آنکھوں سے پیغامِ محبت دیتا تھا اور تمہاری آنکھوں سے سنتا تھا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ زبان کو اقرار کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ نیتو مخمور لہجے میں بولی، مجھے یہ تو معلوم ہے پر تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ لڑکیاں پیغامِ محبت کانوں سے سننا پسند کرتی ہیں۔ میں نے بھی اسی مخمور لہجے میں جواب دیا، نیتو جی میں تمہیں ٹوٹ کر چاہتا ہوں اور میں تو تیری پجارن ہوں رے۔ نیتو نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ایک دوسرے سے محبت کا اقرار کرنے اور ایک دوسرے کا ہاتھ چومنے کے بعد ہم دونوں کا من جیسے ہلکا ہو گیا تھا۔

پھر وہ اچانک چہک کر بولی، اچھا اب تم مجھے اپنے سفر کے بارے میں بتاؤ۔ میں پچھلے دو ہفتوں سے تمہیں اپنے پیچھے پیچھے بھگائے پھرتی ہوں اور تم ہو کہ ایک بار بھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ میں نے کہا اس میں شکایت کا ابھی تک کوئی جواز نہیں تھا اگر تم نے کبھی شکایت کا جواز دیا تو ضرور کروں گا۔ پھر میں نے اسے رمپا کی اچانک موت کے بعد سارے واقعات بتانے کے بعد اسے روپا کے بارے میں بتایا۔ پھر اسے تلک رام اور اکرام اور اس کی کھوج کے بارے میں بھی بتایا۔ وہ حیرت سے سب کچھ سنتی رہی پھر بولی، لگتا ہے بھگوان نے تمہیں تلک رام اور شبنا کے لیے افریقہ بھجوایا تھا۔ میں نے کہا ہاں کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ اس کے بعد اسے پرکاش بھون والا واقعہ بھی سنایا تو وہ اور حیران رہ گئی۔ اس پر میں نے اسے کہا نہ جانے دیوتا مجھ سے کیا چاہتے ہیں اور مجھ سے یہ سب کچھ کیوں کروا رہے ہیں؟ وجہ جو بھی ہو لیکن ایک بات طے ہے کہ وہ تمہیں کچھ نہ کچھ دان کرنا

چاہتے ہیں۔اورتم مجھے ہرموڑ پراپنے ساتھ پاؤ گے۔اس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھتے ہوئے پیار میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا تو میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔اگرتم اب تک میرے ساتھ نہ ہوتیں تو شاید مجھ سے اکیلے میں یہ سفر طے بھی نہ ہو پاتا۔تھکن کے دوران تمہاری سوچ مجھے تازہ دم رکھتی ہے اوراداسی کے وقت شانت کرتی ہے۔اپنی ناک میرے کندھوں سے رگڑتے ہوئے کہنے لگی تمہارے منہ سے ایسی پیاری باتیں سننے کو تو میرے کان ہر وقت ترستے رہتے ہیں۔ان باتوں میں رات کافی نکلی تو ہم ایک دوسرے کا ہاتھ چوم کراپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

باپوسو چکے تھے اس لیے میں بھی سو گیا۔دوسرے روز تازہ دم ہوکر اٹھا۔نہا کر کپڑے بدل کر غسل خانے سے باہرآیا تو باپو نے کہارات کالی تمہارا پوچھ رہی تھی۔ میں نے اسی وقت الماری سے کالی اور گورے کو نکالا تو دونوں مجھ سے چمٹ گئے۔ان کو اپنے گلے میں ڈال کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بے خیالی میں کہادروازہ کھلا ہے اندرآجاؤ۔اندرآنے والا اکرام تھا میرے گلے میں سانپ دیکھ کروہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا تو میں نے کہاڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔یہ میرے پالتو سانپ ہیں۔وہ آہستہ سے اندرآیا تو میں نے دیکھا کہ گورے کا رُخ اس کی جانب تھا۔میں نے اسے اپنے تک محدود رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اکرام کے پاس جانے کے لیے بالکل کسی بچے جیسی ضد کرنے لگا تھا۔جیسے ماں باپ بچے کو جتنا کسی شے سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اتنا ہی ویسا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔میں نے گورے کی حرکت سے تنگ آ کر اکرام سے کہا،میرا یہ سانپ آپ کے پاس آنا چاہتا ہے۔اس نے کہا اگر یہ مجھے کاٹے گا نہیں تو پھر کوئی بات نہیں۔ میں نے آہستہ آہستہ گورے کو ڈھیل دے کر اکرام کے پاس جانے دیا۔میں دراصل جاتے ہوئے اس کا ردِّعمل بھی دیکھنا چاہتا تھا لیکن اب تک گورے کا ردِّعمل اکرام کی جانب دوستانہ تھا اس لیے میں نے اسے جانے دیا۔

گورے نے سب سے پہلے اپنا سرا اکرام کی گود میں رکھا، پھر آہستہ سے اپنا سر اٹھایا اوراس کے گال پر رکھ کر اپنی زبان سے جیسے اسے چومنے لگا۔ پھر اپنا سارا جسم اکرام سے لپٹا دیا۔اپنا جسم اس سے لپٹا رہنے کے بعد گورے نے اپنا سر میری جانب بڑھایا اور پھراس نے اپنا سر کالی کے سر کے پاس رکھا۔دونوں کے سر ملے پھر دونوں نے ایک دوسرے سے زبانیں ملائیں اور پھر کالی نے بھی گورے کی تقلید میں اپنا جسم اکرام کے گرد لپیٹ لیا۔ میں نے اکرام سے کہالیں جناب ہمارے دونوں سانپوں نے آپ کو اپنی دوستی کے لیے منتخب کیا ہے۔اکرام بڑی دلچسپی سے دونوں سانپوں کو اپنے گرد لپٹے دیکھ کر بولا میری شبینا کے لیے یہ دونوں سانپ بڑی دلچسپی کا سامان بنتے۔ میں نے کہا اب آپ کے پاس شبینا اور گھر والوں کو یہاں لانے کا ایک اور جواز پیدا ہو گیا ہے۔اکرام کہنے لگا خدا کرے بھائی جان انعام کے ملنے کی کوئی صورت نکل آئے تو میں یہاں آتا جاتا رہوں گا اور شبینا کو بھی اپنے ساتھ لاؤں گا۔ایسے میں مجھے یاد آیا کہ اکرام نے ابھی تک اپنے گھر والوں کو فون کر کے اپنے پہنچ کی اطلاع نہیں دی تھی۔میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ان کے افریقہ کے لیے ایک کال بک کروائی۔کال جلدی مل گئی۔دوسری جانب سے نیلم کی آواز آئی تو میں نے اپنی خیریت بتا کران کی خیریت پوچھنے کے بعد فون اکرام کو پکڑا دیا۔انہوں نے اپنی پہنچ کی اطلاع دی پھر شبینا سے بات کرنے کو کہا۔اکرام نے بیٹی کو سانپوں کے بارے میں بتایا اور فون رکھ دیا۔

سانپوں کو واپس الماری میں رکھنے لگا تو گورا اکرام سے جدا ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔میں نے اسے کہا تو فکر مت کر یہ ابھی کچھ دنوں تک یہیں ہیں۔ اتوار کا دن تھا اس لیے لال نے ناشتہ تیار ہونے کی اطلاع بھی کافی دیر سے دی تو ہم کھانے والے کمرے کو روانہ ہوئے۔آج ہم دونوں تازہ دم تھے۔سفر کی تھکان کے علاوہ رات نیتو کے ساتھ باتیں کر کے میرا جی کافی ہلکا ہو گیا تھا اور نیتو بھی آج حسبِ معمول چہک رہی تھی۔ابھی ہم ناشتہ ختم ہی نہیں کر پائے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی تو لال نے فون اٹھایا۔دوسری جانب سے کسی کی آواز سن کر مجھے فون پر بلایا۔ دوسری جانب ٹام کی آواز آئی تمہارا کیا حال ہے؟ میں نے کہا اچھا ہوں۔آپ سے کب ملاقات ہو رہی ہے؟ کہنے لگا میں کلکتہ میں ہوں۔کیا تم ہمیں آج کسی وقت کلکتہ کے ریسٹ ہاؤس میں ملنے آ سکتے ہو؟ میں نے کہا، بالکل۔لیکن میرے ساتھ ایک مہمان بھی افریقہ سے آیا ہے جو آپ سے ملنا چاہتا ہے کہنے لگے کوئی بات نہیں تم جسے چاہو اپنے ساتھ لاؤ۔اور ہاں اگر تمہارے باپو بھی یہاں ہوں تو انہیں بھی ساتھ لیتے آنا۔میں نے کہا، اچھا تو پھر ہم ایک دوگھنٹوں میں آپ کے پاس آ جائیں گے۔وہ بولے تم نے کلکتہ کا ریسٹ ہاؤس تو دیکھا ہوگا۔میں نے جواب دیا، میں نے تو نہیں دیکھا لیکن ہمیں ڈرائیور لے آئے گا شاید اس نے دیکھا ہوگا۔وہ بولے ٹھیک ہے تو پھر جب چاہے آ جاؤ میں یہاں پر تمہارا منتظر ہوں۔ریسٹ ہاؤس میں ہمارا کمرہ نمبر اٹھارہ ہے۔

فون رکھنے کے بعد میں نے وکرم اور لانی کو بتایا کہ پرنسپل کے بھائی ٹام سمتھ کا فون تھا جو ان دنوں انگلینڈ سے آیا ہوا ہے اور وہ یہاں ریسٹ ہاؤس میں ہمارا منتظر ہے۔وکرم نے کہا ریسٹ ہاؤس ہماری فیکٹری کے ساتھ والی عمارت ہے۔تمہیں وہاں جانے کے لیے ڈرائیور یا گاڑی لے جانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ تمہیں ریسٹ ہاؤس جانے کے لیے سڑک پر جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔فیکٹری کی دیوار اور ریسٹ ہاؤس کی پوربی دیوار مشترک ہے اور درمیان میں ہم نے دروازہ بھی نکالا ہوا ہے کیونکہ ہمارے کاروباری مہمان بھی اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتے ہیں۔میں نے کہا پھر تو دوگھنٹوں کے بجائے ہم دومنٹوں میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ناشتہ ختم کرنے کے بعد جب ہم ریسٹ ہاؤس جانے لگے تو نیتو بولی، میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔میں نے کہا تو پھر آ ؤ چلیں۔

میں، نیتو، باپو اور اکرام گھر سے نکلے تو سامنے پوربی دیوار پر ہمیں دروازہ نظر آیا۔ہم چاروں ٹہلتے ہوئے پچھلے دروازے سے ریسٹ ہاؤس کے باغیچے میں داخل ہوئے جس کے کچھ دور ریسٹ ہاؤس کی عمارت تھی۔عمارت میں

داخل ہوئے تو کمروں کے دروازوں پر لگے نمبروں کو پڑھتے ہوئے اٹھارہ نمبر کے کمرے کے دروازے پر میں نے دستک دی تو دروازہ جینا نے کھولا۔ مجھے غیر متوقع طور پر اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو مجھ سے چمٹ کے بے اختیار میرا منہ چومتے ہوئے بولی پیارے رامو، تمہین دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ دو سالوں میں تم کافی نکھر گئے ہو۔ بوسوں کے دوران اسے میرے ساتھ آنے والے لوگوں کے علاوہ نیتو کا خیال آیا۔ اس نے نیتو کے چہرے پر اس کی مجھے چومنے کی حرکت کو ناپسندیدگی سے دیکھا جانے والا لکھا ہوا پیغام پڑھا تو مجھے چھوڑ کر سیدھا اس کے پاس جا کر بولی مجھے غلط مت سمجھو رامو سے میرا تعلق صرف اور صرف ایک دوست کا ہے اور بس۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے جینا سے نیتو کا تعارف اپنی منگیتر کے طور پر کرایا تو وہ مسکرا کر کہنے لگی، اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا۔

مبارک ہو، تمہاری منگیتر واقعی خوبصورت ہے۔ پھر اس نے نیتو کو گلے لگاتے ہوئے کہا، میرا دوست خوش بخت ہے کہ اسے تمہاری جیسی اچھی اور حسین لڑکی نے پسند کیا ہے۔ نیتو نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تمہارے رامو کے خیر مقدم کے انداز نے مجھے چند لمحوں کے لیے واقعی ڈرا دیا تھا۔ جینا بولی معافی چاہتی ہوں۔ کافی عرصے بعد اسے غیر متوقع طور پر سامنے دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ پھر جنیا نے مجھ سے کالی کے بارے میں پوچھا تو میں نے جواب دیا فکر مت کرو وہ یہاں ہے۔ اسے بھی تم سے ملواؤں گا۔ ایسے میں اسے خیال آیا کہ میں نے باقی لوگوں سے اس کا ابھی تک تعارف نہیں کرایا تھا۔ وہ باپو کے پاس گئی تو انہوں نے جینا کا ماتھا چوما اور پھر میں نے اسے اکرام سے متعارف کرایا۔ سب سے متعارف ہونے کے بعد میں نے جینا سے مسکرا کر پوچھا کیا خیال ہے کمرے کے اندر چلیں یا ساری باتیں یہیں کھڑے کھڑے ختم کریں؟ جینا جھینپتے ہوئے بولی، معافی چاہتی ہوں۔ دراصل دو سال بعد تمہیں اچانک سامنے دیکھ کر میں جذباتی ہو کر سب کچھ بھول گئی تھی۔ اندر چلو، ڈیڈی تمہارے منتظر ہیں۔

کمرے میں ٹام نے بڑی گرم جوشی سے ہم سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا بھئی تم دو گھنٹے کے بجائے دو منٹ میں یہاں کیسے پہنچے؟ جب میں نے انہیں بتایا کہ ہم ساتھ والی عمارت میں رہتے ہیں تو وہ ہنس پڑا۔ کہنے لگا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم سے اتنے قریب ہوں تو رات کا کھانا بھی تمہارے ہاں آ کر کھاتا۔ میں نے جواب دیا، کوئی بات نہیں۔ آپ جب تک یہاں ہیں تینوں وقت کا کھانا آپ کو ہمارے ہاں سے پہنچ جائے گا۔ بس آپ ہمیں بتا دیں کہ آپ کس وقت کون سا کھانا پسند کرتے ہیں۔ ہم ناشتے کے وقت شام کا کھانا اور شام کے وقت دوپہر کا کھانا بھی آپ کو یہاں بھجوا سکتے ہیں۔ میری بات پر سب ہنس پڑے تو میں نے کہا، اور اگر آپ کسی خصوصی کھانے کے لیے کوئی فرمائش کریں گے تو ہمیں اور بھی خوشی ہو گی۔ وہ بولے بھئی یہ تو بڑا اچھا ہو گا۔ ہمیں گھر کا کھانا کھائے ہوئے بڑا عرصہ ہوا ہے۔ ٹام نے باپو سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، آپ سے اس بار مل کر ہمیں اور زیادہ خوشی ہوئی ہے شمان جی۔ ہماری بیگم تو آپ کی ذہانت اور فطانت کی قائل ہیں۔ میں نے پوچھا کیا مائیکل اور ڈانا آپ کے ساتھ نہیں؟ ٹام بولا مائیکل کے امتحانات کی وجہ سے ڈانا بھی نہیں آئی۔ وہ اچھے تو ہیں؟ میں نے پوچھا۔ ہاں ویسے وہ بالکل ٹھیک ہیں اور ہمارے لیے افریقہ سے کیا تحفہ لائے ہو؟ ٹام نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اکرام کی جانب انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا میں افریقہ سے آپ کے لیے یہ تحفہ لایا ہوں۔ میرے اس فقرے پر سب ہنس دیے۔

ٹام سے بھی میں نے نیتو کا تعارف اپنی منگیتر کے طور پر کرایا تو وہ چہک کر نیتو سے بولا، تم نے اپنے لیے اچھا لڑکا چنا ہے۔ میں نے کہا میں نے بھی تو اپنے لیے اچھی لڑکی چنی ہے۔ ٹام بولا، بے شک تمہاری جوڑی خوب جچے گی۔ بس ہمیں اپنی شادی کی دعوت دینا مت بھولنا۔ میں نے کہا، بالکل نہیں بھولوں گا۔ پھر میں نے ڈاکٹر اکرام کا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ مہربان میرے ساتھ خصوصی طور پر افریقہ سے آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ٹام بولا، بھئی مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری غیر معمولی شخصیت کا شہرہ دوسرے ممالک میں بھی پہنچ چکا ہے۔ اس پر تمام لوگ ہنسنے لگے تو میں نے کہا ان کو کسی سلسلے میں انگلینڈ میں آپ کی مدد درکار ہو گی۔ ٹام بولا، آپ فکر نہ کریں مجھ سے جتنا ہو سکا میں کروں گا۔ سرِ دست میں رامو سے کچھ مدد لینے کے لیے ہندوستان آیا ہوں۔ میں نے تجسس سے پوچھا، فرمایئے میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟ کہنے لگے بھئی آپ لوگ پہلے بیٹھ تو جائیں، پھر باتیں کرتے ہیں۔

ہم سب کمرے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ٹام بولا، اس بار میں کچھ لوگوں کی تلاش میں ہندوستان آیا ہوں اور جن کی تلاش میں آیا ہوں میرے پاس ان کی ایک تصویر ہے اور ایک نام ہے۔ ہمیں پہلے اس نام کے آدمی کو ڈھونڈنا ہو گا۔ اگر وہ آدمی ہمیں مل گیا تو اس تصویر کے بارے میں اس سے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں نے کہا، آپ پہلے مجھے نام بتائیں۔ انہوں نے پوچھا کیا تم پرکاش نام کے کسی آدمی سے واقف ہو؟ میں نے جواب دیا ہندوستان میں ہر دسویں آدمی کا نام پرکاش ہے۔ اتنی بڑی آبادی میں آپ کو اگر کروڑوں نہیں تو لاکھوں پرکاش ضرور مل جائیں گے۔ ٹام بولا، یہ پرکاش راجہ ہے۔ میں نے کہا اب کچھ بات بنتی نظر آ رہی ہے۔ آپ کے یہ راجہ پرکاش کس شہر میں ہیں؟ میں کانپور کے ایک راجہ پرکاش کو جانتا ہوں۔ وہ مجھے اور باپو سے مخاطب ہو کر بولے، بالکل! میں کانپور کے راجہ پرکاش کو کھوج رہا ہوں۔ میں نے کہا تو پھر یوں سمجھ لیں کہ آپ کی کھوج کا پھل آپ کو پہلے مرحلے میں مل گیا۔ نہ صرف یہ کہ میں انہیں جانتا ہوں بلکہ میں انہیں بابا کہتا ہوں۔ میں چند ہفتے پہلے کانپور میں ان کا مہمان تھا۔ ٹام پریشانی کے عالم میں بولا، تم کس سلسلے میں ان کے مہمان رہ چکے ہو اور تم انہیں کیسے جانتے ہو؟ میں نے زیادہ تفصیل میں جانے کی بجائے صرف اتنا کہا کہ انہیں سانپوں کے سلسلے میں میری کچھ مدد چاہیے تھی جس کے لیے وہ مجھے اپنے ہاں لے گئے تھے۔

ٹام نے پوچھا، کیا تم مجھے ان سے ملواسکتے ہو؟ میں نے پوچھا آپ ان سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟ ٹام بولا، ابھی تک مجھے معلوم نہیں، لیکن ان سے مل کر ہی مجھے اندازہ ہوگا کہ وہ میرے کسی کام آ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ میں نے کہا، کیوں نہیں! آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ ان سے کب ملنا چاہتے ہیں؟ وہ بولا جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔ میں نے کہا، میں ابھی انہیں فون کر کے پوچھ لیتا ہوں۔ ان سے اجازت لے کر ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے کانپور پرکاش بھون کے لیے ایک فون کال بک کروائی۔ جتنے تک کال نہیں ملی ہم سب ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ ایسے میں فون کی گھنٹی بجی اور آپریٹر نے کہا کانپور بات کریں۔ فون پر دوسری جانب سے دھرمیندر بات کر رہا تھا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو بڑا خوش ہو کر بولا، رامو بابو، مہاراج آپ کو ہرروج (روز) یاد کرتے ہیں۔ میں بھی انہیں یاد کرتا ہوں اسی لیے تو میں نے انہیں فون کیا ہے۔ اچھا ان سے میری بات کراؤ۔ دھرمیندر بولا، آپ ہولڈ کریں سرکار، میں ابھی مہاراج کو فون دیتا ہوں۔ کچھ دیر بعد دوسری جانب سے بابا کی آواز آئی، تم کیسے ہو رامو بیٹے۔ میں تو اچھا ہوں، آپ سنائیں آپ کیسے ہیں بابا؟ میں نے پوچھا تو دوسری جانب سے ان کی بے چین آواز آئی۔ تمہارے بنا اداس ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تم اس وقت کہاں ہو؟ میں نے جواب دیا، میں افریقہ سے واپس آ گیا ہوں اور اس وقت کلکتہ سے بول رہا ہوں۔ وہ بولے تو پھر کلکتہ میں کیا کر رہے ہو؟ یہاں میرے پاس آ جاؤ۔ میں نے کہا، میں نے اسی لیے فون کیا تھا کہ آپ کے پاس آنا چاہتا تھا۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے تمہیں فون کر کے مجھ سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں جب جی چاہے میرے پاس آ جاؤ، انہوں نے دوسری جانب سے کہا۔ دراصل میرے ساتھ کچھ مہمان ہیں جو آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ بولے، خود بھی آ جاؤ اور انہیں بھی ساتھ لیتے آؤ۔ میں نے کہا، اچھا بابا ہم کل آ رہے ہیں۔ لیکن اس بار جلدی واپس نہیں جانے دوں گا، بابا نے مجھے پیار سے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ نہیں اس بار کچھ روز آپ کے پاس رکوں گا۔ فون کا رسیور رکھا تو سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ ہم کل کانپور جا رہے ہیں۔

ٹام بولا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جس کام کو میں اتنا مشکل سمجھ رہا تھا تمہاری وجہ سے اتنی جلدی ہو جائے گا۔ میں نے جواب دیا یہ اتفاق ہے کہ میں چند ہفتے پہلے ان سے ملا ہوں۔ اگر آپ تین ہفتے پہلے مجھ سے راجہ پرکاش کے بارے پوچھتے تو میرا جواب بھی دوسروں سے مختلف نہ ہوتا اور میں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ چند ہفتے بیشتر میرا کانپور میں کوئی بھی جاننے والا نہیں تھا۔ اگر ارون کے ہاں نہ گیا ہوتا تو شاید میں بھی ٹام سے یہی کہتا کہ میں راجہ پرکاش کو نہیں جانتا تھا۔ ٹام نے کہا، میری خواہش ہے کہ باپو بھی ہمارے ساتھ کانپور چلیں۔ باپو نے انکار نہیں کیا۔ جینا نے نیتو کی جانب دیکھ کر کہا، میں چاہتی ہوں کہ تم بھی ہمارے ساتھ کانپور چلو۔ اس طرح مجھے کم از کم ہم سفر لڑکی کا ساتھ مل جائے گا۔ ورنہ اتنے مردوں میں مجھ سے بولنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ نیتو نے کہا، میں اپنے والدین سے پوچھ کر جواب دوں گی۔ میرا خیال ہے کہ انہیں مجھے تمہارے ساتھ بھیجنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ جینا بولی، اگر تم کہو تو میں تمہارے والدین سے اجازت طلب کر سکتی ہوں۔ نیتو نے جواب دیا، اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میرے والدین مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ جس انداز میں جینا مجھ سے ملی تھی وہ نیتو کے لیے لمحۂ فکر ضرور تھا۔ معلوم نہیں کہ نیتو نے ہمارے ساتھ کانپور جانے کا ارادہ میری وجہ سے کیا تھا یا میرے قریب رہ کر جینا پر نظر رکھنے کی وجہ سے کیا تھا۔ لیکن نیتو کے اس فیصلے سے مجھے خوشی ہوئی تھی۔

ٹام بولا، بھئی واہ۔ پہلا مرحلہ تو خوش اسلوبی سے اور غیر متوقع طور پر طے ہوا ہے۔ اگر دوسرا مرحلہ بھی یوں طے ہو جائے تو میرا اس بار ہندوستان آنا سپھل ہو جائے گا۔ میں نے کہا، اب آپ ہمیں وہ تصویر دکھائیں۔ ٹام نے اٹھ کر اپنے سوٹ کیس سے ایک تصویر نکال کر پہلے باپو کو دیتے ہوئے پوچھا، آپ یہ تصویر دیکھ کر مجھے بتائیں کہ آپ اس تصویر میں کسی کو پہچانتے ہیں؟ باپو نے تصویر دیکھی اور انکار میں گردن ہلا کر تصویر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ یہ ایک نوجوان جوڑے کی کالی اور سفید (Black and White) تصویر تھی۔ تصویر میں گھنگریالے بالوں والی ایک خوبصورت عورت نے ایک نومولود کپڑے میں لپٹے بچے کو اپنی گود میں اس طرح اٹھا رکھا تھا کہ اس بچے کا رخ کیمرے کی جانب تھا۔ عورت کا چہرا کافی بارعب تھا اور اس کا قد قریب کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان مرد کی نسبت چھوٹا تھا۔ نوجوان مرد سوٹ پہنے عورت کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا جس کے آگے ایک تین سالہ بچی کھڑی تھی۔ مرد کا قد لمبا تھا اور چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ غور سے مرد کا چہرہ دیکھا تو اس اتفاق پر حیران رہ گیا۔ وہ مجھے اکرام کے بھائی انعام کی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ اکرام کو تصویر دیتے ہوئے میں نے کہا، مجھے تو یہ آپ کے بھائی انعام کی تصویر معلوم پڑتی ہے۔

اکرام نے جلدی سے میرے ہاتھ سے تصویر جھپٹ کر دیکھی تو اس پٹھان کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو گیا۔ اس نے بڑے جذباتی انداز سے کہا، جی ہاں یہ تصویر انعام بھائی کی ہے۔ پھر اس نے ٹام سے کہا، اپنے اسی بھائی کو لندن میں ڈھونڈنے کے سلسلے میں مجھے آپ کی مدد چاہیے تھی اور میں رامو کے ساتھ ہندوستان بھی اسی آس پر آیا تھا کہ میں اپنے بھائی کی تلاش میں یہاں کے لوگوں سے مدد لوں۔ ہم دونوں کو ابھی تک اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ پچیس سال گزرنے کے باوجود اکرام کے لیے انعام کی کھوج اتنی آسان ہو جائے گی کہ ٹام لندن سے وہ تصویر اکرام کی موجودگی میں مجھے آ کر دکھائے گا۔ اگر میں افریقہ نہ گیا ہوتا اور ٹام مجھے یہ تصویر دکھاتا تو میں بھی باپو کی طرح انکار میں گردن ہلا دیتا اور ٹام بغیر کچھ حاصل کئے یہاں سے چلا جاتا۔ اکرام نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے ٹام سے پوچھا، کیا آپ میرے بھائی کو جانتے ہیں کیا آپ ان سے ملے ہیں، اب وہ کہاں ہے، کیسا ہے، اس کے گھر والے کیسے ہیں؟ اکرام نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی لیکن ٹام اور جینا ابھی تک اس اتفاق پر حیرت زدہ اور گنگ تھے۔

ٹام نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا،تم نے اس کا نام بھی ٹھیک بتایا ہے یہ آئی نیم (انعام) کی تصویر ہے لیکن میں اس سے کبھی نہیں ملا اور نہ ہی اس کو جانتا ہوں۔ پھر آپ کے پاس یہ تصویر کہاں سے آئی ہے اور آپ اس کا پتہ کیوں پوچھتے پھر رہے ہیں؟ اکرام کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اسے ٹام کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

اس کی یہ کیفیت شاید ٹام نے بھی محسوس کی اس لیے وہ کہنے لگا، یہ تصویر سترہ اٹھارہ سال پرانی ہے۔ اور میں بھی ان دونوں کو اسی ایک تصویر کے سہارے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پھر ٹام نے حیرت سے اکرام سے پوچھا، پہلے آپ مجھے بتائیں کہ آپ اپنے بھائی کو کس وجہ سے تلاش کر رہے ہیں؟ اکرام نے اپنے کی گمشدگی کی وہ داستان جو مجھے پہلے سنا چکا تھا سب کو سنائی۔ اکرام کی کہانی سن کر ٹام حیران ہو کر بولا میں اس اتفاق کو کیا نام دوں؟ ایک حادثہ کہوں یا مقدر کی شطرنج کا کھیل۔ لیکن آپ کی کہانی میں میرے تجسس کا کسی حد تک جواب موجود ہے۔ اکرام نے ٹام سے پوچھا۔ اگر آپ میرے بھائی سے کبھی نہیں ملے اور ان کو نہیں جانتے تو پھر آپ ان کو کس لیے کھوج رہے ہیں؟ ٹام نے ہنس کر کہا، میں اس سے اپنا ادھار وصول کرنے کے لیے نہیں کھوج رہا ہوں میں ان کو ایک دوست کی حیثیت سے کھوج رہا ہوں۔ اگر آپ انعام سے نہیں ملے تو اس کی کھوج ایک دوست کی حیثیت سے کیسے کر رہے ہیں؟ اکرام نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا تو ٹام بولا، میں نے کچھ غلط کہا ہے۔ مجھے کہنا چاہیے تھا کہ میں ان کو ایک دوستانہ تجسس کی وجہ سے کھوج رہا ہوں۔ اگر میری کھوج کا کبھی کچھ نتیجہ برآمد ہوا تو آپ کو ضرور آگاہ کروں گا۔ اس کے بعد اس نے اکرام سے کہا آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ انعام برطانیہ میں نہیں ہے۔ اگر وہ برطانیہ میں ہوتا تو میں اس کی تصویر ہندوستان میں لیے نہ پھرتا اور اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو اس خاندان پر لندن میں گزرے ہوئے حالات بتانا پسند کروں گا۔

ہم سب ہمہ تن گوش ہوئے تو ٹام نے کہنا شروع کیا، ہمارے ہاں کی یونیورسٹیوں میں طلباء کے لیے ہاسٹل موجود ہیں جو طلباء کی رہائش کے ساتھ کھانے کا بھی انتظام کرتے ہیں۔ ہندو چونکہ سبزیاں کھاتے ہیں، مسلمان حلال کھاتے ہیں، اور یہودی کوشر کھاتے ہیں، اس لیے ایسے طلباء ان یونیورسٹیوں کے ہاسٹل میں نہیں رہتے۔ وہ یونیورسٹیوں سے باہر کرائے کے کمروں میں رہ کر اپنی پسند کا اور اپنے مذہبی میلان کا کھانا خود تیار کرتے ہیں۔ طلباء کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہمارے ہاں یونیورسٹیوں کے آس پاس کے گھروں کے مالکان غیر ممالک سے آنے والے طلباء کو اپنے گھروں کے کمرے کرائے پر دیتے ہیں جہاں طلباء اپنا کھانا پکا کر کھاتے ہیں۔ مسز براؤن ایک ستر سالہ بیوہ بھی لندن یونیورسٹی کے پاس تین کمروں والے ایک دومنزلہ مکان میں اکیلی رہتی تھی۔ اس کا اپنا گزارا ایک کمرے میں ہو جاتا تھا اس لیے وہ دو کمرے باہر سے آنے والے طلباء کو کرائے پر دیتی تھی۔ یہ ہندوستان کے بٹوارے سے چند سال پہلے کی بات ہے جب پشاور سے انعام آفریدی نامی ایک نوجوان طالبعلم ہندوستان سے برطانوی پاسپورٹ پر FRCS کرنے کے لیے لندن آیا تو اس نے یونیورسٹی کے قریب مسز براؤن سے ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ چند ماہ بعد جب مسز براؤن کے ہاں دوسرا کمرہ خالی ہوا تو اس کمرے کو ارمہ نامی ایک لڑکی نے کرائے پر لیا۔ ارمہ بھی برطانوی پاسپورٹ پر ہندوستان سے MBBS کرنے کے بعد لندن میں FRCP کی غرض سے آئی تھی۔ دونوں کے کمرے گھر کی دوسری منزل پر ایک دوسرے کے ساتھ تھے جب کہ دونوں کو ایک باتھ روم استعمال کرنا پڑتا تھا جس کا ایک ایک دروازہ دونوں کمروں میں نکلتا تھا۔

میری معلومات کے مطابق پہلے تین ماہ اکرام اور ارمہ نے ایک دوسرے سے کبھی بات تک نہیں کی تھی۔ دونوں اپنے کام سے کام رکھتے تھے اور اپنی اپنی پڑھائی میں مگن رہتے تھے۔ ایک روز ارمہ بارش سے بھیگی ہوئی سیڑھیاں اترتے ہوئے پھسل کر گری اور درد کی شدت سے اپنے حواس کھو بیٹھی۔ یہ اتفاق تھا کہ اسی وقت انعام بھی اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ اس نے ارمہ کو گر کر بے ہوش ہوتے ہوئے دیکھا تو اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لایا کیونکہ بے ہوش ارمہ کے کمرے کو تالا پڑا ہوا تھا۔ انعام نے مسز براؤن کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اسی کے مشورے پر بے ہوش ارمہ کو اٹھا کر لندن ہسپتال لے گیا۔ گرنے سے ارمہ کے ٹخنے کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں تھیں۔ نتیجہ کے طور پر اس کے ٹخنے پر پلستر لگایا گیا۔ ارمہ کو ہسپتال میں ہوش آیا اور ڈاکٹروں نے اسے دو ماہ تک اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے سے منع کیا۔ انعام نے ایک مہینہ ارمہ کی تیمارداری میں گزارا۔ وہ ہر صبح خود کالج جانے سے پہلے ارمہ کو سہارا دے کر پہلے سیڑھیوں سے اتارتا پھر گیراج میں رکھی ہوئی پہیوں والی کرسی پر بٹھا کر کالج لے جاتا۔ واپسی پر اسے کالج سے ساتھ لاتا اسے سہارا دے کر سیڑھیاں چڑھاتا اور پہیوں والی کرسی کو گراج میں رکھتا۔ گھر میں وہ اس کے لیے کھانا پکاتا، اس کے لیے بازار سے سودا سلف لاتا، اس کے کپڑے دھونے کے لیے لے جاتا اور اس کے آرام کا خیال رکھتا۔ یہ تیمارداری انہیں دوست کی حیثیت سے ایک دوسرے سے قریب لائی۔ ان کا آپس میں پریم شروع ہونے کا بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔

حادثے کے ایک ماہ بعد ایک رات بارہ بجے کے وقت غسل خانے سے دھڑام کی آواز نے اپنے کمرے میں بیٹھ کر پڑھتے ہوئے انعام کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ اس نے غسل خانے کے دروازے پر جا کر پوچھا کہ ارمہ ٹھیک تو ہے۔ اندر سے ارمہ کے جواب کے بجائے کراہ سنائی دی۔ انعام نے غسل خانے میں گھس کر دیکھا کہ ارمہ نہاتے وقت اپنی چلنے والی لاٹھی سے پھسل کر باتھ روم ٹب میں پڑی کراہ رہی تھی۔ اس نے ارمہ کو برہنہ حالت میں دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بند آنکھوں سے اس کو سہارا دے کر اٹھایا اور راستہ ٹٹولتا ہوا اس کے بستر پر لے گیا۔ پہلے اس کے گرد چادر لپیٹی پھر غسل خانے میں واپس جا کر اس کے لٹکے ہوئے کپڑے اٹھا کر آنکھیں بند کیے واپس آیا اور کپڑے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا تم اپنا خیال ٹھیک سے نہیں رکھتی ہو۔ تمہیں کتنی بار بولا تھا

کہ جب بھی کچھ کرنا ہوتو مجھے بلا لیا کرو۔ ارمہ نے کہا، پگلے نہانے کے لیے میں تمہیں کیسے بلاتی؟ انعام بولا، اگر بلا لیتی تو میں تمہیں کھا نہ جاتا اور تمہیں زیادہ چوٹ بھی نہ آتی۔ بولو، کیا اب تمہیں کھا گیا ہوں؟ میں آنکھیں بند کر کے بھی تمہارا خیال رکھ سکتا ہوں۔ انعام یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن اس کے یہ الفاظ گویا ارمہ کی روح میں اتر گئے۔ وہ کپڑے پہن کر اپنی لاٹھی کے سہارے ہولے ہولے چلتی ہوئی انعام کے کمرے میں آئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی سبز آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، کسی بھی لڑکی کو اس جیون میں ایک خیال رکھنے والے لڑکے کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے اور میں جانتی ہوں کہ مجھے اپنے لیے لاکھ ڈھونڈے سے بھی تیرے جیسا آنکھیں بند کر کے خیال رکھنے والا لڑکا نہیں ملے گا۔ کیا تم تمام جیون میرا ایسے ہی خیال رکھ سکتے ہو؟ اور پھر پٹھان بھی پگھل گیا۔

یہ تقسیم ہند کے دوران کا واقعہ ہے۔ ایک طرف ہندوستان ہندو مسلم فساد کی زد میں تھا۔ دوسری جانب ایک ہندو اور مسلمان کی محبت کی ابتدا ہو رہی تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ناطے دونوں کو معلوم تھا کہ ان کا مذہب اور ان کا خاندان ان کی راہ میں کئی رکاوٹیں کھڑی کرے گا۔ اس سفر کو شروع کرنے سے پہلے انہوں نے ایک دوسرے کو کئی سوالات کے جواب دئے تھے کہ وہ ایک دوسرے کا ساتھ کس حد تک نبھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ کیا وہ دونوں اپنے اپنے مذہب کی جانب سے اٹھائے ہوئے طوفان کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں؟ کیا ان میں اپنی خاندانی روایات کا مقابلہ کرنے کی سکت ہے؟ کئی ماہ انہوں نے ایک دوسرے کو یہ یقین دلاتے ہوئے گزارے کہ وہ واقعی ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنا جیون گزارنے کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ اس واقعے کے چھ ماہ بعد دونوں نے شادی کر لی۔ لیکن دونوں نے اپنی شادی کو اپنے خاندان والوں سے تقریباً تین سال تک چھپائے رکھا۔ ارمہ نے اپنی شادی کی خبر صرف اپنی ایک عزیز سہیلی پارو کو ہندوستان میں لکھ بھیجی تھی۔ ارمہ کے بقول اس کی قریب ترین سہیلی تھی۔ وہ پارو کو اپنے ہر راز سے آگاہ کرتی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد ان کے ہاں ایک بچی ہوئی تو ہندوستان بٹا اور پاکستان ایک آزاد ملک بن گیا۔ بچی کی پیدائش کے ڈھائی سال بعد ان کا ایک لڑکا ہوا۔ انہیں دنوں انعام کو FRCS کی ڈگری کے ساتھ یونیورسٹی میں لیکچرار کی نوکری بھی مل گئی۔ پھر ارمہ کو FRCP کی ڈگری مل گئی اور اس نے ایک مقامی ہسپتال میں پریکٹس شروع کر دی۔ دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد دونوں نے ایک دوسرے سے مشورہ کر کے اپنے اپنے گھر والوں کو اپنی شادی کے بارے میں بتانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر والدین مان گئے تو ٹھیک ورنہ وہ اپنی باقی زندگی لندن میں گزاریں گے۔

ٹام نے اکرام سے مخاطب ہو کر کہا تمہاری کہانی سننے سے پہلے مجھے انعام کے خاندان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کا اس رشتے پر کیا ردِعمل ہوا تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ارمہ کے والد نے لڑکے کو قبول کرتے ہوئے انہیں ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی۔ ارمہ نے پہلے خود جانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہاں کے حالات دیکھ کر انعام کو بلوائے۔ جانے سے کچھ روز پہلے ان کی بچی بیمار ہو گئی تھی جس کی وجہ سے بچی کو باپ کے پاس چھوڑ کر ارمہ اپنے چھ ماہ کے بیٹے کو لے کر ہندوستان گئی تھی۔ طے پایا کہ باپ بیٹی بعد میں ارمہ کے بلاوے پر جائیں گے۔ جانے کے ایک ہفتے بعد ارمہ نے ہندوستان سے تار دے کر انعام کو بلوایا۔ تار میں لکھا تھا، بیٹا سخت بیمار ہے جلدی پہنچو۔ جب یہ تار انعام کو ملا تو اس کی لڑکی ابھی تک بیمار تھی۔ انعام نے اپنی بیمار بیٹی کو ساتھ لے جانے کی بجائے چند دنوں کے لیے اپنے مکان کی مالکہ مسز براؤن کے حوالے کیا اور خود جلدی میں اپنی بیوی کے پاس ہندوستان چلا گیا۔ پھر اس کے بعد ان تینوں کی کوئی خبر نہیں آئی۔

اگر آپ انہیں نہیں ملے تو آپ کو یہ معلومات کہاں سے ملیں ہیں؟ اکرام نے ٹام سے سوال کیا۔ میں نے یہ ساری معلومات ارمہ کی ڈائری کے اندراج سے حاصل کیں ہیں۔ کسی نامعلوم وجہ سے وہ اپنی ڈائری اپنے ساتھ ہندوستان نہیں لے گئی تھی، ٹام نے جواب دیا۔ کیا آپ لندن میں میری بھتیجی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں کہ اس کا لندن میں کیا بنا؟ اکرام نے پوچھا تو ٹام نے جواب دیا، لڑکی کے والدین کی لندن واپسی سے مایوس ہو کر مسز براؤن نے وہ لڑکی لندن پولیس کے حوالے کی تھی۔ اکرام جلدی سے بولا، کیا آپ میری بھتیجی کی تلاش میں میری مدد کر سکتے ہیں؟ اگر میں کہوں کہ میں اس بچی کو جانتا ہوں تو آپ کیا کریں گے؟ ٹام نے معنی خیز مسکراہٹ سے اکرام کے سوال کا جواب دیا۔ میں اپنے بھائی کی نشانی کو اپنے سینے سے لگا کے رکھوں گا، اکرام نے جلدی سے جواب دیا۔ تو آپ اسے سینے سے لگانے کے لیے تیار ہو جایئے، ٹام بولا۔ اکرام نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تو ٹام نے جینا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، مسٹر اکرام آفریدی تمہارے قریب بیٹھی ہوئی میری یہ لے پالک بیٹی مسٹر انعام آفریدی کی بیٹی اور تمہاری بھتیجی جینا آفریدی ہے۔

''اللہ کا احسان''

پاکستان کا مستقل روشن و عالی شان رہے گا
خوشحالی و عزت ہوگی، اللہ کا احسان رہے گا
اللہ اور اقبالؔ و قائدؔ کے ہم ممنون رہیں گے
جب تک ہے یہ دنیا باقی، پاکستان رہے گا

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

''لَو آف گاڈ''

(ڈائری کے چند اوراق)

آپا جمیلہ شبنم
(اسلام آباد)

۱۱۔دسمبر

میری دیرینہ خواہش تھی کہ میں اپنے پیارے وطنِ عزیز کی سیر کروں اور اس کا آغاز آزاد کشمیر سے ہو۔

۸۔نومبر کو میں اپنے اکلوتے بیٹے عمران کی تقریب شادی سے بہ احسن طور سبکدوش ہوئی تو سب سے پہلے خالد اور روبی نے مجھے اپنے گھر آنے کی پُر زور دعوت دی۔میجر خالد نصر آج کل آزاد کشمیر کے ضلع ''باغ'' میں تعینات ہے۔

۱۱۔دسمبر کا دن کتنا مبارک اور پُر مسرت تھا کہ میں اپنے پیارے بھانجے خالد نصر کی ہمراہی میں عازمِ باغ ہوئی۔روانگی سے قبل آغا صاحب اپنے تفریحی ٹور سے واپسی پر کہنے لگے ''میں آیا تو آپ چل پڑیں'' میں نے کہا ''جی ہاں''۔

وہی راستے، وہی منزلیں، وہی کارواں، وہی ہم سفر
مگر اپنے اپنے مقام پر، کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

سب سے پہلے تو خالد کی گاڑی میں بیٹھتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ بھینی بھینی خوشبو نے تھکے تھکے دل و دماغ کو بڑا سکون اور سرور دیا۔مجھے نفیس مزاج لوگ بڑے پسند ہیں۔گاڑی میں ہر چیز بڑے قرینے و سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ مہدی حسن، غلام علی اور عابدہ پروین کی دلکش آواز ہم سفر رہی۔

خالد اور میری محبت پر ایک طویل عرصہ تک تلخیوں اور کدورتوں کا غبار چھایا رہا۔اس کی بے رخی سے میرا دل بہت دکھی تھا۔وہ میرا بھانجا ہی نہیں میرا محسن بھی ہے۔ان مقدس لمحات میں جو بارگاہ ایزدی میں سر بسجود ہو کر گزارتی پُر خلوص دعاؤں کے ہار منظوم کرتی رہتی۔

ربِّ کریم کو شائد میری بے چارگی پر ترس آیا اور خالد کے دل میں دبی ہوئی محبت و خلوص کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔باغ سے جب اُس کا فون آتا میری روح خوشی سے جھوم جاتی۔

ہاں تو ۱۱۔دسمبر دن کے تقریباً ۲ بجے اسلام آباد سے روانہ ہوئے۔ موسم میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔سورج بھی ہمارے ساتھ ساتھ اپنا سفر طے کرتا جا رہا تھا۔مری پہنچ کر خالد نے مرحبا ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی۔چائے مجھے بالکل پسند نہیں لیکن اس دن چائے کی گرما گرم پیالی نے بڑا سرور دیا۔خالد نے کافی پی۔۔۔مری سے گھر فون کر کے روبی کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔گھڑیال۔۔۔بھوربن۔۔۔ رواٹ۔۔۔دیول اور اوسیہ بڑی ہی دل پذیر جگہیں ہیں اور میری دیکھی بھالی ہیں۔ دھیر کوٹ بہت خوبصورت ہے۔شام کے سائے پھیلتے جا رہے تھے۔خالد کی گاڑی پہاڑی سلسلہ کے نشیب و فراز طے کرتی جا رہی تھی کہ چمن کوٹ سے ذرا آگے جا کر ٹائر پنکچر ہو گیا۔خالد نے فوراً ٹائر تبدیل کیا اور سفر پر رواں دواں ہو گئے۔گھر پہنچنے کو تقریباً ایک گھنٹہ درکار تھا کہ دوسرا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ڈر اور خوف سے دل سہم گیا۔جنگل بیابان پُر خطر راستے، گھپ اندھیری رات، یا اللہ اب کیا ہو گا۔ خالد نے بتایا کہ یہ لوگ چھ بجے شام تمام بازار وغیرہ بند کر دیتے ہیں۔وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ارجا پہنچے تو پنکچر لگانے والی اکلوتی دکان کے سینے پر بڑا سا تالہ لٹک رہا تھا۔جو مقدس کلام حفظ تھا اس کا ورد کرنے لگی۔خالد بڑی چابکدستی سے گاڑی کو سنبھالے منزل کی طرف رواں دواں ہو گیا کیونکہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔خدا خدا کر کے ساڑھے آٹھ بجے منزلِ مقصود پر جا پہنچے۔روبی اور ذیشان بڑی بے تابی سے ہمارے منتظر تھے۔خالد نے بتایا کہ ٹائر تو کٹ کٹا کر بالکل فنا ہو گیا لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ گاڑی کا مزید نقصان نہیں ہوا۔رات کھانے میں مچھلی، مرغ اور گاجر کا لذیذ حلوہ تھا۔خوب سیر ہو کر کھایا۔نمازِ عشاء ادا کی کہاں سترہ رکعتیں اور کہاں نمازِ کسر کے دو فرض اللہ سے ہم کلام ہو کر آرام سے سو گئی۔

۱۲۔دسمبر ۱۹۹۱ء

مؤذن کی پُر سوز آواز نے گہری نیند سے بیدار کیا اپنے کمرے سے باہر آئی تو بہت ہی پُر نور سماں دیکھا۔باغ کے چاروں طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔چیڑ، شمشاد اور صنوبر کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں۔خالد کے گھر کے بالکل سامنے ایک بلند و بالا پہاڑ ہے اس پر جا بجا مکانات ہیں جب روشنیاں جلتی ہیں تو ایسے لگتا ہے کہ آسمان کا ستاروں بھرا ٹکڑا پہاڑ پر آ گیا ہے۔پہاڑ کے دامن کے ساتھ ساتھ دریائے پونچھ ہے جو سوکھ کر اب ایک نالے کی شکل اختیار کر گیا ہے صبح کی خاموشی میں پانی کے بہنے کی آواز کانوں کو بڑی پیاری لگی۔

نمازِ فجر اور تسبیح و تحلیل سے فارغ ہو کر پھر صحن میں آ گئی۔آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔چڑیوں کی چہکار سے باغ کی پُر سکون وادی گونج اٹھی۔''دھمی کے کُکڑ'' کی بانگ سن کر سیاں چودھری کے گانے کے بول یاد آ گئے اور صبح کی تقدس بھری فضا دیکھ کر جوش مرحوم کا شعر نگاہوں کے سامنے مجسم ہو گیا:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ناشتے سے فارغ ہو کر خالد دفتر چلا گیا۔روبی، ذیشان اور میں باہر صحن میں آ کر بیٹھ گئے۔باتیں کرتے اخبار رسالے پڑھتے ڈیڑھ بج گیا۔خالد دفتر سے واپس آئے دوپہر کا کھانا بہت ہی پُر تکلف تھا۔روبی کے پاس میں او کاڑہ بھی رہ چکی ہوں۔خوب مزے مزے کی چیزیں بناتی ہے۔روبی کی یہ ادا مجھے بہت پسند ہے کہ ہر کام بہت سلیقے، قرینے اور جلد کرتی ہے۔نمازِ ظہر ادا کرتے ہی سو گئی اور تقریباً چار بجے آنکھ کھلی۔حالانکہ اپنے گھر صرف دس پندرہ منٹ گہری نیند سوتی ہوں۔نمازِ عصر سے فارغ ہوئی تو خالد نے کہا کہ آئیے آپ کو Dancing Girls of Lahore دکھاؤں یہ فلم بی بی سی والوں نے بنائی ہے۔ہیرا منڈی

جا کر کاروباری عورتوں کے انٹرویو لئے گئے۔ نین تارا، گڈی، سائرہ، طاہرہ یہ سب بازارِحسن کی حسین ترین لڑکیاں ہیں۔ بڑے پُر اعتماد لہجے میں بولتی رہیں اور اپنی مشکلات کا رونا روتی رہیں۔ طاہرہ نے کہا معاشرہ ہم سے نفرت کرتا ہے جبکہ ہم خود اپنے پیشے سے نفرت کرتی ہیں مگر اب اس گرداب سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کنجر ایسوسی ایشن کا چیئر مین بھی خوب بولا۔ شاہی مسجد کے خطیب کا خطبہ بھی سنا گیا۔ جو، زنا اور ناچ گانے کے متعلق تھا۔

پھر عمران کی شادی کی فلم دیکھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بڑی بابرکت اور پُر رونق شادی ہوئی۔ راجہ سکندر خان مرحوم کی بنجر زمینوں کو خدا نے چار چاند لگا دیئے اور میں نے اپنا چاند سا بیٹا بیاہ لیا۔۔۔ ورنہ یہ حسرت دل میں لئے ہی مرجاتی۔

آغا صاحب کنجروں کی اولاد کو کھلاتے پلاتے رہے اُن کے طرح طرح کے نازنخرے اٹھاتے رہے مگر جب اپنی بیٹی اور بیٹے کی ذمہ داری نبھانے کا وقت آیا تو ٹھن ٹھن گوپال۔ بظاہر سہاگن ہوں لیکن بیوہ عورتوں سے بدتر زندگی گزارتی ہوں۔ خاوند کی کمائی سے نہ روٹی، نہ کپڑا، نہ مکان، نہ کوئی جائیداد۔

اسلام تیری عظمت کو سلام۔ ربِّ جلیل اگر قانونِ وراثت نہ ہوتا، اگر میرا باپ سچا اور پکا مسلمان نہ ہوتا تو آج میرا اور میرے بچوں کا کیا حشر ہوتا۔

۱۳۔ دسمبر

ناشتے سے فارغ ہو کر غسل کیا۔ آج جمعتہ المبارک ہے۔ پشاور سے ثریا کا فون آیا۔ نصیر نے ثریا کا نام سی۔ این۔ این رکھا ہے۔ اس کے فون سے پورے خاندان کی خبر ہو جاتی ہے۔ ثریا نے بتایا آج عمران اور نورین کی لاہور سے واپسی ہے اللہ پاک بخیریت منزل پر پہنچائے۔ ثریا نے بتایا کہ ظہور احمد کی برسی ۲۰۔ دسمبر کو ہوگی۔ رہے نام اللہ کا۔

گزشتہ ۳۱۔ دسمبر کو ظہور کا ہنستا بستا گھر اُجڑ گیا۔ شہناز بیوہ ہوگئی۔ معصوم بچے یتیم ہو گئے۔ بوڑھا باپ بے سہارا ہو گیا۔ بہن کا مان ٹوٹ گیا۔ مبارز خان کا مضبوط بازو کٹ گیا۔ عمران کا ساتھی چھوٹ گیا۔ میری رخشندہ آرزوئیں، اُمیدیں اور تمنائیں موت کے سیلاب میں بہہ گئیں۔

کچھ لوگ جیتے جی تیرے جانے سے مرگئے

تمہیں جدا ہوئے ایک سال ہونے کو ہے مگر تمہاری محبت بھری باتیں اور یادیں اسی طرح تروتازہ ہیں۔ تمہارا خوبصورت وجود خاک میں مل کر خاک ہو گیا لیکن تمہارے خلوص کی مہک میرے اردگرد بکھری ہوئی ہے۔ میں بھی اُسی راستے کی مسافر ہوں لیکن نہ جانے میرا یہ دکھ بھرا سفر کب ختم ہوگا۔

ذیشان نے ایک قومی ترانہ سنایا۔ بڑی سریلی آواز میں گاتا ہے۔

تیری وادی وادی گھوموں۔ تیرا کونہ کونہ چوموں
میرے خوابوں کی تعبیر۔ میرے جموں اور کشمیر
بچہ ہی سہی میں لیکن۔ میرا عزم توانا ہے
مجھے بھارت سے کشمیر کو آزاد کرانا ہے
سب کھیل کود کو چھوڑو
کشمیری بچوں دوڑو
بولو نعرۂ تکبیر۔ میرے جموں اور کشمیر
ہم کشمیری بچوں کی اک فوج بنائیں گے
پھر سرینگر سے آگے ہم قدم بڑھائیں گے
ہم غازی کہلائیں گے۔ ہم غازی کہلائیں گے
ہاتھوں میں لیے شمشیر۔ میرے جموں اور کشمیر

۱۳۔ دسمبر

آج آنکھ دیر سے کھلی۔ نمازِ فجر قضا ادا کی۔ دراصل رات کافی دیر تک جاگتی رہی۔ صبح کے قریب آنکھ لگ گئی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اخبار کی سرخیاں دیکھیں۔ آج کل وینا حیات کیس سرِ فہرست ہے کچھ دیر ٹننگ کی۔ پنڈی فون کیا۔ علی سے بات ہوئی۔ عبداللہ کے لیے دل پریشان ہے اسے الرجی کی شکایت ہوگئی ہے۔ خدا جلد شفاء دے۔ فرح کا گھر شاد و آباد رہے (آمین)

آج زیادہ وقت وی سی آر دیکھنے میں گزرا۔ سب سے پہلے اشتیاق کی شادی کی فلم دیکھی۔ پھر ذوالفقار بھائی جان کا سفر آخرت اور اُن کے چہلم کی فلم دیکھی۔ نمازِ عصر سے فارغ ہو کر عمران خان کا چیئرٹی شو دیکھا۔ انڈیا سے ریکھا، ونود کھنہ، کبیر بیدی اور سونم آئے۔ ریکھا اور ونود کھنہ نے خوب رونق لگائی۔ دوگانا بھی گایا۔ عابدہ پروین نے ریکھا جی کی فرمائش پر یہ غزل سنائی:

جب سے تُو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے
سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے

عابدہ پروین کے گانے سوہنے یار دی گھڑولی پر ونود کھنہ، ریکھا، نیلی اور میاں داد نے خوب ٹھمکے لگائے۔ ملکہ ترنم نور جہاں نے پانچ نغمے سنائے اور خوب داد وصول کی۔ کہتی ہیں میں بہت دکھی ہوں تینوں بیٹیوں کو طلاق مل گئی ہے بظاہر تو ان کی چمک دمک دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ سدا بہار حسن سیر غم سے نا آشنا ہے۔

جاوید میاں داد کے دو بلے گیارہ لاکھ میں نیلام ہوئے۔

کمپئرنگ کے فرائض انور مقصود اور معین اختر نے بڑے خوبصورت انداز میں نبھائے۔ ہنستوں کو تو ہر کوئی رُلا سکتا ہے مگر روتوں کو ہنسانا بہت بڑی عبادت ہے۔ معین اختر نے خوب ہنسایا اور اس گانے پر بڑی داد ملی۔

ابھی تو میں جوان ہوں

یہ پیروڈی قیصر منصور نے لکھی۔ سننے سے تعلق رکھتی ہے۔

لاہور ثریا اور روحی سے بات ہوئی۔ اللہ کا شکر ہے سب خیریت سے ہیں۔ نورین سے بھی بات ہوئی ساجد کی منگنی ہوگئی۔ اللہ مبارک کرے۔ عمران دفتر سے نہیں لوٹا تھا اس لیے بات نہ ہو سکی۔ عمران۔۔۔ تیرا اللہ نگہبان۔

۱۴۔ دسمبر

رات کافی دیر کروٹیں بدلتی رہی۔ نیند بے وفا محبوب کی طرح آنکھوں

سے کوسوں دُور۔ ماضی کی کریدنا کیوں نے دل و دماغ کو گھیرے میں لے لیا نہ جانے کب نیند مجھ پر مہربان ہوئی اور میں سوگئی۔ اللہ کا شکر ہے نمازِ فجر بروقت ادا ہوئی۔

صبح کی سیر مجھے بہت پسند ہے۔ اسلام آباد کی شفاف سڑکوں پر علی الصبح سیر کو نکل جاتی تھی۔ میں نے تسبیح ہاتھ میں پکڑی اور پُر پیچ پگڈنڈیوں کو طے کرتی ہوئی دریائے پونچھ کے کنارے جا پہنچی۔ دریا میں پانی بہت کم تھا۔ میں ایک صاف شفاف پتھر پر بیٹھ گئی۔ پانی میں ہاتھ ڈالا تو وہ نیم گرم سا لگا۔ میں نے ازسرِ نو وضو کیا پھر چلو بھر بھر کے خوب پانی پیا۔ سنا ہے بہتے پانی میں بہت توانائی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر ہاتھ پاؤں ٹھنڈے رہے مگر جب چلنا شروع کیا تو گرم ہو گئے۔ مشرقی پہاڑ کی بلند و بالا چوٹیوں سے سورج کی کرنیں شفاف پانی پر پڑ رہی تھیں کرنوں اور پانی کے امتزاج سے دھنک کے رنگ بکھرتے جا رہے تھے۔ میں عالم محویت میں ڈوبی قدرت کے حسین نظارے دیکھ رہی تھی کہ ایک پیاری سی آواز نے چونکا دیا۔ "ماسی جی السلام علیکم" یہ کم سن اور تر و تازہ لڑکیاں سرخ چادریں اوڑھے ہاتھوں میں سلور کی گاگریں لئے دریا سے پانی لینے آئی تھیں یہ اُن کا روزمرہ کا معمول تھا۔ واپسی پر ایک کھیت میں خرگوش پھدکتے نظر آئے میرے قدم وہیں تھم گئے۔ میرے بھی ننھے ننھے تین خرگوش تھے۔ ایک پیارا سا خرگوش مجھ سے جیتے جی بچھڑ گیا۔ اب میرے دل میں اس کی یادوں کی تربت ہے۔ جب میں نے اُسے جنم دیا تھا تو سب سے پہلے اس کے رونے کی آواز میرے کانوں نے سُنی تھی۔ اب وہ کان اس کی آواز سننے کو ترستے ہیں اس کی پہلی مسکراہٹ بھی میری اِن اشکبار آنکھوں نے دیکھی تھی جو مرتے دم تک اس کے انتظار میں وا رہیں گی۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے ان حسین یادوں سے محروم نہیں کر سکتی۔

راستے میں ہی ایک وسیع و عریض صحن کے پاس سے گزری۔ ایک مرغی اپنے چوزوں کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ مجھے اپنا گھرانہ یاد آ گیا۔ ہم آٹھ بہن بھائی تھے۔ کتنے پیار و محبت سے رہتے تھے۔ سب سے پہلے سعیدہ آپا موت سے ہمکنار ہوئیں۔ پھر ابا جی نے اس بے مہر دنیا سے رختِ سفر باندھا۔ میری عظیم ماں نے تقریباً پچیس سال تک بیوگی کا کانٹوں بھرا راستہ طے کیا۔ میری ازدواجی زندگی کی ناکامی نے انہیں اندر سے خاکستر کر دیا تھا مگر انہوں نے مردانہ وار ہر دکھ کا مقابلہ کیا۔ میرے بچوں کو پروان چڑھایا۔ مجھے زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔ ان کی دعائے نیم شبی رنگ لائی میرا ٹوٹا ہوا رشتۂ ازدواج ازسرِ نو استوار ہوا تو میری ماں نے زندگی سے اپنا ناطہ توڑ دیا اور بڑے پُرسکون اور پُر وقار انداز سے موت کو گلے لگایا۔ رہے نام اللہ کا۔

مرغی کے بچے تو اپنی ماں کے ساتھ گھوم پھر رہے تھے مگر ہم سب بہن بھائی بکھر گئے۔ دراصل جب مرکز ٹوٹ جائے تو محبتیں اور رفاقتیں بھی سرد پڑ جاتی ہیں۔ سڑک پر ٹریفک شروع ہو چکی تھی۔ میں تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی گھر واپس آئی۔ خالد کا کمانڈر ملاحظہ کے لیے آیا ہوا تھا وہ فوجی وردی میں ملبوس دفتر جانے کو تیار تھا۔ ناشتہ کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں بیٹھ کر بھی کائنات کا حسن آنکھوں کے سامنے بکھرا نظر آتا ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت کی۔ "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل" اللہ ہی میرے لیے کافی ہے اور وہی میرا مددگار ہے۔ یہ میرا پسندیدہ وظیفہ ہے۔ اے ربِّ جلیل تُو نے میری ہر دعا سُنی اور میری مشکل آسان کی۔ سورہ نمل میں تیرا یہ ارشاد کتنا برحق ہے "کون ہے جو بے قرار اور دُکھی دل کی پکار سُنتا ہے جب وہ اُسے پکارتا ہے اور اس کی تکلیف رفع کرتا ہے۔"

آج آسمان پر گہرے بادل چھائے ہیں۔ میں اپنے بستر پر بیٹھی یہ سطور لکھ رہی ہوں۔ کمرے کا دروازہ کھُلا ہے۔ بلند و بالا پہاڑ میرے بالکل سامنے ایستادہ ہے۔ اس پہاڑ کے عقب میں راولا کوٹ ہے۔ فیملی میگزین میں طلب و جستجو کے سوال اور محرم راز کے جواب پڑھ رہی تھی۔ ایک سوال بہت پسند آیا۔ لکھا تھا "میں صوم و صلوٰۃ کی پابند ہوں اور قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ میں اپنے شوہر کی فرماں بردار، صالحہ اور مثالی بیوی بن جاؤں مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟" ایک بیٹی (مسز خان)

محرمِ راز ـــ۔ بیٹی آپ کی آرزو نہایت اچھی اور مثالی ہے۔ قدرت کا قانونِ آرزو یہ ہے کہ آرزو سچی ہو تو وہ پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن آرزو کے سچی ہونے کا معیار عمل ہے۔ یعنی کوشش مسلسل۔ آپ نے مثالی بیوی بننا ہے تو شوہر سے سچی اور شدید محبت کرو۔ یاد رکھو محبت تو اطاعت و خود سپردگی اور ایثار و قربانی چاہتی ہے اپنے شوہر کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرو۔ اس کے جذبات و احساسات نیز اُس کے ذوق کا خیال رکھو۔ اظہارِ محبت میں شرم نہیں محسوس کرنا چاہیے۔ اُس کے ذوق کے مطابق لباس پسند اور سنگھار کرو۔ اُن کو اپنا محرمِ راز سمجھو اور بناؤ۔ وقت پر کھانا کھلاؤ اور ان کی پسند کے کھانے پکاؤ۔ اُن کے ساتھ کھاؤ پیو اور سیر و تفریح کرو۔ اُن کے لباس اور دیگر چیزوں کو احتیاط سے رکھو۔ الغرض تسلیم و رضا کو اپنا شعار بناؤ۔ بندگانِ تسلیم و رضا ہی اللہ کے دوست ہیں جن کو اولیاء اللہ کہتے ہیں"

آج دوپہر کا کھانا بہت لذیذ تھا۔ عالمے کے ہاتھ کا بنا ہوا سرسوں کا ساگ، مکھن، مکئی کی روٹی اور ساتھ خالص پشاوری چپل کباب اور مزیدار مزیدار ٹھنڈی کھیر۔ خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ نماز ظہر ادا کر کے بستر میں لیٹ گئی۔ خالد کا کمانڈر ابھی تک یہیں ہے اس لیے وہ مصروف ہے۔

۱۵۔ دسمبر

رات تین بجے آنکھ کھُل گئی۔ نیند یک لخت آنکھوں سے دُور ہو گئی۔ جی کڑا کر کے اُٹھی۔ ٹھنڈے پانی سے وضو کیا اور نمازِ تہجد ادا کی۔ پھر قضا نمازیں پڑھیں۔ جائے نماز پر بیٹھی کافی دیر اپنے اللہ سے راز و نیاز کرتی رہی۔ اپنی کوتاہیوں پر آنسو بہاتی رہی۔ بخشش کی دعائیں مانگتی رہی۔ میرے دل میں اب ایک ہی آرزو سمائی ہوئی ہے کہ اللہ کے گھر کا دیدار کروں۔ روضۂ رسول پر حاضری دوں۔ غارِ حرا کے پتھروں کو چوموں۔

اقبال عظیم کی نعت کے صرف دو شعر یاد ہیں جو اپنی بے سُری آواز

میں گنگناتی رہتی ہوں:

ہم کو کیا مل گیا چاندنی سے
ہم کو کیا دے دیا روشنی نے
اپنے چاند اور سورج سنبھالو
ہم تو جاتے ہیں اپنے مدینے

دوپہر کا کھانا کھا کر مطالعہ میں مصروف تھی کہ خالد نے بڑے پیار بھرے لہجے میں آ کر کہا۔ بی بی خالہ آئیں آپ کو آزاد کشمیر کی سیر کراؤں۔ جلدی جلدی تیار ہو کر تقریباً تین بجے گھر سے نکل پڑے۔ ہماری پہلی منزل سُدھن گلی تھی۔ باغ سے تقریباً ایک گھنٹہ کی مسافت ہے۔ ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک 7500 فٹ کی بلندی تک جاتی ہے۔ پہاڑ کے دامن میں شمشاد کے بلند و بالا درختوں میں گھِرا ہوا ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس ہے۔

خزاں رسیدہ درختوں میں بھی قدرت کا ایک عجیب حُسن پایا جاتا ہے۔ درختوں کی ننگی شاخیں دیکھ کر ایسا لگتا جیسے انہوں نے دستِ دعا بلند کیے ہوئے ہیں۔ ہماری اگلی منزل ''چکار'' تھی۔ اسے آزاد کشمیر کا سوئٹزر لینڈ کہتے ہیں۔ خالد نے ایک مقامی ہوٹل پر گاڑی روکی اور ہم سب نے مکس چائے پی۔ جب ہم چکار پہنچے تو خالد نے مظفر آباد جانے کا پروگرام بنالیا۔ اُس نے ٹارگٹ ٹائم دیا کہ ہم انشاءاللہ چھ بجے شام مظفر آباد پہنچیں گے۔

چکار، کرول، وادی نیلم قابلِ دید جگہیں ہیں راستہ خوب صورت بھی ہے اور پُر خطر بھی ہے۔ سڑک کے ایک طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور دوسری طرف دریائے جہلم ہے۔ دومیل دریائے نیلم اور دریائے جہلم کا سنگم ہے۔ مظفر آباد کی سڑکیں بڑی کشادہ اور صاف ستھری ہیں۔ چھاؤنی کا Mess دیکھا۔ گھومتے پھرتے مغل فاسٹ فوڈ پر آ پہنچے۔ خالد نے چائنیز ڈنر کھلایا۔ گرم گرم چکن سوپ پی کر راستے کی ساری تھکن دور ہوگئی۔ ہم سب نے خوب پیٹ کر کھانا کھایا پھر قہوہ پیا۔ خالد نے پورے آٹھ بجے واپسی کا اعلان کر دیا۔

خالد بڑے ماہرانہ انداز میں پُر پیچ سڑک پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ موسیقی کا دور بھی چلتا رہا۔ اندھیرے میں کائنات کا حسن اور نکھر گیا۔ پہاڑوں کی گود میں آبادیاں ہیں۔ مکانوں کی روشنیاں دور سے بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے تمام پہاڑوں پر مقیش والے دوپٹے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ رات کے ساڑھے دس بجے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

۱۶۔دسمبر

دن بڑی سرعت سے گزرتے جا رہے ہیں۔ گھر سے نکلے آج پورے چھ دن ہو گئے ہیں۔ میری زندگی مردانہ، زنانہ فرائض کی چکی میں پستے پستے گزر گئی۔ آغا صاحب کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ ان پر گھر کی ذرہ بھر ذمہ داری نہیں۔ خدا خالد کا بھلا کرے جو مجھے اپنے ساتھ لے آیا اور میرا وقت سیر و تفریح میں گزر رہا ہے۔ جب میں گھر ہوتی ہوں تو مشتاق کا طور طریقہ بھی بدل جاتا ہے۔ وہ بھی ہر کام کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دیتا ہے۔

آج ذیشان کا نتیجہ نکلا۔ بڑے اچھے نمبر لے کر کلاس میں تھرڈ آیا ہے۔ آج دوپہر روحی نے چائنیز کھانا تیار کیا۔ اتنے سلیقے سے کام کرتی ہے کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ سویٹ اینڈ سار چوومن۔ میونیز اور گجریلا تھا۔ کھانے اور نماز سے فارغ ہو کر آرام سے آ کر بستر میں لیٹ گئی اور تھوڑی دیر کے لیے سوگئی۔

بریگیڈ ہیڈ کوارٹر بہت خوب صورت جگہ ہے۔ چند تصاویر اتروائیں پھر میس میں آ کر بیٹھ گئے۔ خالد نے چائے کا آرڈر دیا۔ میں چائے کی ذرہ بھر شوقین نہیں لیکن باغ آ کر چائے بڑے شوق سے پیتی ہوں۔

باغ میں ابھی تک کوئی خاص سردی نہیں۔ میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرتی ہوں اور صبح باقاعدگی سے سیر کرتی ہوں۔ چھتر سے واپس آئے تو آرمی کا ڈاکٹر اور اُن کی بیوی بچہ الوداعی ملاقات کو آئے اُن کا تبادلہ کالا باغ (مری) ہو گیا۔ ڈاکٹر کی مسز کی متو سے بہت مشابہت تھی۔ باتوں کا انداز بھی متو کی طرح تھا۔ اُن کا دو سال کا بچہ فراز دیکھ کر عبداللہ بہت یاد آیا۔ بہت پیارا اور دلچسپ بچہ ہے۔ آج فون پر عمران سے بات ہوئی۔ شکر ہے سب خیریت ہے۔

خالد ڈنر پر مدعو تھے۔ حنا فلم دیکھی۔ اس کی تھیم ''انسان دوستی'' ہے۔ انسان کی سب سے بڑی خباثت یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ کرتا نہیں۔

فون پر بے بی سے بھی بات ہوئی۔ فہد کی موت کی خبر سن کر بے بی نے مجھ سے فون پر اظہار افسوس نہ کیا۔ میں نے جب اس کی ماں کی موت کی خبر سنی تو میر پور جا کر تعزیت کی۔ پھر سعید کی استدعا پر بے بی کو ملنے ایئرپورٹ گئی حالانکہ عمران ایئرپورٹ جانے سے انکاری تھا۔ میرا عقیدہ ہے کہ بد خلق کو اخلاق کی مار دو تاکہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ مجھے علامہ اقبال کا یہ شعر بہت پسند ہے:

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ سلیمانی
اخوّت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

محبت انسانوں کو انسان کے قریب تر لاتی ہے، دلوں کو دلوں سے ملاتی ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کو شیر و شکر کرتی ہے۔ لہٰذا محبت کرنا سیکھئے صحنِ دل میں محبت کے اجالے پھیلائیے اور اپنی برائیوں کے اندھیرے کو دور کیجیے۔ برائیوں کی دلدل میں پھنسے رہنا انسانیت کی موت ہے۔ محبت انسانیت بھی ہے اور انسانیت نواز بھی۔ محبت کا پاکیزہ سرچشمہ انسان کا دل ہے۔ جہاں سے نیکیوں کے سوتے بے ساختہ پھوٹتے ہیں اور بنی نوعِ انسان کے ریاضِ زندگی کو سیراب کرتے ہیں۔ نیکی محبت کا پَرتوِ جمیل ہے۔ میں ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں جو اسلامی رنگ میں رنگا ہو اور جو اخوّت و محبت کی باہمی غمگساریوں، دلداریوں، رواداریوں اور جانثاریوں کے لازوال و متحرک جذبوں سے مالا مال ہو۔

۱۷۔دسمبر

مسلسل تین دن سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے۔ بارانِ رحمت کی اشد ضرورت ہے۔ بارانی علاقوں میں بارش کے بغیر گندم کی بوائی مشکل ہے۔

نمازِ فجر قضا ادا کر کے تلاوتِ کلامِ پاک کی۔ سورہ یٰسین بلا ناغہ پڑھتی ہوں یہ قرآن پاک کا دل ہے۔ اس سورت کی فضیلتیں تو بہت سی ہیں ایک یہ ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل ہر قسم کی آلائشوں اور کدورتوں سے پاک رہتا ہے۔ جس کا دل اُجلا اور صاف ہوگا وہ دین و دنیا میں خوش و خرم رہے گا۔ ناشتے سے فارغ ہوئی تو رومی نے بتایا کہ آج کرنل مظہر کی بیگم کو ملنے ''ڈوہلی'' جائیں گے۔ یہ جگہ باغ سے آگے ہے۔ وہاں تک پہنچنے میں تقریباً پون گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ ساڑھے دس بجے جیپ آ گئی۔ میں، رومی اور ذیشان عازمِ سفر ہوئے۔ کرنل مظہر کا گھر ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ کرنل صاحب بارڈر پر رہتے ہیں۔ بیوی بچے اکیلے رہتے ہیں۔ مہینے میں ایک بار گھر آتے ہیں۔ عصمت بڑی پیاری اور ملنسار لڑکی ہے۔ پانچ بچوں کی ماں ہے مگر بڑی سمارٹ ہے۔ فیاض کی بھابی ہے۔ عصمت کے تن تنہا رہنے پر اُسے شاباش دی جن کا ایمان مضبوط ہوتا ہے وہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

قائداعظم نے ہمیں پاکستان تو بنا دیا مگر ہم چاروں طرف سے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے فوجی آزاد کشمیر کی حفاظت کے لیے اپنا تن من قربان کر رہے ہیں مگران کا نعرہ خودمختاری ہے۔ پہلے مشرقی بنگال میں ہم نے اپنی فوج کو ذلیل و رسوا کروایا وہ ہم سے علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بنا۔ اب مقبوضہ کشمیر میں مسلمان گاجر مولی کی طرح کٹ رہے ہیں مگر معاملہ جوں کا توں ہے۔ سالہا سال سے بارڈر پر فوجیں ڈیرے جمائے بیٹھی ہیں نجانے آزاد کشمیر کا کیا بنے گا؟

ڈیڑھ بجے واپسی ہوئی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر اخبار کا مطالعہ کیا اور پھر گہری نیند سوگئی کیونکہ رتجگا تھا۔ عصر اور مغرب کی نماز سے فارغ ہوئی تو خالد نے ایک فلم دکھائی یہ پروگرام انڈین فنکاروں نے لندن میں کیا تھا۔ بڑا ہی دلچسپ پروگرام تھا۔ سری دیوی کو پہلی بار دیکھا بہت پسند آئی۔ رومی نے بتایا کہ اس کی فلم ''چاندنی'' اور ''لمحے'' ضرور دیکھیں۔ ذیشان کرنل مظہر کے بیٹے کا دوست ہے وہ اس کے گھر رہ گیا۔ ذیشان کے بغیر گھر میں کوئی رونق ہی نہیں۔

۱۸۔ دسمبر

عبداللہ پیارا دو دن بعد ایک سال کا ہو جائے گا۔ گذشتہ سال ان دنوں میں فرح کے پاس تھی۔ ۲۰۔ دسمبر فرح کو ابرار سرجری داخل کیا۔ لیبر روم کے باہر نماز عشا ادا کر کے میں اپنی بچی کی صحت و سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی کہ میرے کانوں میں بچے کے رونے کی آواز آئی۔ میں بدستور دعا کرتی رہی حتیٰ کہ ایک آیا نے عبداللہ کی آمد کی خوشخبری سنائی۔ میں فوراً بارگاہ رب العزت میں سربسجود ہوگئی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ پروردگار میری بچی کے ہنستے بستے گھر کو نظرِ بد سے بچانا۔ اعزاز ماہم اور عبداللہ کو اپنے والدین کے ٹھنڈے سائے تلے پروان چڑھانا (آمین)۔

آج خلافِ معمول کافی سردی ہے۔ میں نے ہیٹر لگایا اور فیملی میگزین میں ایک دکھ بھرا انٹرویو پڑھا۔ ''زاہد عباسی او جڑی کیمپ کا لاعلاج زخمی جو تین سال سے بے ہوش پڑا ہے۔''

''ڈیڈی۔ ڈیڈی بولیں نا۔ آپ بولتے کیوں نہیں۔ امّی ڈیڈی کب بولیں گے۔ ڈیڈی کے ساتھ جیپ پر سیر کے لیے کب جائیں گے؟'' معصوم بلال ماں کو جھنجھوڑتے ہوئے کئی سوال پوچھ ڈالتا ہے۔ ''یہ تو خوشی کی بات ہے کہ زاہد کی زندگی بچ گئی مگر انسان بول نہ سکے۔ چل پھر نہ سکے، اپنے بچوں کو پیار نہ کر سکے تو یہ زندگی کیسی ہے؟'' زخمی زاہد کی اہلیہ عذرا عباسی نے رنجیدہ اور دکھ بھرے لہجے کی باتیں پڑھ کر، میں چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ یا اللہ تیرے کتنے انوکھے فیصلے ہیں۔ زاہد عباسی کی ماں کا سہاگ اُجڑ گیا۔ بیٹے کی زندہ لاش گود میں لیے جی رہی ہے۔

میرے سکوتِ غم کو خالد کی آواز نے توڑا۔ ''بی بی خالہ آیئے آج آپ کو راولا کوٹ کی سیر کراؤں۔ واہ کو خیرآباد کہہ کر جب آغا صاحب کی سرپرستی میں آئی تو سیر و تفریح کا سلسلہ یکسر منقطع ہو گیا۔ آغا صاحب اکثر لاہور جاتے لیکن اُن کا ہم سفر، ہم پیالہ، ہم نوالہ نثار شاہ یا میر داد ہوا کرتا تھا۔ کراچی جاتے تو الماس بیگم ہم رکاب ہوتیں یا شاہدہ پروین مرحومہ۔ تاج محل ہوٹل میں بذریعہ جہاز آتی اور آغا صاحب کی خلوتوں میں اُجالے ہی اُجالے ہوجاتے۔ میں جوان بیٹے اور بیٹی کو سینے سے لگائے دکھوں کی چادر میں منہ چھپائے گھر میں پڑی رہتی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ بچوں کو لے کر واہ اپنے ''گوشۂ عافیت'' میں واپس چلی جاؤں مگر پھر بیٹی کی شادی کا مسئلہ دامن گیر ہو جاتا اور میں پتھر بن کر آغا صاحب کی دہلیز پر پڑی رہی۔ آغا صاحب سوات اور گلگت کی سیر کو نکلے تو میں آپا جی کی تیمارداری کرتی رہی۔

اسلام آباد سے آئے ہوئے آج سات دن ہو گئے میں نے آزاد کشمیر کے حسین نظاروں کا خوب لطف اٹھایا۔ راولا کوٹ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ دوپہر کا کھانا ساتھ تھا اس لیے بنجوسہ ریسٹ ہاؤس گئے۔ یہ دومنزلہ ریسٹ ہاؤس بہت ہی دیدہ زیب ہے۔ یہ جگہ 5500 فٹ بلندی پر ہے اور کافی ٹھنڈی جگہ ہے۔ میں گھومتے پھرتے دور جنگل میں نکل پڑی۔ چیڑ اور شمشاد کے درخت تو اس خزاں رسیدہ موسم میں بھی سرسبز و شاداب نظر آ رہے تھے لیکن دوسرے درخت بالکل ننگے بچے موسم گل کے انتظار میں تھے۔ انسانوں کی طرح درختوں میں بھی تفریق ہے کچھ لوگ سدا خوشیوں میں جھولتے ہیں اور کچھ نشیب و فراز کی چکی میں پستے رہتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر میرے دل کی ترجمانی کرتا ہے:

میری آنکھوں میں کھٹکتے ہیں یہ نشیب و فراز
یارب میری آنکھوں میں دوعالم کو برابر کردے

رومی کی آواز نے میری سوچوں کے تانے بانے درہم برہم کر دیئے۔

''آیئے پھوپھو کھانا تیار ہے۔''

سب سے پہلے گرم گرم حلیم کھائی۔ پھر چپل کباب، مچھلی، سلاد اور چٹنی کھائی۔ اندر کمرہ میں ٹھنڈک تھی کچھ ریلا پلیٹ میں ڈال کر باہر لان میں آ گئی اور خوب مزے مزے سے کھایا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ دل میں ایک حسرت مچلتی رہتی ہے کاش کسی پہاڑ کے دامن میں میرا بھی ایک خوبصورت سا گھر ہو۔ چند تصاویر اُتروائیں اور واپس چل دیئے۔ راستے میں ڈرائیور ہوٹل

سے چائے پی۔ یہ چائے بڑی مزے کی ہوتی ہے۔ راولا کوٹ خالد اپنے ایک کرنل دوست کے گھر لے گیا۔ انہوں نے بھی خوب خاطر تواضع کی۔ شام تقریباً ساڑھے چھ بجے گھر پہنچ گئے۔ پُر پیچ راستوں پر خالد بڑی مہارت سے گاڑی چلاتا ہے۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ وضو کر کے تمام قضا نمازیں ادا کیں۔ اللہ سے دوستی بہت ضروری ہے ابھی تو میں نے اپنے پیارے اللہ کے گھر بھی جانا ہے۔ نمازِ عشا سے فارغ ہو کر ٹی وی دیکھنے آ گئی۔ امیتابھ اور جیا بہادری کی فلم ایک نظر دیکھی گانے بہت پسند آئے۔

رات کھانے پر رومی نے چکن سوپ پلایا۔ تمام تھکن دور ہو گئی۔ ذیشان اپنے دوست کے گھر ہے۔ اُس کی بڑی کمی لگتی ہے وہ میرا روم میٹ تھا۔

رات گئے تک مطالعہ کرتی رہی۔ نعیم بخاری کا انٹرویو پسند آیا۔ نام پڑھتے ہی ایک ہنستا مسکراتا پیارا سا شرارتی چہرہ سامنے آ گیا۔ جس کے ہونٹ بند ہوں تو آنکھیں کلام کرتی ہیں اور اگر دونوں پہ پابندی ہو ہاتھ اشارے ہی نہیں باتیں بھی کرتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں کہتا ہے ''وہ بندہ ہی کیا جو غصے پر قابو نہ پا سکے۔ انگریزی میں کہتے ہیں ''کنٹرولڈ اینگر'' اب دیکھیں غصہ بھلا انسان پر کیوں سوار ہو۔ غصہ آتا ضرور ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے ''غصہ بد کا ہوا گھوڑا ہے اس پہ قابو نہ پاؤ گے تو ضرور گرائے گا''۔ میں مکار نہیں ہوں کبھی کبھی جی کرتا ہے کہ کاش میں کچھ مکار بھی ہوتا۔ مگر جو نہج البلاغہ پڑھ چکا ہو اس سے محبت کرتا ہو وہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھے فرقہ پرستی سے نفرت ہے یہ ازم ہمیں لے ڈوبیں گے۔ ہم صرف مسلمان ہیں۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب باقی سب غیر اہم۔ دیکھیں میں علیؓ کا عاشق ہوں۔ وہ بڑا خوبصورت اور نرم آدمی تھا مجھے کسی فرقے سے نہ دلچسپی ہے نہ پسند۔ سیدھا سادا مسلمان ہوں اور بس۔ ہمارے ہاں اسلامی کہانیاں رہ گئی ہیں۔ دین کی سپرٹ ختم ہو چکی ہے۔ پاکستان سے ترکی تک بلکہ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مسلمان ملک کسی ایف 16 کا انجن تک تو بنا نہیں سکا۔ کاک پٹ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ دینے سے مشینری مسلمان تھوڑی ہو جاتی ہے۔ غریب آدمی اللہ پاک کی قسم بہت خوبصورت، بہت مخلص ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی ہوئی، انگریز سے لڑ گیا، خلافت موومنٹ چلی تب بھڑ گیا۔ 1947ء میں عزتِ نفس اور آزادی کے لیے جان پر کھیل گیا۔ بھٹو صاحب نے روٹی کپڑے اور مکان کے پیچھے لگا لیا۔ ضیاء الحق نظامِ مصطفیٰ کے نام پہ حمایت پا گیا۔ یہ جذباتی قوم ہے اور خدائی تحفہ ہے۔ کوئی تو آئے جو اسے لوٹے بغیر ان کا دل توڑے بغیر ان کی محبتوں کی ناقدری کیے بغیر چھوڑ دے۔ یہ تو قوم کی تقدیر بے نظیر سن کے بے حال ہونے والے لوگ ہیں۔ ان ناخواندہ لوگوں کو کوئی تو بتائے، راہ دکھائے۔ یہ تو سب ''وعدہ حور'' پر زندہ ہیں مزے تو چند بڑے ہی کر جاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں میں نے اُردو کو ''لُمیا پادتا'' ہے۔ وہ صحیح خفا ہیں مجھے یاد ہی نہیں رہتا کہ 44 کو چوالیس کہتے ہیں میں چتالیس کہہ دیتا ہوں۔ بھئی میں خالص لاہوریا ہوں ''بھاٹی کی پیداوار'' ''آئی ایم دی پراڈاکٹ آف بھاٹی''۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر بے نظیر غلط اردو بول سکتی ہے۔ صدر پاکستان کہتا ہے ''جہاز ہوا میں پٹ گیا'' تو میں جو اُردو بولوں گا وہی بھاٹی کی ہو گی۔ اپنی نجی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا میں بہت مزے میں ہوں۔ دفتر سے لیٹ نائٹ گھر جاؤں گا۔ اپنے والدین کے پاس کچھ دیر گپ شپ ہو گی پھر اپنے کمرے میں جا کر دیر تک پڑھوں گا۔ صبح کوئی کیس دیکھ لوں گا پھر کورٹ چلے گئے۔ بیوی پالنا بذاتِ خود بڑا مشکل کام ہے۔ اب اس جھنجھٹ میں پڑنے کا کوئی امکان نہیں۔ گلبرگی لوگوں سے مجھے ویسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ عام لوگ اتنا پیار دیتے ہیں، اتنی عزت دیتے ہیں میں اس زندگی سے بہت خوش ہوں۔

اصل عاشقی تو ذہن کی ہوتی ہے۔ ''لو آف گاڈ'' بھی تو ذہن کی عاشقی ہے۔ آخر میں نفیس احمد نفیس کی کتاب نسخہ ہائے وفا کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک نظم سنائی۔

تہ بہ تہ دل کی کدورت\
میری آنکھوں میں امنڈ آئی تو کچھ چارہ نہ تھا\
چارہ گر کی مان لی\
اور میں نے گرد آلود آنکھوں کو لہو سے دھو لیا\
اور اب ہر شکل و صورت\
عالمِ موجودگی کی ہر شے\
میری آنکھوں کے لہو سے اس طرح ہم آہنگ ہے\
خورشید کا کندن لہو\
مہتاب کی چاندی لہو\
صبحوں کا ہنسنا بھی لہو\
راتوں کا رونا بھی لہو\
ہر شجر مینارِ خون، ہر پھول خونین دیدہ ہے\
ہر نظر اک تارِ خون، ہر عکس خوں مالیدہ ہے\
ہر اک رنگ کے ماتم کا رنگ\
چارہ گر ایسا نہ ہونے دے\
کہیں سے رکا کوئی سیلاب اشک\
اب وضو\
جس میں دُھل جائیں تو شاید دُھل جائیں\
مری آنکھوں، میری گرد آلود آنکھوں کا لہو

پڑھتے پڑھتے نیند نے گلے لگایا اور میں سو گئی۔

۱۹۔ دسمبر

مرغِ سحر کی آواز نے بیدار کیا۔ تھوڑی دیر کمرے کے در و دیوار کو گھورتی رہی۔ پھر باہر صحن میں نکل آئی۔ آسمان پر جھلمل جھلمل کرتے ستارے روپوش ہونے والے تھے پہاڑوں کے دامن سے مؤذن کی سحر انگیز آواز کانوں کو

بڑی بھلی لگ رہی تھی۔شہر کی مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے۔ بسااوقات مولوی صاحب کی خوفناک اور کڑک آواز سن کر دل دہل جاتا ہے۔مجھے آزاد کشمیر کا چپہ چپہ پسند آیا۔اگر میرے پاس مووی کیمرہ ہوتا تو میں ہر خوبصورت منظر کو کیمرے کی آنکھ میں بند کر لیتی۔اللہ کا شکر ہے کہ خالد اور رومی کے پاس میرے یہ دن نہایت سکون اور آرام سے گزرے۔چھوٹے دنوں کا ایک بڑا فائدہ بھی ہے۔دن سیر سپاٹے کرتے گزر جاتا ہے اور کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ کاش اسلام آباد جا کر میرا دل و دماغ ایسا ہی ہلکا پھلکا رہے۔آج کافی دنوں بعد سورج کی روپہلی کرنیں نظر آئیں ورنہ آسمان پر بادل ہی چھائے رہتے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر گرم پانی سے غسل کیا اور باہر صحن میں دھوپ سینکتی رہی۔

رومی نے مجھے ایک بڑا پیارا سا سوٹ تحفہ دیا۔یہ تحفوں کا سال رہا۔ عمران کی شادی کے سلسلے میں بے شمار تحفے ملے۔حدیث نبوی ہے کہ آپس میں تحفے تحائف دیا کرو دلوں میں محبت بڑھتی ہے۔

عمران کی شادی پر میں نے خاندان کے ہر فرد کو جوڑے دیے اور ان کے بچوں کو دو سو روپیہ فی بچہ کے حساب سے نقد ادائیگی کی۔اس رازقِ کریم کی تہہ دل سے مشکور و ممنون ہوں جس نے مجھے اس قابل بنایا وگرنہ آج سے تین سال قبل میری کیا بساط تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر فارغ ہو گئی۔نمازِ ظہر ادا کی۔صرف دو فرض ہوتے ہیں اس لیے پوری یکسوئی کے ساتھ نماز پڑھی جاتی ہے۔عبداللہ کا نیا سوئیٹر شروع کیا۔پھر خالد نے وی سی آر پر اجازت فلم دکھائی۔میری عادت ہے کہ دوپہر کو تھوڑی دیر ضرور آرام کرتی ہوں۔نیند کا غلبہ طاری ہوا مگر ریکھا اور نصیر الدین شاہ کی جاندار اداکاری نے نیند کو مار بھگایا۔فلم بہت پسند آئی۔

شام کرنل مظہر اور ان کے بیوی بچے ملنے آ گئے۔رومی نے چائے کے ساتھ بڑے مزے کی ''ہوم میڈ'' چیزیں کھلائیں۔

اسلام آباد فون کرنے کی بہت کوشش کی مگر نمبر نہ ملا۔آج کا اخبار پڑھا۔وینا حیات کیس کے چرچے اخبارات کی زینت بنے ہوئے تھے کہ اب شوکت حیات اور بے نظیر کے بغل گیر ہونے کے چرچے شروع ہو گئے۔مولانا صاحب نے فتویٰ صادر کر دیا۔اس گندی سیاست نے پاکستان کے ہر شہری کا ذہن گندہ کر کے رکھ دیا۔خبر نامہ سن کر کمرے میں آ گئی۔سامان پیک کیا اور جلد ہی سو گئی۔

۲۰۔دسمبر

ساڑھے چار بجے آنکھ کھل گئی۔دل کو بڑے پیار سے سمجھایا کہ ایسا پُرسکون ماحول پھر کب ملے گا۔نمازِ تہجد ادا کرو۔اپنے اللہ سے راز و نیاز کرو۔کمرے سے باہر آئی۔پہاڑوں پر جھلمل کرتی روشنیوں کو دیکھا۔دریائے پونچھ کی آواز سنی۔ دریا کا پانی جب سنگلاخ چٹانوں سے ٹکراتا ہے تو بڑی پیاری آواز آتی ہے۔آسمان آج پھر بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔صحن میں کھڑے ہو کر کافی دیر خوبصورت کائنات کا مشاہدہ کرتی رہی۔پھر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے تہجد ادا کی۔

سورۂ مزمل میں اللہ پاک نے اپنے پیارے نبی کو کتنے پیارے انداز میں اس نماز کی تاکید فرمائی ہے۔''اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف یا اس سے بھی کچھ کم۔'' ان دنوں فریضۂ حج کی دعا سر فہرست ہے۔دیکھئے کب پوری ہوتی ہے۔

صبح صادق کا نور پھیلتا جا رہا ہے۔مسجد سے مؤذن کی پُرسوز آواز دل پر اثر انداز ہو رہی ہے۔اذان قبولیت دعا کا وقت ہے۔میں نے دعاؤں کا سلسلہ جاری رکھا۔اے خالقِ اکبر میرے بچے عمران کو نیک اور صالح بچہ عطا کرنا۔ سرزمین کشمیر میں یہ میری آخری دعا ہے جو خنک ہواؤں کے دوش پر اڑتی ہوئی آسمانی وسعتوں میں پھیل گئی۔نمازِ فجر سے فارغ ہو کر تلاوتِ قرآن پاک کی۔جی بھر کے صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کو اپنے کھوکھلے سینے میں سمایا۔میرے وجود کے کھوکھلے پن کو میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔دنیا والوں کو کیا پتہ کہ میں کس آگ میں جلتی رہی اور اب تک جل رہی ہوں۔ساٹھ سال کے بعد بونس کی زندگی گزر رہی ہے۔دیکھئے کب بلاوا آتا ہے۔

آج خالد، رومی اور ذیشان کے ساتھ اسلام آباد روانگی ہے۔خالد کا بھی اب آزاد کشمیر سے تبادلہ ہو جائے گا۔اللہ پاک اس چھوٹے سے خوشحال کنبے کو اپنی رحمتوں اور برکتوں کے سائے تلے رکھے۔ان کے محبت بھرے سلوک نے میرے اندر ایک نئی طاقت پیدا کر دی محبت اور خلوص کی طاقت۔

الوداعی سلام اے آزاد کشمیر کی پُربہار سرزمین۔

''اردو''

سائنسی تحقیق فار بائیو میڈیکل ریسرچز (لکھنؤ) ایک حالیہ تحقیق کے دوران اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اردو شاعری پڑھنے سے راحت ہی نہیں ملتی بلکہ اُردو اشعار کے مطالعہ سے انسانی دماغ کی کئی صلاحیتیں فروغ پاتی ہیں۔سائنس دانوں کے مطابق غزل کے مطالعے سے دماغ کے وہ اگلے حصے متحرک ہوتے ہیں جن سے دماغ سوچنے، سمجھنے کا کام لیتا ہے اور اچھے بُرے کی تمیز کے ساتھ جذبات پر قابو پانا، ذہنی دباؤ سے نمٹنا، اطلاعات کی چھان پھٹک کرنا اور ان کو ترتیب سے لگانا۔اُن کا کہنا یہ بھی ہے کہ اُردو پڑھنے سے بڑھاپے کے مرض نسیان یعنی بھولنے کے مرض کی بھی روک تھام ہوتی ہے۔بقول سائنس دان اُتم کمار دماغ سے نکلنے والی مقناطیسی لہروں کی مدد سے اُردو پڑھنے والے بچوں کو نئی چیزیں سیکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔دلچسپ بات یہ بتائی گئی کہ دماغ سے نکلنے والی شعاعوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کونسی زبان سیکھنا آسان اور کونسا رسم الخط سیکھنا مشکل ہے مثلاً ہندی اور جرمن آسانی سے، انگریزی اور فرانسیسی مشکل سے سمجھ میں آتی ہیں۔

''محبتوں کے گلاب''

اَنا کا سوال

احمد فراز

(●)

گزر گئے کئی موسم، کئی رُتیں بدلیں
اُداس تم بھی ہو یارو، اُداس ہم بھی ہیں
فقط تمہی کو نہیں، رنجِ چاکِ دامانی
کہ سچ کہیں تو، دریدہ لباس ہم بھی ہیں

تمہارے بام کی شمعیں بھی تابناک نہیں
مرے فلک کے ستارے بھی زرد زرد سے ہیں
تمہارے آئنہ خانے بھی زنگ آلُودہ
مرے صراحی و ساغر بھی، گرد گرد سے ہیں

نہ تم کو اپنے خد و خال ہی نظر آئیں
نہ میں یہ دیکھ سکوں، جام میں بھرا کیا ہے
بصارتوں پہ وہ جالے پڑے، کہ دونوں کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا، کہ ماجرا کیا ہے

نہ سرو میں وہ غرورِ کشیدہ قامتی ہے
نہ قُمریوں کی اُداسی میں کچھ کمی آئی
نہ کِھل سکے کسی جانب، محبتوں کے گلاب
نہ شاخِ اَمن لیے، فاختہ کوئی آئی

تمہیں بھی ضد ہے، کہ مشقِ ستم رہے جاری
ہمیں بھی ناز کہ جور و جفا کے عادی ہیں

تمہیں بھی زعم مہا بھارتا لڑی تم نے
ہمیں بھی فخر کہ ہم کربلا کے عادی ہیں

ستم تو یہ ہے کہ دونوں کے مرغزاروں سے
ہوائے فتنہ و بُوئے فساد آتی ہے
اَلم تو یہ ہے کہ، دونوں کو وہم ہے کہ بہار
عدو کے خُوں میں نہانے کے بعد آتی ہے۔

تو اب یہ حال ہُوا اِس درندگی کے سبب
تمہارے پاؤں سلامت رہے نہ ہاتھ میرے
نہ جیت جیت تمہاری، نہ ہار ہار میری
نہ کوئی ساتھ تمہارے ,نہ کوئی ساتھ میرے

ہمارے شہروں کی مجبور و بے نوا مخلُوق
دبی ہوئی ہے دُکھوں کے ہزار ڈھیروں میں
اب اُن کی تیرہ نصیبی چراغ چاہتی ہے
جو لوگ، نصف صدی تک رہے اندھیروں میں

چراغ جن سے محبت کی روشنی پھیلے
چراغ جن سے دِلوں کے دیار روشنی ہوں
چراغ جن سے ضیا امن و آشتی کی ملے
چراغ جن سے دیے بے شمار روشن ہوں۔

تمہارے دیس میں آیا ہوں، دوستو اب کے
نہ ساز و نغمہ کی محفل نہ شاعری کے لیے
اگر تمہاری انا ہی کا ہے سوال، تو پھر
چلو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں، دوستی کے لیے؟

○

التجا

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

داتا
جو دینا ہے
وہ دے دیتا
تو میں یہ کرتا
نہ ہی وہ کرتا

مرے ہاتھ
سدا کے سوالی تھے
ترے دست عطا کب خالی تھے۔؟
مجھے بھیک کی پل پل جلدی تھی
تری جانب سے پابندی تھی
مری پستی، تیری بلندی تھی
یا تیری سب نیرنگی تھی۔
داتا!

احکام جو تیرے تھے
ان کو
جانا، سمجھا اور بھول گیا
ممنوعہ چیزوں کے پیچھے
اک سیدھا رستہ
بھول گیا

بے سمت ہُوا
بے سمت پھرا

میں تیرا رستہ بھول گیا
تن من میرا
سب داغ ہُوا
اس پر بھی تو نے کرم کیا
مرے سامنے آئینہ رکھا
اور عکس نے
منہ پر تھوک دیا
تب مجھ پر میرا حال کُھلا

یہ بھی تیری عطا ہے، تیری عطا
مرے چہرے کا اک اک دھبّا
ابھی خلق کی آنکھوں سے ہے چھپا
مرے شانے آج بھی سیدھے ہیں
اور سر اونچا کا اونچا ہے
مری ٹوپی
آج بھی ٹیڑھی ہے
اور پھندنا بھی لہراتا ہے

جو خلقت مجھ پہ نہیں ہنستی
نہیں کھلتی ان پہ مری پستی
یہ بھی تیرا کرم ہے، تیری عطا ہے
داتا!

میں اندر سے شرماتا ہوں
پھر تیرے در پر آتا ہوں
مجھ بھیک کی جلدی والے پر
اس اندر سے
منہ کالے پر
رحمت کردے!

اندیشۂ امروز

یونس شرر
(نیویارک)

انگلیوں کی زد میں ہے ساری زمیں
یہ جہاں وہم و گماں ہو جائے گا
اک دھماکے سے زمیں اڑ جائے گی
یہ سانحہ بھی ناگہاں ہو جائے گا
مسئلہ یہ ہے کہ انسانی وجود
خاک میں مل کر دھواں ہو جائے گا
چاک پر ٹھہری رہیں گی انگلیاں
منتشر نظمِ جہاں ہو جائے گا
بام کی سب رونقیں لٹ جائیں گی
شام کا سونا سماں ہو جائے گا
زندگی سے روشنی چھن جائے گی
علم و فن بھی رائگاں ہو جائے گا
خاک پھر آسماں برسائے گا
اک قیامت کا سماں ہو جائے گا
پیڑ ہوں گے نہ پرندے شاخ پر
آدمی بھی بے نشاں ہو جائے گا
ورق گل بکھرے رہیں گے فرش پر
موسم گل بھی خزاں ہو جائے گا
پھر کسی خسرو کسی پرویز کے
حرف و معنی کا زیاں ہو جائے گا
زمیں ہو گی, نہ ہو گا آسماں بھی
یہ زمیں سر نہاں ہو جائے گا
پھر کوئی آیت، صحیفہ آئے گا
یا خدا بھی، بے زباں ہو جائے گا

○

(تیز رفتار ترقی اور دنیا کی بدلتی ہوئی صورت حال نے ہمارے تہذیبی رویئے اور ضرورتوں کو بھی تبدیل کر دیا ہے، اب دنیا انگلیوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے، انگلیوں کی کارفرمائی اور دسترس لمحہ فکریہ ہے)

شکستِ دل کا نوحہ

احمد کلیم فیض پوری
(بھساول، بھارت)

عجب سنسان رستے ہیں یہاں کے
نہ آدم زاد ہے کوئی
نہ ہے، ہمزاد سونی وادیوں میں
نظر بھر کر بھی دیکھوں میں
نظر آتا نہیں کچھ بھی
فقط وہ اک پرندہ ہے
کہ جس کے ناخنوں میں
گوشت کے تکے پھنسے ہیں
عجب طائر
کہ جسکا پیٹ بھرتا ہی نہیں ہے

بچاری فاختہ
افسردگی اوڑھے
کسی محراب میں بیٹھی
شکست دل کا نوحہ لکھ رہی ہے

○

''حصار ہندسوں کے''

شگفتہ نازلی
(لاہور)

ہندسوں کے بدلنے سے کیلنڈر بدلتا ہے۔۔۔
کیلنڈر بدلنے سے ہفتے ماہ بدلتے ہیں۔۔۔
ہفتے ماہ بدلنے سے تاریخیں بدلتی ہیں۔۔۔
تاریخیں بدلنے سے وقت آگے بڑھتا ہے۔۔۔
وقت آگے بڑھنے سے دورانیہ بھی گھٹتا ہے۔۔۔
جسم روح میں ڈھلتے ہیں۔۔۔
اور سرہانے پڑھنے کو کتبے جا کے لگتے ہیں۔۔۔
آنے اور جانے کی تاریخیں رَقم اُن پر۔۔۔
سو گُزرتے، آتے سال۔۔۔
ہیں حصار ہندسوں کے۔۔۔
اپنے ہیر پھیر سے۔۔۔
ہم کو باندھے رکھتے ہیں۔۔۔
نئے پرانے چولوں سے۔۔۔
کیا کیا دھوکے دیتے ہیں۔۔۔
جال پھر فریبوں کے کیسے کیسے بُنتے ہیں۔۔۔
رنگ ڈھنگ بدلتے ہیں۔۔۔
روپ بہروپ بھرتے ہیں۔۔۔
اور تماشا کرتے ہیں۔۔۔
روز و شب گزرنے کا۔۔۔!

❍

دریدہ چادر

سیمیں کرن
(فیصل آباد)

مرے کہنہ نقوش اور برف بالوں کو
اس ساحر نے جادوئی ڈبے میں ڈالا
مصور جمال کی آپشن سامنے تھی
اس پہ کن کا حکم لگایا
خطوط پہ اک نادیدہ برش پھرنے لگا
بوسیدہ لکیریں مٹنے لگیں، پیکر سنورنے لگا
اک اک کر کے اس جادوئی دست شفا نے ہر خط کو اجاگر کیا
ہر شکستہ خط کو نیا رنگ و روغن عطا ہوا
برفاب بالوں کو سیاہی ملی
لبوں پہ سرخی لگائی، رخسار کو غازہ ملا
دھندلے عدسے پھر سے چشم آہو ہوئے
ہر شکن تن کر تلوار ہوئی
مگر یہ اداسی کی دھندلی ردا تھی
جو وجود کو ہالہ کیے ہوئے تھی
یہ روح کی کہنہ سالی تھی
یہ صدیوں پرانی تھی
اور مصور جمال کے پاس ابھی ایسا کوئی ایپ نہیں
ایسا کوئی برش نہیں جو روح کی دریدہ چادر سی سکے

❍

سنو اے لڑکی

حجاب زیدی
(گوجرانوالہ)

حیا کی پیکر حجاب میں خود کو
یوں ہی ڈھال رکھنا
میری بے باک و بے شرم محبت سے
خود کو سدا سنبھال رکھنا
نہ گزرنا روز میری گلی سے تم
نہ ربط زیادہ بحال رکھنا
ہے تقاضہ محبت کا یہی ہے
نہ لب پہ گلہ نہ سوال رکھنا
سنو
اے لڑکی حیا کی پیکر
حجاب میں خود کو یوں ہی ڈھال رکھنا
زمانے کی راہ و رسم سے دور
اپنی الگ اک کٹیا بسا لینا
خود کو نایاب بے مثال رکھنا
اپنا بہت سا خیال رکھنا
سنو اے لڑکی
حجاب میں خود کو یوں ہی ڈھال رکھنا

○

سرخ گلابوں کی طرح

انجم جاوید
(کراچی)

میرے محبوب تجھے شک ہے وفا پر میری
میں یقیں تجھ کو محبت کا دلاؤں کیسے؟
میرا لہجہ۔ مرے الفاظ مرے بس میں نہیں
سوچتا ہوں کہ اگر آخری خوں کا قطرہ
تیری خاطر تری چاہت پہ نچھاور کر دوں
پھر بھی کیا تجھ کو یقیں آئے گا؟
گفتگو کرتا ہوں پھولوں کی زباں میں اکثر
دودھیا رنگ کے نازک سے گلِ تر کی قسم
جو ہے پاکیزگیٔ جاں کی علامت جاناں
میری الفت میری چاہت کی صداقت جاناں
شعلہ دیتے ہوئے پھولوں کی قسم کھاتا ہوں
جن کے ہر برگ پہ ہے اہلِ محبت کا لہو
سرخیاں جن کی ہیں اظہارِ محبت کی علامت جاناں
اور قربان و ایثار کا اک درس عظیم
اور نیلے سے مہکتے ہوئے پھولوں کی قسم کھاتا ہوں
رنگ سے جن کے ملا کرتی ہے دل کو ٹھنڈک
پیار کے رنگ کو آنکھوں میں جلا دیتا ہے
اور گلابی سے گلابوں کی قسم کھاتا ہوں
عکس ہیں جو لب و رخسار کے تیرے جاناں
زرد پھولوں کی میں کھاتا ہوں قسم
جیسے پت جھڑ میں جدا ہوتے ہوئے پتے ہوں
تیری ناراضگی کی جیسے علامت ہوں یہ پھول
جیسے ہو دورِ بہاراں ہی خزاں کا انجام
ایسے ہی روٹھے ہوئے
پیار میں ڈوبے ہوئے لوگ
ایک دوجے کو بہت جلد منا لیتے ہیں اور
ہنس پڑتے ہیں پھر
سرخ گلابوں کی طرح

''سرائے فانی''

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
(راجوری، جموں کشمیر)

آج 29 دسمبر 2018ء کا دن ہے اور پروفیسر حامدی کاشمیری کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے آج تین دن ہو چکے ہیں یعنی وہ 27 دسمبر 2018ء بروز بدھ وارشب بوقت 9 بج کر 45 منٹ پر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اس میں کیا شک ہے کہ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ جانے والے تو نہیں آتے، جانے والوں کی یاد آتی ہے۔ میں نے جب 27 دسمبر کو سرینگر کے ایک دوست جناب شبیر صاحب (میزان پبلشرز) کی واٹس ایپ پہ بھیجی یہ مایوس کُن خبر پڑھی کہ ہماری ریاست کے ایک عظیم شاعر، نقاد، محقق اور فکشن نگار پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب اس دنیا میں نہیں رہے تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرے پورے وجود میں مایوسی کی اک لہر سی دوڑ گئی۔ اپنے کئی دوست واحباب کو یہ مایوس کُن خبر سنائی۔ جس کسی نے سُنی اس نے افسوس کا اظہار کیا۔ اردو شعروادب کی ایک ایسی عظیم شخصیت کہ جسے اردو دنیا پروفیسر حامدی کاشمیری کے نام سے جانتی ہے اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کا شعری وادبی سرمایہ اور ان کی قدآور شخصیت کے تابناک پہلو انھیں زندہ جاوید رکھیں گے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری میرے معنوی استاد تھے۔ ماضی کے دریچوں سے جب جھانکتا ہوں تو ان سے جڑی کئی یادیں میرے سمند تخیل پر تازیانہ لگانے لگتی ہیں۔ میں نے اسکول اور کالج کے زمانے میں ہی ان کی غزلیں، مضامین اور کہانیاں پڑھنا شروع کی تھیں۔ میرے ذوق مطالعہ اور شوق تحریر نے مجھے ان کی کتابیں خرید کر پڑھنے پر آمادہ کیا۔ یہاں میں یہ لکھے بغیر آگے بڑھنا نہیں چاہتا کہ پروفیسر حامدی کاشمیری اور ان کے معاصرین میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر ظہورالدّین، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر محمد حسن، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر عتیق اللہ، قاضی افضال حسین اور وزیر آغا کے علاوہ کچھ اور بھی اہم نام ہیں کہ جن کی تصنیفات وتالیفات کا مطالعہ کرنا میرے ادبی مشغلے میں شامل رہا ہے۔

یہ غالباً 1983ء کی بات ہے کہ جب میں گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ (ضلع ڈوڈہ) میں بی اے سال اوّل کا طالب علم تھا تو میں نے حامدی صاحب کے نام ایک خط لکھا جس میں، میں نے ان سے فن تحریر کے بارے میں مکمل واقفیت بہم پہنچانے کی استدعا کی تھی۔ کوئی بیس دن کے بعد مجھے ان کی جانب سے بذریعہ ڈاک ایک خط موصول ہوا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''لکھنا انسان کا ایک فطری عمل ہے۔ میں آپ کے شوق اور جذبے کی قدر کرتا ہوں اور یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ زیادہ سے زیادہ بڑے ادیبوں کی کتابوں کا مطالعہ کیجیے''۔ ان کے ان ذریں جملوں کو میں نے اپنے ذہن ودل میں نہ صرف جگہ دی بلکہ ان پہ عمل پیرا بھی ہوا۔ خوب سے خوب تر کی جستجو نے مجھے غائبانہ طور پر پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب کے قریب کر دیا۔ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وہ میرے خطوط کا جواب دیتے۔ ان خطوط میں ان کا خلوص، محبت واپنائیت اور علم وادب کی دنیا میں مجھے آگے بڑھنے کے مشورے ہوتے۔ بھدرواہ کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد بھی حامدی صاحب کے ساتھ میری خط وکتابت جاری رہی۔ اسی دوران آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی کے افسانے جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی سے شائع ہونے والے موقر ومعیاری رسالہ ''شیرازہ'' میں پڑھنے کا موقع ملا تو ان سے بھی خطوط کے ذریعے آدھی ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا۔

1987ء میں جب میں اسکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں ٹیچر بھرتی ہوا اور میری ڈیوٹی اپنے آبائی گاوں بھوتہ (ضلع ڈوڈہ) کے مڈل اسکول میں لگائی گئی تو میں نے اسی دوران حامدی صاحب کی تنقیدی کتاب ''غالبؔ کے تخلیقی سرچشمے'' چند دنوں میں پڑھ ڈالی۔ کتاب پڑھنے کے بعد میں نے حامدی صاحب کے نام خط لکھا جس میں ان کے عالمانہ انداز بیاں کا خصوصی ذکر تھا۔ انھوں نے ایک پوسٹ کارڈ کی صورت میں میرے خط کا جواب دیا۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی ہوئی کہ انھوں نے مجھ ناچیز کے خط کا جواب دیا ہے۔ اس زمانے میں موبائل فون تو دور کی بات لینڈ لائن فون بھی نہیں ہوا کرتے تھے سوائے بڑے پوسٹ آفسوں یا کسی بڑے آفیسر کے دفتر کے۔ 1989ء میں جب میں گورنمنٹ مڈل اسکول بھوتہ سے گورنمنٹ ہائی اسکول بلند پُور آیا تو دو ماہ کے بعد ڈسٹرک لائبریری ادھم پور میں مجھے حامدی کاشمیری صاحب کی کتاب ''جدید اردو نظم اور یورپی اثرات'' دستیاب ہوئی یہ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ تھا جو کتابی صورت میں تھا۔ میں نے اس کتاب کو بڑے شوق اور ذہنی یکسوئی سے پڑھا۔ پڑھنے کے بعد میں نے اپنے گھر ماتلائی، تحصیل چھننی سے انھیں خط لکھا جس میں کتاب کی پسندیدگی کا اظہار تھا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے ان کا خط موصول ہوا جس میں انھوں نے مجھے کشمیر یونیورسٹی میں آکر ملاقات کرنے کی خواہش کی تھی۔ بہرحال میں نے اس بات کو اپنی سعادت مندی سمجھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں ستمبر 1989ء میں بلند پور ہائی اسکول سے ان سے ملاقات کے لیے سرینگر چلا گیا۔ سرینگر پہنچ کر میں سیدھا یونیورسٹی گیا وہ ان دنوں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ میں ان کے آفس میں گیا تو وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ ان کے چپراسی نے مجھے کہا کہ حامدی صاحب کسی کام سے یونیورسٹی کے انتظامیہ بلاک میں گئے ہیں۔ آپ بیٹھے رہیے وہ آتے ہی ہوں گے۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب آ گئے۔ دراز قد، نُورانی آنکھیں، سڈول جسم، لمبے ہاتھ اور رفتار وگفتار میں وہی ادیبانہ طمطراق یہ میری حامدی صاحب سے پہلی بالمشافہ ملاقات تھی اجنبیت کا پردہ لمحہ بھر کے لیے میرے اور ان کے درمیان حائل رہا۔ دعا وسلام کے بعد جب میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ میں تحصیل چھننی، ضلع ادھم پور کا باشندہ ہوں آپ سے ملاقات کرنے آیا ہوں تو کہنے لگے ''چھننی میں میرا ایک قلمی

دوست ہے،اس کا نام مشتاق احمد وانی ہے''۔میں نے مسکراتے ہوئے کہا وہ ناچیز میں ہی ہوں۔آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔حامدی صاحب فوراً اپنی کرسی سے کھڑے ہوئے۔مجھے گلے لگایا۔بہت خوش ہوئے۔چائے منگوائی پھر کہنے لگے اب میں زیادہ تر تنقید لکھتا ہوں اور شاعری کرتا ہوں۔میں نے اپنی معلومات کے لیے ان سے کچھ سوالات بھی کیے۔انھوں نے خندہ پیشانی سے تسلی بخش جواب دیئے۔میں جب ان سے رخصت ہونے لگا تو کہنے لگے''ٹھہر جائیے''انھوں نے ''انجمن آرزو''نام کی ایک کتاب الماری سے نکالی اور مجھے دی۔حامدی کاشمیری کچھ ہی دن پہلے ہندوستانی ادیبوں کے ایک وفد کے ساتھ پاکستان سے لوٹے تھے۔مذکورہ کتاب کا تعلق اُسی روداد سے تھا۔

شب وروز کے بھنور میں الجھنے اور 1992ء تک ماہانہ 1700 روپے تنخواہ ملنے کے باوجود میں نے جہاں اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے ہندوستان کے پبلشروں سے اردو کے معتبر ومعیاری ادیبوں کی کتابیں خرید کر پڑھیں وہیں پروفیسر حامدی کاشمیری کی بھی بہت سی کتابیں خرید کر پڑھتا رہا۔میری خوشی کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہتی جب میرا کوئی افسانہ یا تحقیقی وتنقیدی مضمون اردو کے کسی موقر ومعیاری رسالے میں شائع ہوتا اور مجھے حامدی صاحب کا فون آتا کہ انھیں میری ادبی نگارشات نے متاثر کیا۔وہ اکتشافی تنقید کے موجد اور علمبردار تھے۔روائتی تنقید سے وہ بہت حد تک نالاں تھے۔تخلیق اور تخلیقیت میں تخلیق کار کے تجربے کا عمل دخل اور لفظ ومعنی کے تفاعل پر ان کا تنقیدی نظریہ ادبی حلقوں میں کافی موضوع بحث رہا لیکن انھوں نے اپنے نظریے کی حمایت میں اپنی تھیوری بھی پیش کی۔

حامدی کاشمیری ایک مرنجان مرنج شخصیت تھے۔لکھنے پڑھنے والوں کو وہ بہت چاہتے تھے۔اردو کے تمام معیاری رسائل وجرائد میں ان کے مضامین اور غزلیں تادم آخر شائع ہوتی رہیں۔لکھنے پڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اوران کے روشن مستقبل کی خاطر وہ اپنی استعداد کے مطابق کوشش کرتے۔مجھے وہ اکثر بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔میری حق تلفیوں پہ وہ کافی دل برداشتہ ہوتے رہے۔جموں،سنجواں میں میرے مکان سے ان کا مکان تقریباً ڈیڑھ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔سردیوں میں جب حامدی کاشمیری صاحب جموں اپنے مکان میں آتے تو میں ان کے پاس جاتا۔بہت خوش ہوتے۔غالباً 2013ء میں،میں انھیں سنجواں اپنے مکان میں لایا۔بیوی بچوں سے ملے،مکان دیکھا بہت خوش ہوئے۔تقریباً ایک گھنٹہ میرے گھر پہ رہے۔انھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے نشیب وفراز مجھے سنائے۔

2015ء میں جب میں کسی ضروری کام کے سلسلے میں سرینگر گیا تو حامدی صاحب سے میری فون پہ بات ہوئی۔انھوں نے مجھے اپنے گھر پہ آنے کا اصرار کیا۔شالیمار میں کوہ سبز نام کے ایک دلکش علاقے میں ان کا عالیشان مکان ہے۔میں ان کے پاس چلا گیا۔پُر تپاک انداز میں ملے۔چائے پلائی،بہت سی ادبی باتیں ہوئیں۔میں اٹھ کھڑا ہوا ان سے رخصت چاہی تو خفا ہونے لگے بولے''آج میرے پاس ٹھہریے''میرے ہاتھ سے میرا بیگ چھڑایا اندر لے جا کر ایک طرف رکھا اور کہنے لگے''شام ہونے جارہی ہے بیٹھیے،یہ کشمیر ہے یہاں کب کیا ہو حالات کیا رُرخ اختیار کریں کچھ کہا نہیں جاسکتا''میں نے اپنی کئی مجبوریاں ان کے سامنے رکھیں لیکن انھوں نے میری کوئی بات نہیں مانی۔مجھے مجبوراً ان کے ہاں رُکنا پڑا۔رات کو مجھے اپنی لائبریری کی سیر کرائی۔قدیم وجدید کتابوں اور رسائل وجرائد کی ایک دنیا میرے سامنے تھی۔میں یہ سب کچھ دیکھ کے حیرت میں پڑ گیا۔پھر بولے''پڑھنا اور لکھنا میری روحانی غذا ہے۔میں ہر روز کچھ نہ کچھ لکھتا اور پڑھتا ہوں''دوسرے دن جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو میرے ساتھ اپنے گھر کے لان سے باہر ایک جگہ کھڑے ہوگئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے''اب میں عمر کی حدیں پھلانگتے ہوئے کافی دور نکل آیا ہوں۔میں نے اپنے گھر والوں کو یہ وصیت کی ہے کہ میری آخری آرام گاہ اسی جگہ بنائیں''مجھے حامدی صاحب کی یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے ان کی سنجیدگی اور جہاندہ ذہنیت کا ایک نیا ورق سمجھنے کا موقع ملا تھا۔

دسمبر 2016ء میں،جب میں نے پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب کو فون پہ یہ خوشخبری سنائی کہ میں نے ہائی کورٹ جموں سے کیس جیت لیا ہے اور بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر اردو جوائن کرلیا ہے تو وہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سمائے۔کہنے لگے''آج کا دن میرے لیے خوشی کا دن ہے۔اللہ نے آپ کی مدد کی۔وہ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا''حالانکہ ضعف اور رعشہ کی وجہ سے انھیں بات کرنے میں دقّت پیش آتی تھی لیکن اس کے باوجود باہوش انداز میں باتیں کرتے رہے۔2017ء میں میری فون پہ ان سے دوتین بار باتیں ہوئیں لیکن وہ اچھی طرح بات نہیں کرپائے۔مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والی بات کہ بالآخر وہ ہمیشہ کے لیے اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔میں ہر ممکن کوشش کے باوجود ان کے جنازے میں شریک نہیں سکا!مجھے ان کے آخری دیدار نصیب نہیں ہوسکے۔اس بات کا مجھے افسوس ہے!کبھی کبھی اس سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ ہم کہاں سے اس دنیا میں آتے ہیں؟یہاں کیا کیا کرتے ہیں اور پھر آخر کار کہاں چلے جاتے ہیں!میرا یقین یہ چیخ چیخ کے کہہ رہا ہے کہ جس طرح دوسرا غالبؔ واقبالؔ پیدا نہیں ہوگا اسی طرح اردو میں دوسرا پروفیسر حامدی کاشمیری بھی پیدا نہیں ہوگا۔میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پروفیسر حامدی کاشمیری کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اوران کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے!

بانگ

میں نے اپنے دوست سے پوچھا:تمہارے مرغے میں آج صبح بانگ نہیں دی؟ کہنے لگا: پڑوسیوں نے شکایت کی کہ وہ صبح جگا کر انہیں پریشان کرتا ہے،اس لیے ہم نے اسے ذبح کر دیا۔اس سے مجھے سبق ملا کہ جو بھی لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے،وہ جان سے جاتا ہے۔

د. علی شیریعتی

ایک صدی کا قصّہ

ٹلنی جیونت

دیپک کنول(ممبئی، بھارت)

فلمسازی کے شروعاتی دور میں اچھے گھروں کی لڑکیاں فلموں میں کام کرنا ہتک آمیز سمجھتی تھیں۔ ہیروئنوں کے کردار کے لئے طوائف خانوں سے لڑکیاں لائی جاتی تھیں جواس کمی کو پورا کرتی تھیں۔ یہ روایت تب ٹوٹی جب درگا کھوٹے، لیلا چٹنس، ون مالا،شانتے آپٹے اور شوبھنا سمرتھ جیسی کھاتے پیتے گھروں کی لڑکیوں نے فلموں میں کام کرنا شروع کیا۔انکے آنے سے فلمی دنیا کی توقیر بڑھ گئی۔حالانکہ پریوار کی ممانعت اور سماج کی مخالفت کے باوجود اُنہوں نے اپنی لگن محنت اور صلاحیت کے بوتے پر بہت نام کمایا اور آج فلمی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔انہی اداکاروں میں ایک نام ایسا ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔اس اداکارہ کا نام ٹلنی جیونت تھا۔

ٹلنی جیونت نے ایک متوسط مراٹھی پریوار میں جو کہ بمبئی میں مقیم تھا، 18 فروری 1926 کو جنم لیا۔ٹلنی جیونت کا والد داداصاحب جیونت شوبھنا سمرتھ کے چاچا تھے۔شوبھنا سمرتھ نوتن اور تنوجہ کی ماں تھی۔فلمساز چمن بھائی ڈیسائی ایک جانا مانا نام تھا جس نے پچھتر کے قریب فلمیں بنائیں تھی۔اسی فلمساز نے محبوب خان کو پہلا بریک دیا تھا۔اُس وقت محبوب خان نے کوئی فلم نہیں بنائی تھی بلکہ وہ ایک ایکسٹرا کے طور پر کام کررہا تھا۔جب اُسنے اپنی کہانی''ججمنٹ میں آف گاڈ'' چمن بھائی کو سنائی تو چمن بھائی اس کہانی پر پیسہ لگانے کو تیار ہو گئے اور اسطرح محبوب خان نے اپنی پہلی فلم''ال ہلال''بطور ہدایت کار بنائی۔ستارہ دیوی جو کہ ایک ڈانسر تھی، اُسے پہلی مرتبہ ہیروئن کا چانس ملا۔یہ چمن بھائی ہی تھے جن کے ساگرموی ٹون کے بینر تلے بنی فلم''دکن کوئن''میں گلوکار اداکار سریندر کو پہلی بار پیش کیا گیا۔چمن بھائی ڈیسائی کی مشہور فلموں میں''منموہن''،''وطن''،''عورت''''روٹی''،''نردوش''،''رادھیکا''اور''آنکھ مچولی'' قابل ذکر ہیں۔چمن بھائی جوہر شناس تھے۔اُنہوں نے کئی سارے ہیرے فلم انڈسٹری کو دئے۔اداکار موتی لال بھی ان ہی کی دریافت تھی۔یہ چمن بھائی ڈیسائی ہی تھا جس نے ہونہار موسیقار انل بسواس کو موقع دیا۔انل بسواس نے پہلی مرتبہ فلم''مہا گیت''میں پلے بیک کا استعمال کیا۔یہ فلم بھی ساگرموی ٹون کے بینر تلے بنی تھی۔گلوکار مکیش کو پہلی بار پردہ سیمیں پر پیش کرنے والا چمن بھائی ہی تھا جس نے اپنے نئے بینر نیشنل اسٹوڈیو کے تحت بننے والی فلم''نردوش''میں مکیش کو دنیا کے سامنے لایا۔

ایک دن کی بات ہے۔شوبھنا سمرتھ کے گھر پر ننھی نوتن کا جنم دن منایا جارہا تھا۔شوبھنا سمرتھ نے گھر پر بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا تھا جسمیں کئی ساری فلمی ہستیاں شامل تھیں۔ان میں ایک چمن بھائی ڈیسائی بھی تھا۔اسی پارٹی میں ٹلنی جیونت بھی شامل تھی۔چمن بھائی ڈیسائی اُن دنوں فلم''رادھیکا'' بنانے کی تیاریوں میں لگے تھے۔کسی نے ٹلنی جیونت کو چمن بھائی سے متعارف کرایا۔وہ اُسکی شکل وصورت دیکھ کے کافی متاثر ہوئے۔اُنہوں نے ٹلنی جیونت کو اپنی فلم میں ہیروئن کے کردار میں پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اُسکے والد داداصاحب جیونت نے جو کہ پارٹی میں ہی موجود تھے، چمن بھائی کی پیشکش ٹھکرا دی۔داداصاحب جیونت کسٹم افسر تھے اور بمبئی کے گرگام علاقے میں رہتے تھے۔ٹلنی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ٹلنی جیونت میں بچپن سے ہی اداکاری کا رجحان تھا۔اُسنے بچپن میں ہی ماسٹر موہن کلیانی سے کتھک ناچ کی ٹریننگ لی تھی۔اتنا ہی نہیں اُسنے موہن بھائی زیوری سے گائیکی بھی سیکھی تھی۔اصل میں سواستک،امپریل اور ڈریم لینڈ سینما اُسکے گھر کے بالکل قریب تھے اسلئے وہ گاہے بگاہے فلمیں دیکھنے جایا کرتی تھی اور اسطرح اُسکے دل میں بھی اداکاری کرنے کا شوق پیدا ہوا۔دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اُنکی رشتہ دار شوبھنا سمرتھ فلموں کی وجہ سے کافی شہرت پاگئی تھی اسلئے ٹلنی جیونت کے دل میں بھی یہ خواہش نمو پاگئی کہ وہ بھی فلموں میں کام کرے مگر مشکل یہ تھی۔اُسکا باپ فلموں میں کام کرنے کے خلاف تھا۔اُسکا یہ ماننا تھا کہ اگر اُس نے فلموں میں کام کیا تو پھر اُسکی شادی نہیں ہوگی۔وہ شوبھنا سمرتھ سے بھی اس بات پر خفا تھا کہ وہ فلموں میں کام کررہی تھی۔

چمن بھائی بھی اتنی جلدی ہار ماننے والے نہیں تھے۔اُنہوں نے ٹلنی کے والد کو کئی دنوں تک سمجھایا اور بالآخر اُسے راضی کرلیا۔ٹلنی جیونت کو اُسنے اپنی تین فلموں کے لئے سائن کیا۔اُس وقت ٹلنی جیونت کی عمر چودہ سال تھی۔پہلی فلم''رادھیکا'' کو چمن بھائی کا بیٹا وریندر ڈیسائی فلم ڈائرکٹ کررہا تھا۔اس فلم کا ہیرو ہریش تھا جو بعد میں ہدایت کار بن گیا اور اُسنے کئی فلمیں ڈائرکٹ کیں جن میں ''کالی ٹوپی لال رومال''،''دو اُستاد''،''برما روڈ''اور''نقلی نواب'' قابل ذکر ہیں۔فلم''رادھیکا''میں اداکاری کرنے کے ساتھ ساتھ ٹلنی جیونت نے اس فلم کے چار گانے بھی گائے۔یہ فلم 1941 میں نمائش کے لئے پیش کی گئی۔یہ فلم کوئی خاص کمال نہ کرسکی۔ٹلنی جیونت اس فلم سے کوئی پہچان نہ بناسکی۔اس بیچ وریندر ڈیسائی ٹلنی جیونت کے عشق میں گرفتار ہوگیا۔ٹلنی جیونت بیحد خوبصورت تھی اور کسی کا بھی دل لوٹ سکتی تھی۔دوسری فلم''بہن''تھی جسکی ہدایت محبوب خان دے رہے تھے۔فلم''بہن''میں اُسنے ایک اہم کردار ادا کیا۔وہ اس فلم میں شیخ مختار کی بہن بنی ہوئی تھی۔یہ فلم بھی 1941 میں ریلیز ہوئی اور بہت بڑی ہٹ ثابت ہوئی۔تیسری فلم ''نردوش''تھی جسمیں اُسکے مدمقابل گلوکار مکیش تھا۔اسے بھی وریندر ڈیسائی ڈائرکٹ کررہا تھا۔یہ بھی اسی سال ریلیز ہوئی۔یہ تینوں فلمیں چمن بھائی ڈیسائی کے نیشنل اسٹوڈیو کے بینر تلے بنی تھیں۔

فلم''آنکھ مچولی''1942 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم کے ہدایت کار

آرایس چودھری تھے۔1943 میں فلم''آداب عرض''نمائش کے لئے پیش کی گئی۔اس فلم میں اُسکے مدمقابل کرن دیوان تھا۔اس فلم کی ہدایت کاری کی ذمہ داری بھی وریندر ڈیسائی نے اُٹھائی تھی۔اس فلم میں ملکہ ترنم نور جہاں ایک اہم کردار میں تھی۔ساتھ ہی گلوکار مکیش بھی اس فلم میں جلوہ گر تھا۔کرن دیوان اور نلنی جیونت کی جوڑی کو سینما بین کافی پسند کررہے تھے اسلئے اگلی فلم''پھر بھی اپنا ہے'' میں وہ ایک ساتھ جلوہ گر ہوئے۔اس فلم کے ہدایت کار راجہ ینے تھے۔یہ فلم 1946 میں ریلیز ہوئی۔اسکے بعد فلم''گنجن''نمائش کے لئے پیش کی گئی۔اسے وریندر ڈیسائی نے لکھا اور ڈائرکٹ کیا تھا۔اس میں نلنی جیونت کے علاوہ ڈیوڈ ابراہیم، ترلوک کپور اور بلراج ساہنی کام کررہے تھے۔یہ فلم 1948 میں ریلیز ہوئی۔اسی سال اُسکی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام''انوکھا پیار''تھا۔یہ نلنی جیونت کی دلیپ کمار کے ساتھ پہلی فلم تھی۔اسمیں نرگس بھی ایک اہم کردار میں تھی۔اسکے موسیقار انل بسواس تھے جس نے اپنی مدھر دھنوں سے اس فلم کو سجایا تھا۔اس کے گانے ضیا سرحدی نے لکھے تھے۔اس فلم کے ہدایت کار ایم آر دھرمسے تھے۔اس فلم کی کہانی اور مکالمے بھی ضیا سرحدی نے ہی لکھے تھے۔یہ ایک تکونی پریم کہانی تھی جسمیں خاموش عاشق کا کردار دلیپ کمار نے ادا کیا تھا۔مزے کی بات یہ ہے کہ اس فلم میں نرگس کا نام کاسٹ میں سب سے پہلے دیا گیا تھا اُسکے بعد دلیپ کمار کا اور نلنی جیونت کا نام کاسٹ کے آخر میں اہمیت کے ساتھ دیا گیا تھا۔نلنی جیونت کے کام کو اس فلم میں کافی سراہا گیا تھا۔اُسکے بارے میں ناقدانہ رائے یہ تھی کہ اُسکی آنکھیں بولتی ہیں اور وہ اپنے مکالمے صاف ستھرے تلفظ کے ساتھ بولتی ہے۔اُسکی زبان پر مراٹھی زبان کا کوئی اثر نہ تھا سبب یہ تھا کہ نلنی جیونت دیش میں کافی گھومی تھی جس کی وجہ سے اُسکی زبان سدھر گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ آگے کے سفر کی باتیں ہوں نلنی جیونت اور وریندر ڈیسائی نے 1945 میں شادی کی۔وریندر ڈیسائی شادی شدہ تھا اور اُسکی پہلی بیوی سے کئی بچے تھے۔وہ عمر میں بھی نلنی جیونت سے کافی بڑا تھا۔نلنی جیونت اُس وقت انیس سال کی تھی۔اس شادی سے ڈیسائی خاندان میں بھونچال آگیا۔وریندر ڈیسائی کے پریوار نے اُسے اپنی جائیداد سے بے دخل کردیا اور نلنی جیونت کے تمام معاہدے رد کردئے گئے جو اُسنے نیشنل اسٹوڈیو اور امر پکچرس کے ساتھ کئے تھے۔یہ دونوں کمپنیاں چمن بھائی ڈیسائی کی تھیں۔نلنی نے ششی دھر مکھرجی کی کمپنی فلمستان کے ساتھ معاہدہ کیا اور وہ ملاڈ کے ایک کرایے کے بنگلے میں منتقل ہوگئے جو کہ فلمستان اسٹوڈیو کے بالکل قریب تھا۔ششی دھر مکھرجی ایک منجھا ہوا فلمساز تھا۔نلنی جیونت سے جو بہت بڑی بھول ہوئی وہ یہ کہ اُسنے ششی دھر مکھرجی سے معاہدہ کرتے وقت یہ شرط رکھی کہ وہ اُنہی فلموں میں کام کرے گی جن کو اُسکا شوہر ڈائرکٹ کرے گا۔ششی دھر مکھرجی نے تین فلموں کا اعلان کیا۔یہ فلمیں تھیں''شکاری''،''سفر''اور''آٹھ دن''۔ان تینوں فلموں میں نہ ہی وریندر ڈیسائی تھا اور نہ ہی نلنی جیونت۔ان فلموں میں ویرا، پارو اور شوبھا ہیروئنوں کا مرکزی کردار ادا کررہی تھیں جب کہ اتنی خوبصورت ہیروئن بیکار بیٹھی تھی جس نے بہت کم عرصے میں بے پناہ شہرت حاصل کی تھی۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ نلنی جیونت سے معاہدہ بند کرنے کے پیچھے اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی منظور نظر نسیم بانو کے لئے راستہ ہموار کرنا چاہتے تھے جسے وہ''چل چل رے نوجوان''سے متعارف کرنا چاہتے تھے۔نلنی ہی ایک ایسی ہیروئن تھی جو اُسے ٹکر دے سکتی تھی۔ششی دھر مکھرجی نے ان دونوں کو دو ہزار کے ماہانہ تنخواہ پر رکھ لیا تھا۔ششی دھر مکھرجی نے ان دونوں کو دو سال تک بغیر کسی کام کاج کے بٹھا کے رکھ دیا۔نلنی جیونت کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا مگر اب پچھتانے سے کیا فائدہ تھا۔دو سال میں لوگ نلنی جیونت کو بھول گئے۔کسی کو اُسکا نام بھی یاد نہیں رہا۔ان دو سالوں میں اُسکی ایک فلم ریلیز ہوئی جو کہ وینس پکچرس کی''پھر بھی اپنا ہے''یہ فلم بزنس کے لحاظ سے ناکام رہی۔لوگوں کی بے اعتنائی اور اس قدر لمبی بیکاری نے ان دونوں کو زندگی سے بیزار کردیا۔یہ وہ دور تھا جب نلنی جیونت اور وریندر ڈیسائی دنیا کو دکھانا چاہتے تھے کہ وہ بہت خوش ہیں مگر اندر سے وہ مایوسی اور تناؤ کا شکار ہوکر بری طرح ٹوٹ گئے تھے۔

انکی یہ شادی کامیاب نہ رہی۔نلنی جیونت نے اپنے ہاتھوں سے اپنا کیریر تباہ کردیا تھا۔وریندر ڈیسائی بھی اب اس شادی سے اوب چکا تھا۔وہ بیکار ہوکے رہ گیا تھا۔آخر یہ شادی 1948 میں یعنی تین سال کے بعد ٹوٹ گئی۔ادھر ششی دھر مکھرجی کے معاہدے کی مدت بھی ختم ہوچکی تھی۔وہ جونہی اس بندھن سے آزاد ہوئی تو اُسمیں خوداعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔شادی ٹوٹتے ہی اُسکے دروازے کھل گئے۔اُسنے ایک گجراتی فلم''وارث دار''کی جس نے باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا۔اسی فلم کی کامیابی دیکھ کے اُسے فلم''انوکھا پیار''میں سائن کیا گیا۔اسمیں اسے دلیپ کمار اور نرگس کے ساتھ پیش کیا گیا۔یہ فلم بیحد کامیاب رہی اور اس فلم نے نلنی جیونت کو ایک نئی پہچان دی۔کجراری آنکھوں والی نلنی جیونت جس کا چہرہ ہی نہیں آنکھیں بھی بولتی تھیں۔''انوکھا پیار''کے علاوہ اُسنے''گنجن''اور''چکوری''میں بھی کام کیا جس میں اُسکا ہیرو بھارت بھوشن تھا۔اُسکے بعد آئی''ہندوستان ہمارا''جو دیوآنند کی پہلی فلم تھی اور جسے پی ایل سنتوشی نے ڈائرکٹ کیا تھا۔پھر آئی کشور کمار کے ساتھ''مقدر''اور''ساجن''۔ان میں سے بیشتر گانوں کو نلنی جیونت نے اپنی آواز دی تھی۔بدقسمتی سے''انوکھا پیار''کو چھوڑ کے باقی کی ان فلموں میں کوئی بھی فلم نلنی جیونت کے کیریر کو اُستوار نہ کرسکی۔

پھر ایک دن آیا جب نلنی جیونت کا سنہری دور شروع ہوا۔فلمستان کی فلم''سمادھی''نے نلنی جیونت کو عزت وشہرت سے ہمکنار کردیا۔اس فلم میں اُسکا ہیرو اشوک کمار تھا۔گورے گورے او بانکے چھورے کبھی میری گلی آیا کرو اسی فلم کا وہ صدابہار گانا تھا جس نے نلنی جیونت کے کیریر کو رفعت بخشی۔اسکے ہدایت کار رمیش سہگل تھے اور اسے سنگیت سے سی رامچند رنے آراستہ کیا تھا۔اس میں ششی کپور نے بال کلاکار کے طور کام کیا تھا۔یہ فلم 1950 میں ریلیز ہوئی۔اسی سال اُسکی ایک اور فلم کامیاب ثابت ہوئی جس کا نام''سنگرام''تھا۔یہ فلمالیہ کی فلم تھی اور

اسے ششی دھر مکھر جی کے بھائی گیان مکھر جی نے ڈائرکٹ کیا تھا۔اس فلم میں بھی نلنی جیونت کے مدمقابل اشوک کمار تھا۔اس فلم میں اشوک کمار ایک منفی رول ادا کر رہا تھا۔اس فلم کو بھی اپنی مدھر دھنوں سے سی رامچند رنے سجایا تھا۔اس میں ششی کپور نے اشوک کمار کے بچپن کا رول ادا کیا تھا۔اس فلم کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ یہ گورو دت کی بحیثیت معاون ہدایت کار آخری فلم تھی۔نلنی جیونت بہت بے باک اداکارہ تھی۔بمبئی بھاشا میں ایسے لوگوں کو بنداس کہا جاتا ہے۔اس فلم میں اُسنے پہلی مرتبہ سوئمنگ سوٹ پہن کے شاٹ دیا تھا جس نے انڈسٹری کو حیرت ذدہ کر کے رکھ دیا تھا۔اس قسم کے بے باک شاٹ دینا اُن دنوں کافی اہمیت رکھتا تھا ۔نلنی جیونت کھلی ڈھلی لڑکی تھی۔وہ اُس زمانے میں بے خوف اپنے دوستوں کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔یعنی آج کی اصطلاح میں جنہیں بوائے فرینڈ کہا جاتا ہے ۔اسی سال دویندر گوئل کی فلم ''آنکھیں'' بھی نمائش کے لئے پیش کی گئی جسمیں نلنی جیونت کے علاوہ بھارت بھوشن اور ششیکھر کلیدی رول میں تھے۔اس فلم میں دویندر گوئل نے ایک نئے موسیقار کو چانس دیا تھا جس کا نام مدن موہن تھا جو بعد میں ایک عظیم موسیقار بن گیا۔

نلنی جیونت کا جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ایک کے بعد ایک فلم کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہی تھی۔وہ سب سے مصروف ترین ہیروئن تھی۔1951 سے لے کے 1961 تک اُسنے اکتالیس فلموں میں کام کیا۔ ''بھائی کا پیار''''ایک نظر''''جادو''''نند کشور''اور''نوجوان''۔''نوجوان'' ساحر لدھیانوی کی پہلی فلم تھی۔اسی فلم کا صدا بہار ''ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں''نلنی جیونت پر فلمبند ہوا تھا۔یہ سبھی فلمیں 1951 میں ریلیز ہوئیں۔پھر آئیں 'دو راہا''''جل پری''''قافلہ''''نو بہار''اور''سلونی''۔یہ فلمیں 1952 میں ریلیز ہوئیں۔1953 میں اُسکی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ایک ''راہی''اور دوسری ''شکست''۔''راہی''کے ہدایت کار خواجہ احمد عباس تھے۔اس فلم میں دیو آنند کے ساتھ بلراج ساہنی بھی کلیدی رول میں تھا۔اسکے موسیقار انل بسواس تھے۔ ''شکست''رمیش سہگل کی ہدایت میں بننے والی فلم تھی۔وہ اس فلم کے فلمساز بھی تھے۔اس میں نلنی جیونت کے مدمقابل دلیپ کمار تھا۔اسے اپنی مدھر دھنوں سے شنکر جے کشن نے آراستہ کیا تھا۔1954 اسکے لئے مصروف ترین سال رہا۔اس سال اُسکی چھ فلمیں ریلیز ہوئیں۔''باپ بیٹی''''کوی''''لکیریں''''محبوبہ''''ناز ''اور''ناستک''۔اشوک کمار نے نلنی جیونت کے ساتھ کل ملا کر دس فلمیں کیں۔ ''لکیریں''بھی نلنی جیونت کے ساتھ کی گئی فلموں میں سے ایک تھی۔اشوک کمار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن پر سینکڑوں لڑکیاں مرتی تھیں مگر وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔اگر کوئی اُن سے پیار کا اظہار کرتا تھا تو وہ اُس لڑکی کو اس طرح خجل کر دیتے تھے کہ دوبارہ وہ اشوک کمار کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہیں کر پاتی تھی۔ یہ نلنی جیونت تھی جس پر وہ اپنا دل ہار بیٹھے۔ہوا یوں کہ جب وہ پہلی بار ویندر ڈیسائی سے طلاق لینے کے بعد فلم کے سیٹ پر گئی تو اشوک کمار نے سب کے سامنے اُسے لتے لے لیا۔وہ اشوک کمار کے رویے سے سکتے میں رہ گئی۔اُسنے شوٹنگ کرنے سے تب تک انکار کر دیا جب تک کہ سیٹ پر ٹیکنیشنوں کو چھوڑ کے باقی سبھی لوگ باہر نہیں جائیں گے۔سیٹ کو خالی کرا دیا گیا۔اُسکے بعد شوٹنگ شروع ہوئی ۔دھیرے دھیرے پہلی تکرار پیار میں بدل گئی۔اشوک کمار شادی شدہ تھے اور ششی دھر مکھر جی اُنکے بہنوئی تھے۔وہ نلنی جیونت کے ساتھ نیپال بھاگ جانا چاہتے تھے اور وہاں سے فلائٹ پکڑ کر لندن جا کر شادی کرنا چاہتے تھے۔اشوک کمار کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں تھی۔تین سال تک اُنکا معاشقہ خاموشی سے چلتا رہا۔جب اس بات کی سن گن ششی دھر مکھر جی کو لگی تو اُنہوں نے اشوک کمار کو تنبیہ کی کہ اگر اُس نے اس طرح کا کوئی قدم اُٹھایا تو وہ کہیں کا نہیں رہے گا۔دھمکی کام کر گئی اور اشوک کمار نے نلنی جیونت کا خیال دل سے نکال دیا۔

1955 بھی نلنی جیونت کا مصروف ترین سال رہا۔اس سال اسکی سات فلمیں ریلیز ہوئیں۔''چنگاری''''جے مہادیو''''لگان''''منیم جی''''راج کنہیا''اور''ریلوے پلیٹ فارم''۔''ریلوے پلیٹ فارم''سنیل دت کی پہلی فلم تھی ۔اس فلم کو لکھا اور ڈائرکٹ کیا تھا رمیش سہگل نے۔

پر بھودیال ایک اداکار اور معاون ہدایت کار تھا۔فلم ''منیم جی''میں پر بھودیال بھی ایک چھوٹا موٹا رول ادا کر رہا تھا۔نلنی جیونت کا اس بار پر بھودیال پر دل آ گیا۔وہ بھی نلنی جیونت کو چاہنے لگا تھا۔پر بھودیال نے کل گیارہ فلموں میں اداکاری کی۔ان میں زیادہ تر فلمیں اسنے دیو آنند کے ساتھ کیں۔وہ معاون ہدایت کار بھی تھا۔اُسنے پانچ فلموں میں بطور معاون ہدایت کار کے طور پر کام کیا جن میں ''فرار''''کالا پانی''''ہم دونوں''''تیرے گھر کے سامنے''اور''گیمبلر'' سبھی فلمیں دیو آنند کی تھیں۔فلم ''امر رہے پیار''کے دوران ان دونوں نے شادی کر ڈالی۔اُسنے کئی ساری فلمیں پر بھودیال کے ساتھ کیں مگر سب سے زیادہ فلمیں اُسنے اشوک کمار اور اجیت کے ساتھ کیں۔اشوک کمار کے ساتھ دس اور اجیت کے ساتھ گیارہ فلمیں۔دلیپ کمار اور دیو آنند نلنی جیونت کی بے پناہ صلاحیتوں کے قائل ہو چکے تھے۔اُنکا ماننا تھا کہ نلنی جیونت ایک بے مثال اداکارہ ہے۔وہ بہت بڑی ہیروئن ہونے کے باوجود لوگوں سے بہت جلد گھل مل جاتی تھی۔ہیروئنوں جیسے ناز ونخروں سے وہ بالکل مبرا تھی۔اُسمیں کام کرنے کا جنون تھا۔فلم ''کالا پانی''میں وہ ایک طوائف کا رول ادا کر رہی تھی۔یہ رول خاصا مشکل تھا کیونکہ اس میں کئی مجرے تھے۔یہ مجرے اُسے لچھو مہاراج کی زیر ہدایت ادا کرنے تھے۔اُسنے خوب محنت کی اور اس خوبی سے یہ مجرے ادا کئے کہ اُس سال اُسے اس فلم کے لئے فلم فیر ایوارڈ سے نوازا گیا۔''کالا پانی''اور''درگیش نندنی''میں مرکزی کردار میں نہ ہوتے ہوئے بھی اُسنے اپنی اداکاری کی لاجواب صلاحیتوں کے بل بوتے پر ہیروئنوں پر سبقت حاصل کی۔''درگیش نندنی''بنکم چندر چٹو پادھئے کے ناول پر مبنی ایک تاریخی رومانی فلم تھی جسمیں پردیپ کمار اور اجیت کے علاوہ بینا رائے مرکزی کردار میں تھی۔یہ پہلی فلم تھی جو اُس نے پردیپ

کمار کے ساتھ کی تھی۔اپنی دمدار اداکاری سے اُس نے ایک ناقابل فراموش کردار ادا کیا تھا۔یہ اُسکی فن کارانہ خوبیوں کا کمال تھا۔

شادی کے بعد نلنی جیونت نے فلمی دنیا کو الوداع کہا اور وہ گھر گرہستی کو سنوارنے میں جٹ گئی۔اُسکی آخری فلم ''بمبئی ریس کورس'' کے ریلیز ہونے کے بعد وہ اٹھارہ سال تک فلموں سے دور رہی۔اٹھارہ سال کے بعد اُسکی ایک فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''ناستک'' تھا۔اس فلم میں وہ امیتابھ بچن کی ماں بنی تھی۔وہ اس فلم میں کام کر کے کافی ناخوش تھی۔اُسکا کہنا تھا کہ جو رول اُسے سنایا گیا تھا وہ سب کچھ تو فلم میں تھا ہی نہیں۔اسنے اُسکے بعد فلموں میں کام کرنے سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی۔

2001 میں اُسکے شوہر پربھو دیال کا انتقال ہو گیا۔اسکے بعد نلنی جیونت اکیلی رہ گئی۔چمبور میں اُسکا ایک عالیشان بنگلہ تھا جسمیں وہ اکیلی اور تنہا رہتی تھی۔وہ اشوک کمار کے بالکل پڑوس میں رہتی تھی مگر دونوں پاس ہو کے بھی بہت دور تھے۔قریب میں ہی اُسکے بھتیجے رہتے تھے جو اُسے اکثر دیکھنے آجایا کرتے تھے۔

اُسنے کچھ ایسی فلمیں بھی کیں جو اُسکی شایانِ شان نہیں تھیں جن میں ''ریلوے پلیٹ فارم''،''گرلز ہوسٹل''اور''بمبئی ریس کورس'' جیسی فلمیں ہیں جنھوں نے نلنی جیونت کے شہرت کے گراف کو کافی نیچے گرا دیا۔جس طرح کے رول اُسنے فلم''انوکھا پیار''،''ناستک''اور''ملن'' میں ادا کئے تھے، یہ وہ فلمیں تھیں جنھوں نے نلنی جیونت کو کامیابی اور کامرانی کی معراج پر لا کھڑا کر دیا تھا۔

ایک بار ایک صحافی نے نوتن سے پوچھا کہ وہ نلنی جیونت کے بارے میں کیا سوچتی ہیں تو جواب میں نوتن نے کہا کہ وہ اس بات پر فخر محسوس کرتی ہے کہ وہ نلنی جیونت کی رشتہ دار ہے۔نلنی جیونت نے پچیس سالہ کیریر میں کل اکسٹھ فلموں میں کام کیا۔اُسے سب کچھ ملا دولت عزت شہرت مگر خوشی بہت کم ملی۔اُسے مسرتوں سے کہیں زیادہ حسرتیں ملیں۔اُسنے دو دو شادیاں کیں۔اُسے اولاد کی خوشی نہیں ملی۔وہ ساری زندگی بانجھ بن کر رہی۔وہ ہر دم اُداس اور افسردہ نظر آتی تھی۔بچپن سے لے کے بوڑھاپے تک اُس نے اپنے دل میں غموں کو پالا۔کہا جاتا ہے کہ بچپن میں شوبھنا سمرتھ اُسے پسند نہیں کرتی تھی اور اُسکی بلاوجہ پٹائی کر دیتی تھی جس پر اُسکے گھر والے احتجاج کرتے تھے۔بھائیوں کو بھی اُس کا فلموں میں کام کرنا پسند نہیں تھا جس وجہ سے وہ ہمیشہ اُس سے بیزار رہتے تھے۔اُسنے پربھو دیال سے دوسری شادی کی۔یہ سوچ کر کہ وہ اُسکے دل کے گھاؤ بھر دے گا۔اُسنے نلنی کو چھوڑ کر شراب کی بوتل سے لو لگائی۔نلنی کی عمر ڈھلتی جا رہی تھی۔اُس کے پاس پرڈیوسروں نے آنا چھوڑ دیا۔اُسکا وقت چلا گیا تھا۔انڈسٹری میں نئی نئی جوان ہیروئنیں آچکی تھیں اسلئے نلنی جیونت کو انڈسٹری نے بھلا دیا۔اس انڈسٹری کی یہ روایت رہی ہے کہ یہاں چڑھتے سورج کی سبھی پوجا کرتے ہیں۔ڈوبتے سورج کی طرف کوئی دیکھنا نہیں چاہتا۔پربھو دیال سے شادی کر کے وہ خوش نہیں تھی۔اُسے بعد میں احساس ہونے لگا تھا کہ یہ ایک ناکام بندھن تھا جسے وہ زبردستی نبھا رہی تھی۔سب سے بڑا دکھ اُسے اس بات کا تھا کہ دو دو شادیوں کے باوجود وہ ماں نہ بن سکی۔شوبھنا سمرتھ کی طرح وہ اتنی خوش قسمت بھی نہیں تھی کہ اُسکے شوہر کی موت کے بعد اداکار موتی لال اُسکی زندگی میں چلا آیا اور اُسے اکیلے پن کا احساس ہونے نہیں دیا۔یہی وجہ ہے کہ وہ انسانوں سے زیادہ کتوں سے پیار کرتی تھی۔وہ بائیس سال تک دنیا سے چھپی رہی۔اگر کوئی فلمی صحافی اُس کا انٹرویو لینے آتا تھا تو وہ اُن سے کہتی تھی کہ وہ نلنی جیونت نہیں ہے اور اُنہیں خالی ہاتھ لوٹا دیتی تھی۔بائیس سال کے بعد وہ گھر سے باہر آئی وہ بھی اُس دن جب دادا صاحب پھالکے اکیڈمی نے اُسے ''لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ'' دینے کا فیصلہ کیا یہ تقریب بھائی داس ہال ولے پارلے میں منعقد کی گئی تھی اور اسکا اہتمام دادا صاحب پھالکے کے ایک سوچھتیسویں جوبلی فنکشن کے طور پر کیا گیا تھا۔تاریخ تھی 30 اپریل 2005۔نلنی جیونت کو بہت کچھ ملا مگر حقیقی پیار نہیں ملا۔وہ ایک کٹی پتنگ کی طرح پیار کی تلاش میں بھٹکتی رہی۔

وہ مری بھی تو کیسے مری۔سرہانے کوئی نہیں تھا، نہ کوئی نام لیوا نہ پانی دیوا۔تین دن تک اُسکی لاش بنگلے میں پڑی رہی۔تین دن تک اُسکے پالتو کتے مسلسل بھونکتے رہے۔اُسکے پڑوسیوں نے پولیس کو مطلع کیا۔پولیس آگئی اور اُسکی لاش کو ایک مینوسپلٹی وین میں ڈال کر لے گئی اور پھر اُسکے ایک رشتہ دار نے اُسکا داہ سنسکار کیا۔یہ خبر جب انڈسٹری میں پھیل گئی تو ہر طرف غم واندوہ کی لہر دوڑ گئی۔وہ حسن کی دیوی، وہ مرمریں پیکر، وہ لاکھوں کروڑوں دلوں کی ملکہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے چلی گئی تھی یہ کہتے ہوئے، جیون کے سفر میں راہی ملتے ہیں بچھڑ جانے کو۔اور دے جاتے ہیں یادیں تنہائی میں تڑپانے کو۔(فلم منیم جی)

''تِل وِل''

جسم کے مختلف حصوں پر موجود تل انسانی شخصیت کے بارے میں بہت سے دلچسپ حقائق بتاتے ہیں مثلاً جن افراد کی گردن پر تل ہوتا ہے وہ بہت مضبوط شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔جن کے بازو پر تل ہو وہ اچھے فیصلہ ساز ہوتے ہیں۔جن افراد کی انگلی پر تل ہوتا ہے وہ زندگی کی شروعات میں پریشانیوں کا سامنا کر سکتے ہیں۔کان پر تل والے لوگ قابلِ اعتبار اور ہمدرد سمجھے جاتے ہیں۔جن لوگوں کی بھنوؤں پر تل ہو وہ لیڈرانہ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ناک پر تل والے لوگ عام طور پر غصیلے، خودغرض اور اَنا پرستی کا شکار ہوتے ہیں۔جن لوگوں کے چہرے پر تل ہوتا ہے وہ بہت زیادہ خوداعتماد ہوتے ہیں اور اکثر خوشگوار زندگی بسر کرتے ہیں۔گال پر تل والے احباب حساس اور شرمیلے ہوتے ہیں۔جن کے سینے پر تل ہو وہ عیش وآرام کے دلدادہ اور سست الوجود واقع ہوتے ہیں اور جن افراد کے ہونٹوں پر تل ہو وہ آرٹ لَور اور اچھے دوست ثابت ہوتے ہیں۔

رس رابطے

جستجو،ترتیب،تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

چہارسورنگ پیارے گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

چہارسو کی ادبی قدر و قیمت ذوقِ مطالعہ کا مقدر ہے۔ہم اس سے شادکام ہوتے ہیں۔اب کے راحت اندوری کی شاعری نے''محوِ حیرت جلوہ'' کر دیا۔ ماشاءاللہ خوب کلام ہے۔ان کا یہ شعر''مشاعرہ لُوٹ'' قسم کا ہے۔قریب قریب سارے ہی شعر اچھے ہیں:

اندھیرے چاروں طرف سائیں سائیں کرنے لگے
چراغ ہاتھ اٹھا کر دعائیں کرنے لگے

مخدوم محی الدین کی غزل سادہ اور پُرشکوہ ہے۔بڑا شاعر آخر بڑا ہوتا ہے۔چہارسو کی شاعری دامنِ دل کو چُھو لینے والی شاعری ہے۔آپ مجھے عزت دیتے ہیں یہ آپ کا خلوص ہی تو ہے۔آپ نے کرسی نشیں کیا ہے وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے۔مضمون اور افسانہ کا باب بدستور عمدہ ہے۔آغا گل افسانے میں استعجاب کے پیدا کار ہیں۔ان کے ہاں نیا پن منٹو کے پیرایۂ تعجب کے راستے سے آیا ہے۔خطوط میں یوگیندر بہل تشنہ،اسد عباس خان،نوید سروش اور ابراہیم عدیل نے ناچیز کو بطرز خوب یاد کیا ہے۔اسد عباس خان کے بوئی والا بابا کے بھی خوب رہی۔اسد عباس خان جھنگ کی آب وہوا کے سوہنے من موہنے ہیں اُن کے کیا کہنے۔دیپک کنول نے فلمی دنیا کے ستاروں کی روشنی سے ہمیں خوب مستفید کیا ہے۔شمی کپور بڑے اسٹار تھے اور ان کی اداکاری کو مقبولِ عام حاصل تھا۔آخیر میں انہوں نے ٹی وی ڈراموں میں بھی خوب رنگ جمایا۔

آصف ثاقب (بوئی،ہزارہ)

محترم گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

مشہور و مقبول شاعر جناب راحت اندوری اپنے بامعنی اور پُر اثر کلام کی گھن گرج کی وجہ سے مشاعروں کے بے تاج بادشاہ کے طور پر جانے جاتے ہیں۔''چہارسُو'' شمارہ جنوری فروری ۲۰۱۹ء ان کے نام منسوب کرکے اُن کی ادبی خدمات کو بجاطور پر خراجِ تحسین کیا گیا ہے۔

حسب معمول شمارہ گوناگوں ادبی تحریروں سے مزین ہے۔''درد کی زنجیر'' میں سیما پیروز نے ایک حساس مسئلہ کو بخوبی اجاگر کیا ہے جو اخلاقی پستی اور بے حسی کی داستان ہے۔دولت مند خاتون نے ایک خوبصورت تعلیم یافتہ مگر غریب و مجبور لڑکی کی شادی اصل حقائق راز میں رکھ کر اپنے نوجوان اور ہم جنس پرست بیٹے سے کروا کر ایک معصوم زندگی کو زندہ درگور کر دیا۔

اسرار گاندھی نے اپنے دلچسپ افسانہ''مفاہمت کا عذاب'' میں ایک ایسے جوڑے کا قصہ بیان کیا ہے جو ایک ساتھ ملازمت کرنے کے دوران سطحی جذبات اور تعلقات کے تحت اظہار محبت اور شادی کر بیٹھے لیکن شادی کے بعد عملی زندگی میں جب ایک دوسرے کی اصلی عادات واطوار کے علاوہ جذبۂ برداشت، ایثار اور غصہ کرنے یا درگزر کرنے کے معاملات سے واسطہ پڑا تو علیحدگی یا مفاہمت کے عذاب کے ساتھ زندگی گزارنے کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہ ایک سبق آموز کہانی ہے۔

رومانہ رومی نے افسانہ''اُف یہ برگرز'' میں دولت کمانے کے لالچ میں معاشرے میں موجود بےضمیر افراد میں سے ایک''ماہر امراض جلد'' کا تذکرہ کیا ہے جو معصوم لڑکیوں کو ضرورت اور افادیت کا تعین کئے بغیر ایسی مہنگی دوائیاں تجویز کرتا ہے جو اُس کے مخصوص میڈیکل سٹور پر ہی دستیاب ہوتی ہیں اور پھر ضمیر کی خلش کے بغیر اپنی کامیاب حکمتِ عملی پر خوشی اور لطف حاصل کرتا ہے۔

شموئل احمد کا افسانہ''لو جہاد''(Love Jehad) پڑوسی ملک میں رہنے والی اقلیتوں کی حالتِ زار کی تصویر ہے جہاں مذہبی منافرت اور انتہا پسندی میں ملوث نوجوانوں اور بعض سیاسی پارٹیوں نے ان کی زندگی اذیت ناک بنا رکھی ہے۔کبھی گئو ماتا اور کبھی کسی اور الزام کے تحت انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے اور حکومت یا معاشرہ اس صورتِ حال کو کنٹرول نہیں کر سکا۔کاش گئو ماتا کے علاوہ انسانوں اور جانوروں کے ساتھ بھی رحمدلانہ سلوک کیا جائے۔

نازیہ پروین نے''دوڑ پیچھے کی طرف'' کے عنوان سے قدیم تہذیبوں اور آثارِ قدیمہ کے بارے میں دلچسپ اور معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ انسان یہ جاننے کے لیے ہمیشہ سے کھوج میں لگا رہا ہے کہ ہزاروں سال پہلے زمین پر زندگی اور تہذیب کس صورت میں موجود تھی۔یقیناً قارئین کے لیے اس بارے میں مزید معلومات باعث دلچسپی ہوں گی۔

یرقان(Hepatitis) کے بارے میں ڈاکٹر فیروز عالم کا عام فہم اور معلوماتی مضمون قارئین کے لیے بہت مفید ہے کیونکہ لاعلمی اور معمولی بے احتیاطی سے کئی نارمل لوگ اس موذی مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

توصیف بریلوی نے''پیزا بوائے'' کے نام سے ایک کہانی تخلیق کی ہے جو جنسی بے راہ روی کا افسوسناک،شرمناک اور عریاں منظر نامہ ہے۔اگر ادیب اپنا قیمتی وقت ایسی تحریروں پر صرف کرے جو باعث تفریح،سبق،عبرت، معلومات یا مثبت اور بامقصد پہلوؤں پر مشتمل ہوں تو یہ واقعی ادب کی خدمت ہوتی ہے۔لیکن حد سے زیادہ عریانی پر مشتمل بے مقصد تحریریں وقت کا ضیاع اور باعث کراہت ہوتی ہیں جو ذہنی کوفت کا سبب بنتی ہیں۔''چہارسُو'' ایک معیاری جریدہ ہے جسے گھروں میں اکثر افراد بشمول خواتین دیکھتی اور پڑھتی ہیں لیکن ایسے افسانے کسی صورت بھی معیار کی بہتری کا باعث نہیں بنتے۔ادارتی ٹیم سے درخواست ہے کہ اس پہلو پر نظر رکھتے ہوئے احتیاط کی جائے۔

آغا گل صاحب کی تحریر''فٹ پاتھ جج'' افسانہ سے زیادہ ایک سیاسی مضمون ہے جس میں انہوں نے فرضی کرداروں کے بجائے اصلی نام لکھ کر اپنی سوچ کی عکاسی کی ہے مثلاً گورنر بلوچستان رئیسانی، وزیر تعلیم مگسی، وائس چانسلر کرار حسین، ممبر سنڈیکیٹ ڈاکٹر مالک کانسی اور وہ خود بطور محکمہ ڈاک کے ایک سابقہ افسر وغیرہ وغیرہ۔ اس مضمون میں بہت سی ایسی قابل افسوس باتیں لکھی گئی ہیں جو انسانیت، مذہب، قوم، آئین پاکستان کے حوالہ سے توہین آمیز اور ناقابلِ قبول ہیں اور جنہیں پڑھ کر دلی دکھ ہوا۔ ذیل میں اپنے تاثرات کے ساتھ ان کی تحریر کے کچھ اقتباسات درج ہیں۔

مذہب: نماز کی ادائیگی کے موقع پر اللہ اکبر کے الفاظ سے اذان دی جاتی ہے جس کے معنی اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ کائنات کی عظیم ترین ہستی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ذیل میں اس حوالے سے اقتباس درج ہے۔

''ایک بار ہم واک کر رہے تھے مغرب کی اذان فضا میں بلند ہوئی۔ بابا (جن کا نام محمد اکبر تھا اور اُن کے ہم نام محمد اکبر مصنف کے والد صاحب کا نام بھی تھا) نے رک کر اذان سنی اور کہا دیکھو مولوی میرا نام لے رہا ہے۔''

آئین: ''قرارداد مقاصد'' آئین پاکستان کا حصہ ہے لیکن یہ الفاظ پڑھیے:

''محمود غزنوی کی طرح مولوی بھی بلوچستان پر حملے کئے جا رہے تھے۔ قرارداد مقاصد تو گویا ان کی پہلی قلعہ بندی تھی۔'' ایک اور جگہ یوں تحریر کیا ہے۔ ''ہم نے کرشن بھگوان کی بانسریوں کو مسواک بنا لیا'' (سینکڑوں سال پہلے جب ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ کی انڈسٹری موجود نہیں ہوتی تھی تو مسلمانوں نے دانت اور منہ کی صفائی کے لیے مسواک کا استعمال شروع کیا تھا۔ آج کچھ ٹوتھ پیسٹ بنانے والی کمپنیاں اس میں مسواک بھی شامل کر رہی ہیں جیسے کولگیٹ وغیرہ۔ یہ طنز بھی بلا جواز اور غیر مناسب ہے ایک اور جگہ تینوں صوبوں سندھ، پنجاب اور خیبر پختونخواہ کے لیے انتہائی توہین آمیز جنسی الفاظ کے ذریعہ امریکی سفیر کے ساتھ گفتگو کا ذکر کیا گیا ہے۔ قلم اجازت نہیں دیتے کہ دوبارہ یہ الفاظ تحریر کیے جائیں۔ قارئین مضمون پڑھ سکتے ہیں ساتھ لکھتے ہیں ''بابا کا چہرہ تورا بورا بن گیا، وزیرستان بن گیا، بلوچستان کی مانند ویران اور لاوارث ہو گیا۔''

بلوچستان پاکستان کا اہم صوبہ ہے جو گوادر، سی پیک اور دوسرے ترقیاتی منصوبوں کے باعث تیز رفتار ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ عوام کے منتخب نمائندے صوبائی اسمبلی، وزیر اعلیٰ اور کابینہ کے ذریعہ آزادی کے ساتھ امورِ حکومت کے نگران ہیں اور پوری پاکستانی قوم اور مسلح افواج اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت کے ساتھ ان کی پُشت پر کھڑی ہیں۔ گو کہ بیرونی دشمنوں کی ایجنسیاں شروع سے قوم کی تفریق اور تقسیم کے لیے کوشاں رہتی ہیں لیکن وقت بدل چکا ہے انشاء اللہ انہیں ناکامی ہوگی۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات کے طور پر بہترین شکل و صورت اور صلاحیتوں کے ساتھ تخلیق کیا ہے جس کے لیے ہم اُس کے بے حد شکر گزار ہیں (اس کا ذکر قرآن کی سورہ التین آیت ۴ میں کیا گیا ہے) ارشاد ہے:

''بلا شبہ ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔''

اس کے علاوہ بہت سے دیگر جانور بھی مختلف اشکال میں پیدا کیے گئے ہیں جن سے ہم سواری، بوجھ اٹھانے اور دیگر فوائد مثلاً دودھ، گوشت وغیرہ حاصل کرتے ہیں۔ ارشاد ہے ''گھوڑے، خچر اور گدھے اسی نے پیدا کیے تاکہ ان پر سواری کرو'' (سورہ نحل۔ آیت ۸) ایک دوسری جگہ ارشاد ہے ''اور اپنی آواز میں نرمی پیدا کر۔ بلاشبہ سب آوازوں میں بُری آواز گدھے کی آواز ہے'' (سورہ لقمان۔ آیت ۱۹) اس پس منظر کے بعد مصنف کے مضمون کا اقتباس یوں ہے:

''گدھا ایک غیرت مند جانور ہے۔ مرد سے برتر ہے، جس کے باعث وہ مرد کے آگے چلتا ہے جبکہ تمام مویشی مردوں کے پیچھے آتے ہیں۔ مرد بھی جانتے ہیں کہ گدھے ان سے اعلیٰ و ارفع ہیں۔'' مضمون میں تمام برگزیدہ ہستیوں میں سے کسی کو بھی نہیں بخشا گیا۔ اس سے زیادہ انسانیت کی اور کیا تذلیل ہو سکتی ہے۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

قومی لباس ہر قوم کی ایک شناخت ہوتی ہے جس کا احترام لازم ہے اور اس کا تمسخر کسی طور بھی زیب نہیں دیتا۔ عرب ممالک، ہندستان، پاکستان اور افریقہ میں مختلف قومی لباس اپنی ضرورت اور روایات کے تحت پہنے جاتے ہیں لیکن مصنف نے اپنے مضمون میں کیا تحریر کیا ہے، پڑھیے:

''(بابا) شرٹ نیکر پہن کر جو باہر نکلتے تو سپاہی نہ جانتے ہوئے بھی سیلوٹ کرتے کہ کوئی افسر جا رہا ہے۔ شلوار کلچر بعد میں آیا۔ شلوار قمیص نہایت ہی غیر شاعرانہ لباس ہے۔ ایک بوری گلے میں پہن لی جاتی ہے۔ دو بوریاں کمر سے باندھ لی جاتی ہیں۔ یہ ہوئی شلوار قمیص۔ آگے لکھتے ہیں ''یہی ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص قومی مزاج کو بھی تھیلوں کی مانند بے ڈھنگا بنا گئے''

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال، قائد اعظم محمد علی جناح اور برصغیر کے دیگر بڑے لیڈر مثلاً جواہر لعل نہرو یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن لوٹے لیکن لباس کے بارے میں کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں رہے اور قومی لباس کو ہی ترجیح دی۔ آپ اپنی پسند کا لباس ضرور پہنیں لیکن دوسرے کے لباس کا تمسخر اُڑانا کہاں کا انصاف ہے۔ اس تحریر سے بہت سے قارئین کے جذبات مجروح ہوئے ہیں اور اس کی اشاعت ہمارے لیے تکلیف دہ ہے۔

اسی شمارے میں شاعری کے حوالے سے بہترین کلام شامل کیا گیا ہے خاص طور پر افتخار عارف، پروین شیر، راحت اندوری، ناصر علی سید، کرشن گوتم، حنیف باوا، رضیہ اسماعیل، آصف ثاقب، شگفتہ نازلی اور عارف شفیق کا کلام قابلِ ذکر ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

محترم گلزار جاوید، آداب۔

چہارسو کا تازہ شمارہ (جنوری فروری ۲۰۱۹ء) موصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ، عمدہ تحریروں کے ساتھ تسکینِ ذوق کرتا

ہوا۔اس بار مسندِ قرطاسِ اعزاز پہ راحت اندوری جلوہ افروز ہیں۔بہت عمدہ کاوش ہے آپ کی۔راحت اندوری بہت نامور شاعر ہیں۔آپ کے انٹرویو نے ان کی ذات کے مخفی گوشے بھی دکھا دیئے ہیں ان کی شخصیت کے سبھی پہلو اجاگر کر دیے ہیں۔خوشبوئے دہن سے سرشار ہو کر افسانوں کی نگری میں قدم رکھا تو سبھی افسانے اچھے لگے ''لَو جہاد'' سے ''پُرابوائے'' تک سب افسانے اپنے اپنے انداز میں حالات و واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں۔اخلاص کی خوشبو اور بانسری کی صدا سے قصدِ زیارت تک کا سفر بھی خوب رہا۔آپ کا یہ اہتمام ہمارے ادبی ذوق و شوق کی تسکین بھی کرتا ہے اور مزید شوق بڑھاتا ہے۔اس بڑھاوے نے ہی فوری رس رابطے میں شامل ہونے کی تحریک دی ورنہ۔۔۔میں تو ہمیشہ سوچتی ہی رہ جاتی ہوں اور نیا چہارسو دسترس میں آجاتا ہے۔

تسنیم کوثر (لاہور)

میرے گلزار، خوش رہو۔

اس بار تو آپ نے پاکستان کے وزیراعظم عمران خان کے انداز میں کیا خوب چھکا مارا ہے۔راحت اندوری اردو شاعری کے اُسی طرح سپر سٹار ہیں جس طرح امیتابھ بچن فلموں کے سُپر سٹار ہیں۔راحت اندوری کی جرأت و بیباکی نے اردو شاعری کو نئی زندگی دی ہے جس کا ثبوت اردو مشاعروں کے بڑے بڑے اجتماعات پیش کر رہے ہیں۔

''براہِ راست'' میں بھی آپ نے روایت کو برقرار رکھتے ہوئے خوب دھواں دھار بولنگ کی مگر راحت اندوری نے بھی اپنے مخصوص انداز اور مزاج کے مطابق بھرپور جواب دے کر قارئین چہارسو کی عمدگی سے تشفی کی ہے۔

افسانوں میں شموئل صاحب نے ایک حساس موضوع کو افسانے میں ڈھال کر فرض کفایہ ادا کیا ہے۔سیما پیروز نے مشاق انداز میں پرانی شراب کو نئی بوتل میں پیش کر کے فنی لوہا منوایا ہے۔انل ٹھکر صاحب نے ڈرامے کے اندر معاشرتی ڈرامہ لکھ کر اپنے منفرد انداز اور برجستہ جملوں کو ہنرمندی سے برت کر جی خوش کر دیا۔

شاعری میں محمود الحسن، غالب عرفان، واصف حسین واصف، عارف شفیق نے تازگی اور ندرت کو خوب نبھایا ہے مگر عظیم بخت نے تو ایک طرح سے اردو شاعری میں نئی روح پھونک دی ہے۔حالات کے جبر نے اس نوجوان شاعر کو جس قدر توانائی دی ہے اگر وہ اس کو اسی انداز میں برتتے رہے تو بہت جلد ان کا مقام و مرتبہ بلند ہو جائے گا۔پروین شیر، تابش خانزادہ، فیروز عالم اور ڈاکٹر ریاض احمد کو میری طرف سے دعائیں اور مبارک باد کہیے سب نے اپنے اپنے قلم سے چہارسو کو سجانے سنوارنے میں حق ادا کر دیا۔

یوگیندر بہل تشنہ (یو ایس اے)

مدیرِ محترم، سلام و رحمت۔

تازہ چہارسو میں ''براہِ راست'' کے سوالات سے راحت اندوری سے شعری، تہذیبی و تخلیقی تناظر میں آگہی پائی۔اردو شاعری کی متنوع روایات کے پس منظر میں مشاعروں میں شعری شناخت وجۂ مقبولیت ہوئی جبکہ سہل پیرائے میں ظلم و جبر کے خلاف بغیر کسی مصلحت و مسلک آواز بلند کرنے کا عزم و حوصلہ بصورت پیام سامعین کے ذہنوں تک کامیاب رسائی کا وسیلہ بنا اور اُن کی شاعری کا طرۂ امتیاز رہا۔

آپ کے جرأت آمیز تیکھے ترچھے سوالات عہدِ موجود کی آواز بھی ہیں اور انفرادی و اجتماعی سطح پر حالاتِ حاضرہ کے ترجمان بھی جن کے جوابات میں کافی حد تک کامیاب رہے اور اپنے موقف کی تائید کلام سے بھی کرتے رہے۔ جس نے ان کے شعری مطمعٔ نظر کی معنویت کو مزید اجاگر کیا۔شام سے پہلے کے بعد چاند پاگل ہے، روشنی کی جنگ اور شیشے کا بدن نے منتخب اشعار اور غزلیہ کلام سے قلمی رونمائی و شناسائی بہم پہنچائی۔لچھے، ڈیجیٹل لائف، اُجڑا ہوا مکان، تانپورہ، قدیم ترین ہوٹل، خوشی اور سخن کدہ میں سے کچھ فلر قدرے عجیب و دلچسپ مگر زیادہ تر ادبی فلیور سے مخمور تھے۔

''غزل کے سارے جہان'' سے ''حرم میں نہ شوالوں میں'' تک کے مطالعے سے مختلف شاعرانہ جہات و ادبی خدمات کا علم ہوا جس کے مطابق انسانوں کے مابین جذبۂ محبت شعری تقویت کا باعث بنتا ہے مزید براں بقول ان کے ''میری غزل یا تو میرے لیے ہوتی ہے یا میرے سامعین کے لیے'' اس بے نیازانہ تخصیص کا اشعار میں ذکر بھی ہے پھر یہ کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے میں کسی گھماؤ یا پیچ کے قائل نہیں بالخصوص اُن کا لہجہ شناخت کا امتیازی ذریعہ اور طرزِ ادا کا غیر معمولی انداز ہے اور ان کے یہاں دورخی نہیں قول و فعل میں تضاد کے بغیر زندگی سے قریب، کربِ ذات سے زیادہ ذکر کائنات سے منسوب رہے۔ ایسے بیباک، پُرخلوص و نڈر شاعر کے لیے ہر سطح پر تحسینی کلمات سے پذیرائی ہونی چاہیے۔اور یہ بھی کہ کسی بڑے ادیب یا ناقد کی کمی سوشل میڈیا، یوٹیوب، گوگل، فیس بک، ٹویٹر نے کلام و ویڈیو محفوظ کر کے پوری کر دی ہے ان کی شاعری ایسا جامِ جم ہے جس میں منفی و مثبت پہلوؤں کا موثر اظہار ملتا ہے اور کلام کی غزلوں میں آج کی انسانی زندگی کی گونج ہے جو نمایاں طور پر سنائی دیتی ہے تاہم نقد و نظر کی مزید روشنی میں کلام کا سخن مستقبل میں کھل کر سامنے آئے گا۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسوٗ'' کا تازہ شمارہ (جلد ۲۸، شمارہ جنوری فروری ۲۰۱۹ء) نظر نواز ہوا۔ہر شمارے کی طرح موجودہ شمارے نے بھی حیرانی اور خوشی کا سامان مہیا کیا۔قرطاسِ اعزاز راحت اندوری کے نام ہے۔پہلے پچیس تیس برسوں میں پاکستان میں اندوری صاحب کی شاعری بہت مقبول ہوئی ہے۔''براہِ راست'' میں آپ کے گہرے سوالات اور راحت صاحب کے مختصر اور ''احتیاط'' سے پُر جوابات نے اُن کی مجبوری ظاہر کر دی ہے۔وہ جو کچھ شاعری میں بیان کر رہے ہیں حوصلے کی بات ہے۔ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ سلوک افسوسناک

ہے۔ندافاضلی نے ''غزل کا سارا جہان'' میں اُن کی شاعری کو منفرد اور طاقتور قرار دیا ہے۔مضمون میں منتخب اشعار بھی لاجواب ہیں۔ڈاکٹر عرفان عزیز، ملک زادہ جاوید اور سراج نقوی کے مضامین راحت صاحب کے فکر وفن کی تفہیم کا بنیادی حوالہ ہیں۔فاری شاا اور افق دہلوی نے غزلیہ انتخاب زبردست کیا ہے۔اہم گوشہ ہے جو تادیر یاد رکھا جائے گا۔

انل ٹھکّر کا ڈرامہ ''پردہ اٹھاؤ'' نام ہی میں ایک گہری معنویت اور دلچسپی موجود ہے۔ڈرامہ بغیر اسکرپٹ کے کسی لفظ یا جملے سے شروع ہوسکتا ہے ایسا آغاز تھا جس سے دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ڈرامے میں ڈرامہ موجود ہے۔ خیال اور حقیت کے درمیان، رشتوں کا تقدس اور پھر کچھ کر گزرنے کی لگن، مکالمے چست، خوب۔ڈاکٹر فیروز عالم صاحب نے موجودہ قسط میں ہیپا ٹائٹس (یرقان یا پیلیا) کی حقیقت، سبب، بی اور سی کے مرض کا علاج، احتیاط تدابیر، اہم جان لیوا بیماری پر تحقیقی مواد کو آسان زبان میں بیان کیا ہے۔یہ تحریریں اردو دنیا میں منفرد اس لیے ہیں کہ سائنسی یعنی بیماریوں کے حوالے سے ہیں۔آغا گل ''فٹ پاتھ جج'' ہلکے پھلکے انداز میں شخصی افسانہ ہے کہانی میں سیاسی حقائق، طنز اور مفاد پرستی (بلیک میلنگ) کو خوبی سے پیش کیا ہے۔محترمہ سیما پیروز نے ''درد کی زنجیر'' پرانے مگر اہم موضوع پر نئے تقاضوں کے مطابق لکھا ہے۔اس افسانہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے سیما پیروز نے تحریر کیا ہے۔شموئل احمد کی جراتِ اظہار ''لَو جہاد'' میں نظر آیا۔ ہندوستانی سوچ اور سماجیات کے پس منظر میں لکھا جانے والی حقیقت سے قریب تر تحریر ہے، مذہب، عقیدے، رنگ ونسل کے نام پر انسانیت کی تذلیل خوف ناک ہے کہ انسان اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتا۔''اجگر'' کی تحریک آگے چل کر خوفناک صورتِ حال پیدا کرسکتی ہے ''جہاد'' کے نئے معنی بھی سامنے آئے ہیں۔یہ ہمارے عہد کا ترجمان افسانہ ہے۔

آصف ثاقب، محمودالحسن، غالب عرفان، عبدالرحمٰن عبد اور عارف شفیق کی غزلیں فنی پختگی اور روایت سے وابستہ ہیں۔عصری شعور بھی نمایاں ہے۔ عارف شفیق کی غزل کی ردیف ''شاعری ہے'' نے نئے نئے معنی کشید کیے ہیں۔

مسافر کی دعائیں دے رہی ہیں یہ گواہی
کسی رستے سے پتھر بھی ہٹانا شاعری ہے

شمارے میں نظموں کا حصہ جاندار بھی ہے اور متنوع موضوعات سے مزین بھی۔ پرویز شہریار کی ''جسم کے انڈیکس سے پرے'' ایک پُرکشش رومانی نظم ہے۔حنیف باوا، رضیہ اسماعیل اور رفیق سندیلوی کی نظم ''سے ہوگیا'' معنوی تہہ داری اور باطن سے مکالمہ کرتی تخلیق ہیں۔پروین شیر کی نظم ''زرد رو'' علامتی نظم ہے جس میں زندگی کا موت کی جانب سفر کی روداد ہے۔رس رابطے میں یوگیندر بہل تشنہ، ڈاکٹر فیروز عالم، حسن عسکری کاظمی اور نیئر اقبال علوی کے خط تنقیدی بصیرت کا اشاریہ ہیں۔

نوید سروش (میرپور خاص)

گلزار بھائی، السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

آپ کے حسنِ ادارت کا آئینہ دار ''چہارسُو'' کا ڈاکٹر راحت اندوری نمبر آج موصول ہوا تو طبیعت خوش رنگ ہوگئی۔راحت اندوری صاحب برصغیر کے ایسے مشہور ومعروف شاعر ہیں کہ جن کے نام پر اردو مشاعرہ ایک میلے کا روپ دھار گیا ہے۔تمام مضامین اور منتخب کلام قابلِ داد ہے بالخصوص راحت اندوری صاحب سے آپ کے سوالات اور راحت صاحب کے جوابات کمال ہیں۔تمام شمارہ آپ کی مثالی کاوشوں کا مظہر ہے۔خدا کرے کہ آپ کی یہ کاوش تادیر جاری و ساری رہے۔

ڈاکٹر انیس الرحمٰن (سکھر)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

ماہنامہ چہارسو کا ہر شمارہ اپنی عنایتوں کی مہک لٹاتا ہوا ہمارے غم کا مداوا بنتا ہے اور ہماری بے کراں نارسائیاں اور تنہائیاں چاہت کے پھولوں سے مہک اُٹھتی ہیں۔چہارسو اپنی بے مثال اور لاجواب روایتوں کا سلسلہ بہ احسن قائم رکھے ہوئے ہے۔جس شخصیت کے نام قرطاسِ اعزاز کی محفل سجتی ہے اس کا مقام ومرتبہ پہلے سے بھی اونچا ہو جاتا ہے۔اس مرتبہ کی شخصیت راحت اندوری شاعری کے میدان میں منفرد اور اعلیٰ اہمیت کے صاحبِ فن ہیں۔اُن کے بہت سے اشعار پڑھتے اور سنتے ہی دل میں ترازو ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ مجلّے میں شائع ہونے والا حمد یہ اور نعتیہ کلام دیرپا اثر رکھنے والا ہے۔ افسانوں کا انتخاب بہت محنت سے کیا گیا ہے۔سبھی افسانے مکمل تاثر کے حامل ہیں۔فٹ پاتھ کا جج (آغا گل) درد کی زنجیر (سیما پیروز) اُف یہ برگرز (رومانہ رومی) خاص طور پر سراہنے کے قابل افسانے ہیں۔غزلیات سبھی دل پذیر ہیں۔ رس رابطے میں شامل خطوط لائق مطالعہ ہیں۔یوگیندر بہل تشنہ، فیروز عالم، آصف ثاقب، ڈاکٹر ریاض احمد، نوید سروش کے خطوط نظرانداز نہیں کیے جاسکتے۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

گلزار صاحب، آداب۔

جو کام انڈو پاک کی دونوں حکومتوں نے بڑی کوشش اور باہمی رضا مندی سے کیا یعنی ادب، ادیب کے درمیان فصیل پیدا کردی گئی اور دانستہ ڈاک کی شرح کو اس قدر اونچا کردیا گیا کہ اِدھر والوں کو اُدھر کی خبر اور نہ اُدھر والوں کی اِدھر کی پرواہ۔نہ جانے کس جذبے اور لگن کے تحت آپ نے اس خلا کو پُر کرنے کی ٹھان لی اور ایک کے بعد ایک محبت کے چھوٹے بڑے پُل بنائے جارہے ہیں۔ جس کی تازہ ترین مثال راحت اندوری کا چہارسو نمبر ہے۔جس کی بابت کچھ کہنا سورج کو چراغ اور چاند کو چلمن کے دکھانے کے برابر ہے۔صفحہ اوّل تا آخر ندرت و مینا کاری کے پھول بوٹے قاری کو گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔خدا سے دعا ہے کہ آپ اسی لگن سے یہ کارِ خیر انجام دیتے رہیں۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ)

...... ادھوری کلیات......

''میں ہی نہیں اس دنیا کے سبھی افراد ''آدھا سچ'' ہی بولتے رہے ہیں اور بولتے رہیں گے۔ انسان نے پورا سچ کبھی نہیں بولا۔ وہ اتنا ہی سچ بولتا ہے جو اُس کے مفادات کے مطابق ہو اور جو حقیقت میں سچ نہیں بلکہ ''آدھا سچ'' ہوتا ہے۔ والدین، بزرگ، پیر، فقیر، مہاتما سبھی سچ کے نام پر آدھا سچ بولتے ہیں۔ جب دو فریقین میں کسی بات پر تنازع ہوتا ہے تو دونوں اپنا اپنا پکھش اپنا اپنا موقف سچ کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ تو اُن میں سے کون سچ بول رہا ہے؟'' کیا ہم ہمیشہ اسی طرح دشمنی اور نفرت کے ماحول میں زندگی گزارتے رہیں گے؟ کیا ہمارے ملک ایک دوسرے کے تئیں پیار اور امن وآشتی کا اظہار نہیں کریں گے۔ آج کی سیاست نے ہمیں ایک دوسرے سے بہت دُور کر دیا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے آسانی سے مل بھی نہیں سکتے۔ بھائی بہن سے اور ماں بیٹے سے ملنے کو ترستی ہے لیکن سرحدی پابندیوں نے انہیں الگ تھلگ کر دیا ہے۔'' زیرِ نظر کتاب کے مطالعے کی روشنی میں کارپردازانِ برصغیر کی کان پر تو شاید جوں نہ رینگے مگر اہلِ علم کی توجہ ہمارے لیے کسی سرمائے سے کم نہ ہوگی ...... نند کشور وکرم

اشاعت: ۲۰۱۸، قیمت: ۳۵۰، دستیابی: پبلشرز اینڈ ایڈوٹائزرز، کرشن نگر، دہلی۔

...... روشنی کے درخت......

ایک ہی ثقافتی، جغرافیائی، سماجی ماحول کو اپنے مجموعے کے تمام افسانوں کا حصہ بنالینا جمیل عثمان کا اختصاص ہے۔ ایسا ہی ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے ''جلاوطن کہانیاں'' میں دیکھنے میں آیا تھا، یعنی مرحوم مشرقی پاکستان کے ماحول کے پس منظر میں لکھی گئی کہانیاں اور اب زیرِ نظر مجموعہ ''روشنی کے درخت'' میں بھی ہم جمیل عثمان کے ویسے ہی مشاہدے سے دو چار ہیں۔ وہ جس مٹی پر قدم جماتے ہیں اس کے مسائل، اس کی ثقافت، اس کی اچھائیاں برائیاں، سب ان کی حرزِ جاں بن جاتی ہیں۔ ان خصوصیات کے سبب ان کے افسانے محض تصوراتی اور خیالی یا صرف کرافٹس مین شپ کے نمونے نہیں رہ جاتے بلکہ جیتے جاگتے، حقیقت پسندانہ اور زندگی سے قریب تر نظر آنے لگتے ہیں جو قاری کے ذہن پر دیرپا تاثر قائم کر جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی ایک بہت اہم خصوصیت الفاظ کی اکانومی بھی ہے وہ اتنے ہی الفاظ کام میں لاتے ہیں جن کی ضرورت ہو، وہ بہت اچھی طرح واقف ہیں کہ تکنیکی طور پر یہ خصوصیت مختصر افسانے کا لازمی جزو ہوتی ہے۔ ......اے خیام

قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: میڈیا گرافکس، نارتھ کراچی۔

......چار کتابیں ......

حمرا خلیق ۱۹۳۸ء دہلی میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق ایک ممتاز علمی وادبی گھرانے سے ہے اور ان کی والدہ رابعہ نہاں اردو، فارسی کی صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں۔ حمرا خلیق نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے، بی ایڈ اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں۔ وہ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۹۸ء تک درس وتدریس سے وابستہ رہیں۔ ان کے انشائیے، افسانے اور تراجم معروف ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ منتخب افسانوں کے تراجم کا مجموعہ ''مشرق ومغرب کے افسانے'' ۲۰۰۱ء میں کشمیری کہانیوں کے تراجم کا مجموعہ ''نمکین چائے اور باقر خانیاں'' ۲۰۰۳ء میں اور طبع زاد افسانوں کا مجموعہ ''مژگاں تو کھول'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انشائیوں کا مجموعہ ''عورت، گھوڑا اور سمندر'' ۲۰۰۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ علاوہ ازیں رسکن بانڈ کا ناول ''کبوتروں کی پرواز'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ اُن کی یادوں پر مشتمل کتاب ''کہاں کہاں سے گزر گئے'' ۲۰۱۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔ زیرِ نظر مجموعے میں حمرا خلیق کی چار کتابوں کو یکجا شائع کیا جا رہا ہے جن میں سے تین جو بہت دن سے مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھیں لیکن ان کے قارئین ان کتابوں کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔ چوتھی کتاب اُن کے نئے انشائیوں یا مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے آخر میں حمرا خلیق کے مختلف کاموں کے بارے میں اہلِ نظر کی آرا میں بھی شامل کی گئی ہیں۔ ......ادارہ

قیمت: ۵۰۰، دستیابی: اشارات پبلی کیشنز، اردو بازار، کراچی۔